موازنہ انیس و دبیر

یعنی

میرانیس کی شاعری پر تفصیلی ریویو اور میرانیس و دبیر کا موازنہ

مولفہ

شبلی نعمانی

باہتمام احقر العباد محمد حسن

انوار المطابع لکھنؤ مین چھپا

اردو کی بہترین کتابیں
جو حضرات اردو زبان کی مستند کتابیں اور مشہور مصنفین کی مندرجہ ذیل کتابیں مطالعہ فرمانا چاہیں فوراً ہم سے طلب فرمائیں مکمل فہرست ایک آنہ کا ٹکٹ بھیجکر فوراً طلب فرمالیجے
مطبوعات انوار المطابع لکھنؤ
فغان حسن
شعر العجم حصہ اول
حصہ دوم
حصہ سوم
حصہ چہارم
حصہ پنجم
شرح دیوان غالب طباطبائی
موازنۂ انیس و دبیر
مقالات شبلی
علم الکلام
سرمایۂ زبان اردو
اردو شاعری
یادگار غالب
طالب علم کی زندگی کا مقصد
تذکرۂ زند
بوئے گل
برگ گل
جمال القرآن
مقدمۂ شعر و شاعری
دیوان حالی قسم دوم
مجموعہ قرات
ذیل المصطفیٰ
تصانیف حکیم الامت حضرت حافظ حاجی مولانا شاہ اشرف علی صاحب تھانوی مدظلہم العالی
تفسیر بیان القرآن
مکمل
نشر الطیب فی ذکر نبی الحبیب
مناجات مقبول
اصلاح اخیال
اصلاح الرسوم
بہشتی زیور مکمل
جمال القرآن
فروع الایمان
کلید مثنوی دفتر اول
دفتر دوم
دفتر ششم
اعمال قرآنی
تعلیم الدین
حق السماع
اشرف المواعظ
الصلوٰۃ
الحیوٰۃ
التبشیر
الاستغفار یعنی استغفار کے فضائل
اردو لٹریچر
مرزا غالب مرحوم
اردوئے معلیٰ
عود ہندی
دیوان غالب
شرح دیوان غالب
نظامی پاکٹ اڈیشن
محمود مجلد
شرح دیوان غالب از حسرت موہانی
مطالب الغالب
شرح دیوان غالب
نواب محسن الملک مرحوم
مجموعہ لکچر
آیات بینات کامل
کتاب المحبت والشوق
تقلید و عمل بالحدیث
منشی امیر احمد مینائی مرحوم
صنم خانۂ عشق
مراۃ الغیب
محامد خاتم النبیین
المشتہر محمد حسن مالک انوار المطابع لکھنؤ

فہرست مضامین

تمہید

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حامداً و مصلیاً

شمع ہا بردہ ام از صدق بہ خاک شہدا | تا دل و دیدہ خون تابہ فشانم دادند

فلسفہ اور شاعری برابر درجہ کی چیزیں ہیں، لیکن قوم کی بدمذاقی سے جس قسم کی شاعری نے ملک میں قبول عام حاصل کر لیا ہے، اُس نے لوگوں کو یقین دلا دیا ہے کہ اُردو شاعری میں زلف و خال و خط، یا جھوٹی خوشامد اور مداحی کے سوا اور کچھ نہیں ہے میر تقی کی غزلیت، درد کا تصوف، غالب کا فلسفہ شاعری کی جان ہیں لیکن اِن بیش بہا خزانوں میں سے بھی عام لوگوں کی نگاہ صرف خزف ریزوں پر پڑتی ہے میر انیس کا کلام، شاعری کے تمام اصناف کا بہتر سے بہتر نمونہ ہے، لیکن اُن کی قدر دانی کا طغرائے امتیاز صرف اس قدر ہے کہ "کلام فصیح ہوتا ہے، اور وہ اچھا لکھتے ہیں" بدمذاقی کی نوبت یہاں تک پہونچی کہ وہ اور مرزا دبیر حریف مقابل قرار دیے گئے اور مدت ہائے دراز کی غور و فکر، کد و کاوش، بحث و تکرار کے بعد بھی فیصلہ نہ ہو سکا۔

کہ ترجیح کا مسند نشین کس کو کیا جائے۔

اس بنا پر مدت سے میرا ارادہ تھا کہ کسی ممتاز شاعر کے کلام پر تقریظ و تنقید لکھی جائے جس سے اندازہ ہو سکے کہ اُردو شاعری، باوجود کم مائگی زبان، کیا پایہ رکھتی ہی، اس غرض کے لیے میر انیس سے زیادہ کوئی شخص انتخاب کے لیے موزون نہین ہو سکتا تھا، کیونکہ اُنکے کلام مین شاعری کے جسقدر اصناف پائے جاتے ہین اور کسی کے کلام مین نہین پائے جاتے، شکر ہی کہ آج اس ارادے کے پورے ہونے کی نوبت آئی ہو اور یہ کتاب، ناظرین کی خدمت مین پیشکش ہی، اس کتاب مین میر انیس کا موازنہ بھی مرزا دبیر سے کیا گیا ہی اور اس مناسبت سے اس کا نام موازنہ ہی؛

شاعری کیا چیز ہی؟ یہ ایک نہایت مفصل اور دقیق بحث ہی، ارسطو نے اس پر ایک مستقل کتاب لکھی ہی جسکا ترجمہ عربی زبان مین ابن رشد نے کیا اور اُس کا بڑا حصہ چھپ کر شائع بھی ہو چکا ہی، ابن رشیق قیروانی اور ابن خلدون نے اس پر بحث کی ہی۔ انگریزی زبان مین نہایت اعلیٰ درجہ کی کتابین اس مسئلہ پر لکھی گئی ہین جنمین سے بعض میری نظر سے بھی گذری ہین، گو مین اُن سے اچھی طرح مستفید نہین ہو سکا۔

شعر العجم مین مین اس مضمون کو انشاء اللہ نہایت تفصیل سے لکھونگا، یہان صرف اس قدر کہنا کافی ہی کہ شاعری کے دو جزو ہین مادہ و صورت، یعنی کیا کہنا چاہیے اور کیونکر کہنا چاہیے؟ انسان کے دل مین کسی چیز کے دیکھنے، سننے یا کسی حالت یا واقعہ کے پیش آنے سے جوش و مسرت، عشق و محبت، درد و رنج، فخر و ناز، حیرت و استعجاب، طیش و غضب، وغیرہ وغیرہ کی جو حالت پیدا ہوتی ہی اسکو جذبات سے تعبیر کرتے ہین ان جذبات کا ادا کرنا شاعری کا اصلی ہیولیٰ ہی، اُن کے سوا عالم قدرت کے مناظر مثلاً گرمی و سردی، صبح و شام، بہار و خزان، باغ و بہار، دشت و صحرا، کوہ و بیابان کی تصویر کھینچنا، یا عام واقعات و حالات کا بیان کرنا بھی اسی مین داخل ہی؛

لیکن یہ شرط ہو کہ جو کچھ کہا جائے اس انداز سے کہا جائے کہ جو اثر شاعر کے دلمین ہو وہی سُننے والون پر بھی چھا جائے، یہ شاعری کا دوسرا جزو یعنی اسکی صورت ہی، اور انہی دونون جزون کے مجموعہ کا نام شاعری ہی، باقی خیال بندی، مضمون آفرینی، دقت پسندی مبالغہ صنائع وبدائع، شاعری کی حقیقت مین داخل نہین، اگرچہ بعض جگہ یہ چیزین، نقش ونگار اور زیب وزینت کا کام دیتی ہین،

میر انیس کی شاعری کو اسی معیار سے جانچنا چاہیے جسکا مختصر آ بیان ہوا، جس شخص کو یہ معیار تسلیم نہو اُسکے سامنے میر انیس کی نسبت کمال شاعری کا دعوی نہین کیا جا سکتا،

میر انیس اور تمام اور مرثیہ گویون کے کلام مین جن لوگون کا ذکر اکثر آتا ہی اور جو مرثیہ کے ہیرو ہین، اُن کا نام، اور اُن کی خصوصیات ذیل مین اس غرض سے لکھی جاتی ہین کہ واقعہ اور روایت کے سمجھنے مین مدد ملے اور محاسن شعری اور اسالیب بلاغت کے نکات سمجھ مین آئین،

حضرت عباسؑ	حضرت امام حسین علیہ السلام کے بھائی ہین، اور گو حقیقی بھائی نہین لیکن حقیقی بھائیون سے زیادہ مخلص اور جان نثار ہین اس خصوصیت کو ہر جگہ دکھایا ہی اس کے ساتھ ان کی شجاعت و بہادری اور جوانانہ جوش کو ہر موقع پر نمایان کیا ہی،
حضرت زینبؑ	حضرت امام حسین علیہ السلام کی بہن جو سب سے زیادہ امام علیہ السلام سے محبت رکھتی تھین، انکے دو صاحبزادے تھے، عونؑ ومحمدؑ دونون کو اُنھون نے امام پر نثار کر دیا،
عونؑ ومحمدؑ	حضرت زینبؑ کے صاحبزادے۔
حضرت صغریٰؑ	امام حسین علیہ السلام کی چھوٹی صاحبزادی جن کو امام علیہ السلام مدینہ مین چھوڑ آئے، اُن کی جُدائی اور رخصت کو تمام مرثیہ گویون نے

	بڑے درد اور اثر کے ساتھ لکھا ہے،
حضرت سکینہؑ	امام حسین علیہ السلام کی سب سے چھوٹی صاحبزادی جو قید خانہ کی تکلیفوں سے انتقال کر گئیں، (حسب خیال مرثیہ گویان اُردو)
حضرت علی اکبرؑ	امام حسین علیہ السلام کے بڑے صاحبزادے ان کو حضرت زینبؑ نے پالا تھا اور اپنے بیٹوں سے زیادہ اُن کو عزیز رکھتی تھیں، اس بنا پر وہ حضرت زینبؑ ہی کو اپنا مالک و مختار سمجھتے تھے اور ماں سے زیادہ ان کا ادب کرتے تھے،
حضرت علی اصغرؑ	امام حسین علیہ السلام کے شش ماہہ صاحبزادے جن کو دشمنوں نے امام علیہ السلام کی گود میں شہید کیا،
حضرت سجادؑ	امام زین العابدینؑ جو بیماری کی وجہ سے شریک جنگ نہ ہو سکے تھے اور دشمن اُن کو بیڑیاں پہنا کر شام تک پیادہ پا لے گئے تھے،
حضرت شہربانوؑ	امام حسین علیہ السلام کی حرم محترم جو نوشیروان کی پوتی تھیں،
حُر	یزید کے رسالہ کا سپہ سالار تھا، لیکن خدا نے ہدایت کی، اور امام علیہ السلام کی فوج میں آکر شامل ہو گیا،

مرثیہ گوئی کی اجمالی تاریخ

عرب مین جو فارسی اور اُردو شاعری کا سرچشمہ ہی، شاعری کی ابتدا مرثیہ سے ہوئی، اور یہی ہونا چاہیے تھا، عرب مین شاعری کی ابتدا بالکل فطرت کے اصول پر ہوئی یعنی جو جذبات دلون مین پیدا ہوتے تھے وہی اشعار مین ادا کر دیے جاتے تھے جذبات مین درد و غم کا جذبہ اور جذبات سے قوی تر ہی اور جس جوش سے ظاہر ہوتا ہی اور جذبات ظاہر نہین ہو سکتے' فرض کرو، ایک شخص کے گھر مین بہت تمنا ؤن کے بعد بیٹا پیدا ہوا، تو اُس کو گو بہت کچھ خوشی ہوگی، لیکن وہ اِس خوشی کو کبھی مجمع عام مین، اشعار یا خطبہ کے ذریعہ سے ظاہر نہین کریگا، اور کرے بھی تو کلام مین کوئی غیر معمولی تاثیر ہوگی، لیکن اگر یہی لڑکا مر جائے تو اسکی کیا حالت ہوگی؟ وہ سرتا پا جوش بن جائیگا اُس کی آہ و زاری لوگون کو تڑپا دے گی، اور اگر وہ شاعر ہی، تو اُس کے مرثیے دلون پر نشتر کا کام دین گے،

بہر حال عرب مین چونکہ شاعری کی ابتدا اظہار جذبات سے ہوئی تھی، اس لیے سب سے پہلے شاعری کی ابتدا مرثیہ سے ہوئی جو سب سے قوی تر جذبہ کا اثر ہی، مرثیے عین اس حالت مین کہے جاتے تھے، جبکہ شاعر کا دل درد و غم سے لبریز ہوتا تھا، اِس کا شاعری پر ایک خاص اثر یہ ہوا کہ قصائد کی ابتدا جو عام طور پر تشبیب اور غزل سے کی جاتی تھی، مرثیہ کے قصائد مین یہ طرز متروک ہوگیا، کیونکہ رنج و غم کی حالت مین عشق و محبت کے خیالات کا کیا موقع تھا، عرب مین اُس کی مخالف صرف ایک مثال موجود ہی، یعنی درید بن الصمہ ایک شاعر نے اپنے بھائی کا مرثیہ جو لکھا اُس کی ابتدا غزل سے کی تھی، جس کا مطلع یہ تھا،

أَرَبْتُ جديدًا لحبل من أم معبد	لعاقبة او اخلفت كل موعد

لیکن اس کی وجہ ابن رشیق نے کتاب العمدہ میں یہ لکھی ہو کہ یہ مرثیہ واقعہ کے پورے ایک برس کے بعد لکھا گیا تھا۔

اگرچہ جاہلیت ہی کے زمانہ میں مرثیہ گوئی کو بہت ترقی ہو چکی تھی، اور بہت سے شعرا نے بڑے بڑے پُراثر مرثیے لکھے تھے لیکن دو شخص اس زمانہ میں بہت نامور ہوے **خنسا** اور **متمم بن نویرہ**۔ خنسا ایک عورت تھی جسکو اپنے بھائی **صخر** سے بے انتہا محبت تھی، صخر ایک لڑائی میں مارا گیا، خنسا پر اس واقعہ کا یہ اثر ہوا کہ اسکے حواس جاتے رہے، اُس نے صخر کی پھٹی پُرانی جوتیوں کا ہار بنا کر گلے میں ڈالا اور دیوانہ وار پھرنے لگی، اسی حالت میں حج کو گئی یہ حضرت **عمر فاروق** کا زمانہ تھا، وہ حرم کا طواف کرتی اور سینہ پر دوہتڑ مارتی جاتی تھی، حضرت عمرؓ نے دیکھا تو ڈانٹا، اُس نے اپنی داستان بیان کی، حضرت عمرؓ نے کہا ہاں! لیکن ماتم کے اس طریقے کو اسلام نے مٹا دیا، وہ اور بیتاب ہو گئی، اور اُس وقت بے اختیار اُس کی زبان سے چند شعر نکلے جن کا مطلع یہ ہی:

فهريقي من دموعك واستفيقي	وصبرًا ان اطقت ولم تطيقي

(اپنے نفس سے مخاطب ہو کر) آنسو بہا اور اُس سے تسلی حاصل کر، اور صبر کر اگر تجھ سے کیا جاسکے لیکن تو کر نہیں سکنے کی۔

متمم بن نویرہ بھی اُسی زمانہ میں تھا اور وہ بھی اپنے بھائی کا شیفتہ اور عاشق تھا، ایک لڑائی میں خالد بن الولید نے اس کے بھائی کو مار ڈالا۔ اس پر متمم کی یہ حالت ہوئی کہ گھر بار چھوڑ کر نکلا، اور قبائل عرب میں پھرنا شروع کیا، جہان پہونچتا تھا تمام زن و مرد اسکے گرد جمع ہو جاتے تھے، وہ دردانگیز لہجہ میں مرثیہ پڑھتا، اور ہر طرف سے گریہ و زاری کی آواز بلند ہوتی، اس کی یہ حالت دیکھکر لوگون نے سمجھایا کہ تم جلد ہلاک ہو جاؤ گے اور تمھارے خاندان کی کوئی یادگار باقی نہ رہے گی، اس لیے تم شادی کر لو کہ اولاد کے ذریعہ سے

خاندان کا نام رہ جاتے"

لوگوں کے اصرار سے مجبور ہو کر اُس نے شادی کی، لیکن بیوی کی طرف التفات نہ کر سکا، آخر طلاق دینی پڑی،

اسی حالت میں حضرت عمرؓ کے پاس آیا وہ اس وقت مسجد نبوی میں تشریف رکھتے تھے، متمم نے مرثیہ کے اشعار پڑھنے شروع کیے، حضرت عمرؓ اگرچہ نہایت مضبوط دل کے آدمی تھے، لیکن ضبط نہ کر سکے، بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے، متمم مرثیہ پڑھ چکا تو حضرت عمرؓ نے کہا "الی ما بلغ بک الحال" یعنی تیرے غم کی حالت کس حد تک ہوئی ہے؟ اُس نے کہا امیر المؤمنین! بچپن میں مجکو ایک عارضہ ہوگیا تھا، جس کی وجہ سے میری بائیں آنکھ کی رطوبت جاتی رہی تھی، میں کبھی روتا تھا تو اس آنکھ سے آنسو نہیں نکلتے تھے، بھائی کے مرنے کے بعد جو اس آنکھ سے آنسو جاری ہوے تو اب تک نہ تھمے،

حضرت عمرؓ نے اُس سے فرمایش کی کہ اُن کے بھائی زید کا مرثیہ لکھے، اُس نے فرمایش پوری کی، لیکن جب دوسرے دن جا کر حضرت عمرؓ کو سنایا، تو حضرت عمرؓ نے کہا کہ اس میں تو وہ درد نہیں ہے، اُس نے کہا "امیر المؤمنین ما زید آپ کے بھائی سے تھے، میرے بھائی نہ تھے،

اس زمانہ تک مرثیہ صرف وہ لوگ کہتے تھے جن پر کوئی غیر معمولی حالت طاری ہوتی تھی، اُس کے بعد جب شاعری اصلی حالت سے بدل کر کسب معاش کا ذریعہ بنی تو مرثیہ گوئی کو خود بخود زوال ہوا کیونکہ مدیحہ قصائد کی طرح اس سے کچھ صلہ نہیں مل سکتا تھا تاہم چونکہ عرب میں ابھی تک قدیم اوصاف کچھ باقی تھے اس لیے بعض مرثیے اس زمانہ کے بھی ایسے ملتے ہیں جن میں اثر اور جوش پایا جاتا ہے،

اُسی زمانہ میں کربلا کا قیامت انگیز واقعہ پیش آیا۔ یہ ایک ایسا واقعہ تھا کہ اگر عرب

کے اصلی جذبات موجود ہوتے تو اس زور کے مرثیے لکھے جاتے کہ تمام دنیا مین آگ لگ جاتی، لیکن اُدھر تو عرب کے پرزور جذبات مین انحطاط آچکا تھا، ادھر بنو امیہ کی ظالمانہ سطوت اور جباری نے تمام شعرا کی زبانین بند کردی تھیں، فرزدق بنو امیہ کے پایہ تخت کا شاعر تھا، لیکن جب اُس نے ایک موقع پر نوری جوش سے حضرت امام زین العابدینؑ کی مدح مین فی البدیہہ چند شعر کہے تو عبد الملک بن مروان نے اسکو جیل خانہ مین بھیجدیا؛

بنو امیہ کے بعد دولت عباسیہ کا دور آیا۔ اس عہد مین شاعری کو بہت ترقی ہوئی لیکن اُنہی اصناف کو ترقی ہوئی جن کو صلہ اور انعام سے تعلق تھا، اس لیے مرثیہ گوئی اب بھی اُسی حالت مین رہی؛

البتہ معن اور جعفر برمکی کی فیاضیون نے ایک عالم کو ممنون احسان بنا رکھا تھا، اس لیے اُن کے مرنے پر جو مرثیے لکھے گئے، اُن مین سے اکثر پر اثر اور درد انگیز تھے[1]؛

فارسی مرثیے

فارسی شاعری کی بنیاد تکلف، آورد، اور مداحی پر قائم ہوئی تھی، اس لیے شاعری کے وہ انواع جن کو جذبات سے لازمی تعلق تھا دفعۃً پستی کی حالت مین آگئے، تاہم چونکہ آغاز مین ہر چیز مین فطرت کا اثر پایا جاتا ہے، اس لیے فردوسی اور فرخی وغیرہ کی شاعری مین جا بجا جذبات کا اظہار بہت خوبی کے ساتھ نظر آتا ہے!

فردوسی نے سہراب کا مرثیہ جو اُس کی ماں کی زبان سے لکھا ہے اُس کے اشعار سے اس کا اندازہ ہوسکے گا،

بمادر خبر شد کہ سہراب گرد		ز تیغ پدر خستہ گشت و بمرد	
خروشید و جوشید و جامہ درید		بزاری، براں کودک نارسید	

[1] عرب کی مرثیہ گوئی کا مضمون ایک نہایت وسیع مضمون ہے لیکن ہم کو اقتضائے مقام سے نہایت اختصار کرنا پڑا، کتاب العمدہ ابن رشیق نے باب المراثی مین اس پر مفصل بحث کی ہے،

بزد چنگ و بدرید پیراهنش ... درخشان شد آن لعل زیباتنش

برآورد بانگ و غریو و خروش ... زمان تا زمان زو همی رفت ہوش

فرو برد ناخن دو دیده بکند ... برآورد بالا در آتش فگند

مر آن زلف چون تاب داده کمند ... بانگشت پیچید و از بن بکند

رخان گشت از زردی او چو خون ... زمان تا زمان اندر آمد نگون

همه خاک تیره بسر بر فگند ... بدندان ز بازوی خود گوشت کند

بسر بر فگند آتش و بر فروخت ... همه موی مشکین بآتش بسوخت

همی گفت کای جان مادر کنون ... کجائی سرشته بخاک و بخون؟

دو چشمم بره بود گفتم مگر ... ز سهراب و رستم بیابم خبر

گمانم چنان بود گفتم کنون ... بگشتی بگرد جہان اندرون

پدر را همی جستی و یافتی ... کنون باآمدن تیز بشتافتی

چه دانستم ای پور کآید خبر ... که رستم بخنجر بدرد جگر

دریغش نیامد ازان روی تو ... ازان قد و بالا و بازوی تو

بپرورده بودم تنت را بناز ... برشتم بروز و شبان دراز

کنون آن بخون اندرون غرقه گشت ... کفن بر تن پاک تو خرقه گشت

کنون من کرا گیرم اندر کنار ... که خواهد بدن مر مرا غمگسار

کرا گویم این درد و تیمار خویش ... کرا خوانم اکنون بجای تو پیش

پدر جستی ای گرد لشکر پناه ... بجای پدر گورت آمد براه

ز امید نا امید گشتی تو زار ... بخفتی بخاک اندرون زار و خوار

ازان پیش کو دشنه را بر کشید ... جگرگاه سیمین تو بر درید

چرا آن نشانی که مادرت داد ... ندادی بدو بر نکردیش یاد

نشاں دادہ بُد از پدر مادرت ۔۔۔ ز بہر چہ نامد ہمے با درت

کنون مادرت ماند بے تو اسیر ۔۔۔ ہمہ از درد و تیمار و رنج و زحیر

چرا نامدم با تو اندر سفر ۔۔۔ کہ گشتی بگرد ان گیتی سمر

مرا رستم از دور بشناختے ۔۔۔ ترا با من اے پور بنواختے

بینداختی تیغ آن سرفراز ۔۔۔ بکردی جگرگاہ تے پور باز

ہمی گفت و می خست و بیانید بوے ۔۔۔ ہمی زد کف دست بر خوب روے

ہمی گفت مادرت بیچارہ گشت ۔۔۔ بہ خنجر جگرگاہ تو پارہ گشت

اسی زمانہ کے قریب سلطان محمود کی وفات پر **فرخی** نے مرثیہ لکھا جو نہایت مؤثر اور دردانگیز ہے:

شہر غزنین نہ ہمان است کہ من دیدم پار ۔۔۔ چہ فتاد است کہ امسال دگرگوں شد کار

کوہہا بینم پر شورش و سرتا سر کوے ۔۔۔ ہمہ پر جوشش و جوشن در و پر خیل و سوار

ملک امسال دگر باز نیامد ز غزا ۔۔۔ دشمنے روے نہاد است دریں شہر و دیار

آہ و دردا کہ بیکبارہ تہی بینم ازو ۔۔۔ کاخ محمودی و آن خانہ پر نقش و نگار

سیر می خوردہ مگر دی و بخفتہ است امروز ۔۔۔ دیر تر خاست مگر رنج رسیدش ز خمار

خیز شاہا کہ رسولان شہان آمدہ اند ۔۔۔ ہدیہا دارند آوردہ فراوان و نثار

کہ تواند کہ برانگیزد ازین خواب ترا ۔۔۔ خفتی خفتی کہ کس خواب نکردی بیدار

خفتن بسیار نبُد خسروا خوے تو بود ۔۔۔ ہیچ کس خفتہ ندید است ترا زیں کردار

یا سے تنگ باشے در خانہ بپالیست نشست ۔۔۔ تا بدیدے رخ تو عزیزان و تبار

بہ حصار از فزع و بیم تو فتند شہان ۔۔۔ تو شہا از فزع و بیم کہ رفتی بحصار

شعرا را تو ببازار بر افروختہ بود ۔۔۔ رفتی و با تو بیکبارہ برفت آن بازار

اس دور کے بعد مرثیے بہت کم لکھے گئے اور جو لکھے گئے وہ صرف رسمی مرثیے

تھے، جن سے شاعری کے تمام اقسام پر قادر ہونے کا اظہار مقصود تھا، البتہ شیخ سعدی اور امیر خسرو کے دو مرثیے، بہت مشہور ہیں، اور چونکہ دل سے نکلے تھے، حسرت خیز اور درد انگیز ہیں، لیکن چونکہ اس زمانہ کی عیش و طرب کی مجلسیں غزل کے ترانوں سے گونج رہی تھیں اس لیے اُن کا اثر عام نہیں ہوا جب صفویہ اور تیموریہ کا دور آیا تو شاعری نے ایک دوسرا قالب اختیار کیا، اور سنائی، نظیری، عرفی، کی زور آوریوں نے پرانی بنیادیں متزلزل کر دی تھیں قائم کیں، اس زمانہ میں محتشم کاشی نے عام دستور کے موافق شاہ طہماسپ صفوی کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا طہماسپ کو خاندان رسالت سے عقیدہ نیاز مندی تھی، اس بنا پر اُس نے کہا کہ میں اس بات کو ہرگز پسند نہیں کرتا کہ میری مدح میں قصائد لکھے جائیں شعرا کو ائمہ اہلبیت کی شان میں طبع آزمائی کرنی چاہیے، جسکا اصلی صلہ خدا کے دربار سے ملے گا اور دنیوی منتعات دربار شاہی سے حاصل ہوں گے محتشم نے اس خواہش کے موافق آٹھ دس بندوں کا ایک مرثیہ لکھا جو درد و غم کی مجسّم تصویر ہے، اور جسکا جواب آج تک نہ ہو سکا اس مرثیہ کے چند بند یہ ہیں،

مرثیہ محتشم کاشی

چون خون ز حلق تشنۂ او بر زمین رسید — جوش از زمین بہ ذروۂ عرش برین رسید
نخل بلند او چو خساں بر زمین زدند — طوفاں بہ آسمان ز غبار زمین رسید
باد آں غبار چوں بمزار نبی رساند — گرد از مدینہ بر فلک ہفتمیں رسید
کرد ایں خیال وہم غلط کار کاں غبار — تا دامن جلال جہاں آفریں رسید

ہست از ملال گرچہ بری ذات ذوالجلال
او در دلست و ہیچ دلے نیست بے ملال

ترسم جزاے قاتل او چوں رقم زنند / یکبار بر جریدۂ رحمت قلم زنند

ترسم کزیں گناہ شفیعان روز حشر / دارند شرم کز گنہ خلق دم زنند

دست عتاب حق بدر آید ز آستین / چوں اہل بیت دست در اہل ستم زنند

آہ از دمے کہ با کفن خوں چکاں ز خاک / آل علی چو شعلۂ آتش علم زنند

فریاد از آں زماں کہ جوانان اہل بیت / گلگوں قدم بہ عرصۂ محشر قدم زنند

از صاحب حرم چہ توقع کنند باز / آں ناکساں کہ تیغ بصید حرم زنند

پس بر سناں کنند سرے را کہ جبرئیل
شوید غبار گیسویش از آب سلسبیل

بر حربگاہ[1] چوں رہ آں کارواں فتاد / شور نشور واہمہ را در گماں فتاد

ہم بانگ نوحہ غلغلہ در شش جہت فگند / ہم گریہ بر ملائک ہفت آسماں فتاد

چنداں کہ بر تن شہدا چشم کار کرد / بر زخمہاے کاری تیغ و سناں فتاد

ناگاہ چشم دختر زہرا دراں میاں / بر پیکر شریف امام زماں فتاد

بے اختیار نعرۂ ھذا حسین ازو / سرزد چنانکہ آتش ازو در جہاں فتاد

پس با زبان پر گلہ آں بضعۃ البتول
رو در مدینہ کرد کہ یا ایہا الرسول

ایں کشتۂ فتادہ بہ ہاموں حسین تست / ویں صید دست و پا زدہ در خوں حسین تست

ایں غرقۂ محیط شہادت کہ روے دشت / از موج خون او شدہ گلگوں حسین تست

ایں خشک لب فتادہ ممنوع از فرات / کز خون او زمیں شدہ جیحوں حسین تست

ایں شاہ کم سپاہ کہ با خیل اشک و آہ / خرگاہ ازیں جہاں زدہ بیروں حسین تست

[1] ایک بند اس سے پہلے کا چھوڑ دیا گیا ہے جس میں یہ بیان ہے کہ واقعۂ کربلا کے بعد مخالفین اہل حرم کو بے عماری کے اونٹوں پر سوار کرکے شہدا کی لاشوں کے سامنے سے لے گئے۔

این تشنہ لب طپاں کہ چنین ماندہ بر زمین | شاہ شہید ناشدہ مدفون حسین است

پس رو بہ سوے در بقیع بہ زہرا خطاب کرد
وحش زمین و مرغ ہوا را کباب کرد

کاے مونس شکستہ دلان حال ما ببین | ما را غریب و بیکس و بے آشنا ببین
تنہاے کشتگاں ہمہ در خاک و خوں نگر | سرہاے سروراں ہمہ بر نیزہا ببین
آن سر کہ بود بر سر دوش نبی مدام | یک نیزہ اش ز دوش مخالف جدا ببین
واں تن کہ بود پرورشش در کنار تو | غلطاں بہ خاک معرکہ کربلا ببین
در خلد بر حجاب دو کون آستین فشاں | واندر جہاں مصیبت ما بر ملا ببین
نے نے درا چو ابر خروشاں بکربلا | طغیان سیل فتنہ و موج بلا ببین

یا بضعة البتول ز ابن زیاد داد
کو خاک اہل بیت رسالت بباد داد

محتشم کے مرثیہ کو اگرچہ حد سے بڑھ کر حسن قبول حاصل ہوا اور دربار شاہی سے صلہ اور انعام بھی ملا، لیکن تمام ملک مین قصیدہ اور مدح کا رنگ اس قدر چھایا ہوا تھا کہ عام شعرا پر اس کا چنداں اثر نہین پڑا، طالب آملی، غزالی، فیضی، سلیم، کلیم، وغیرہ شعراے متاخرین کے کلام میں اور سب اصناف سخن پائے جاتے ہیں لیکن مرثیہ کا بہت کم پتہ چلتا ہے۔ حاجی محمد جان قدسی نے اپنے بیٹے کا جو نوجوان مرگیا تھا، نہایت پُر درد مرثیہ لکھا، لیکن نوبادۂ رسالت کے غم میں دو شعر بھی لکھے ظہوری نے البتہ بہت سے مرثیے لکھے، لیکن وہ اپنا دلی جوش نہ تھا، بلکہ ابراہیم عادل شاہ کی خوشامد تھی، چنانچہ اکثر مرثیون کے خاتمہ مین ابراہیم عادل شاہ کا نام اس طرح آتا ہے جسطرح قصائد مین تشبیب کے بعد گریز۔ ایک بند کے خاتمہ کا شعر ہے

سرکن ز روے صدق ظہوری رہِ دعا — از گفتگو، دعاے شہنشاہ مغتنمست

خود کہتا ہے کہ مرثیہ سے صرف بادشاہ کی دعا مقصود ہے،

ایک اور مرثیہ کا خاتمہ ہے سے

ایام ازاں بہ کامِ حسین و حسن نبود — کاں روز شہریار سریرِ دکن نبود

ایک اور موقع پر فرماتے ہیں سے

روزے کہ سرورِ شہدا بے سپاہ بود — ہنگامِ کارزار براہیم شاہ بود

اِس خوشامد کا کیا ٹھکانا ہے کہ حسین علیہ السلام کی ناکامیابی کی یہ وجہ تھی کہ اِس زمانہ میں بادشاہ دکن موجود نہ تھا،

محتشم کے بعد مقبل نے مرثیہ گوئی کی طرف خاص توجہ کی، اُس نے مرثیہ ہی کو شاعری کا موضوع قرار دیا، نہایت کثرت سے مرثیے لکھے اور بڑا کام یہ کیا کہ کربلا کے تمام واقعات، ابتداء سفر سے لیکر اہل حرم کے قید ہونے اور رہائی پاکر مدینہ میں آنے تک، سادہ طریقہ پر لیکن تفصیل کے ساتھ ان مرثیوں میں ادا کردیے، اُس کے مرثیوں کو مرثیہ کی بہ نسبت تاریخ کہنا زیادہ موزوں ہے، اس غرض کے لیے اُس نے ترکیب بند وغیرہ چھوڑ کر مثنوی کا طریقہ اختیار کیا، اور مثنوی میں بھی قدیم معمولی بحریں اختیار نہیں کیں، بلکہ قصائد کی بحر انتخاب کی، تاکہ ہر قسم کے مطالب بھی تفصیل کے ساتھ بیان ہو سکیں اور سوز خوانی کے کام بھی آئیں، کیونکہ مثنوی کی مروجہ بحروں میں سوز خوانی کے اتار چڑھاؤ کی کیفیت نہیں ہو سکتی تھی،

مقبل کے مرثیوں میں اگرچہ وہ زور اور بندش کی چستی نہیں جو [illegible] خاصہ ہے لیکن درد اور تاثیر سے خالی نہیں، نمونہ کے لیے ہم صرف چند شعر لکھتے ہیں سے

مخدرات بہ عباس در سخن بودند — براے رفتنِ او در گریستن بودند

ز اندرونِ سراپردہ با فغان و خروش — سکینہ آمد و یک مشکِ خالی بر دوش

دواں بخدمت عم بزرگوار آورد — چناں کہ اہل حرم را بزار زار آورد
بگریہ گفت کہ اے عم خوش قرینۂ من — رسید جاں بلب از تشنگی ز سینۂ من
چہ وانع است کہ یک جرعہ آب درین بیابان نیست — چہ شد کہ جرعۂ آبے دریں بیاباں نیست
چو دید حضرت عباس بے قراری او — گسیخت بند دلش از فغان و زاری او

مقتل کے بعد ایران میں مرثیہ گویوں کا ایک خاص گروہ پیدا ہو گیا، اور مرثیہ کے اور بہت سے اقسام پیدا ہو گئے، مثلاً نوحہ، پیش خوانی وغیرہ،

ہندوستان میں مرثیہ گوئی کی ابتدا

ہندوستان میں شاعری کی ابتدا ولی سے ہوئی، ولی نے اگرچہ کربلا کے حالات میں ایک خاص مثنوی لکھی لیکن اُس کے کلام میں مرثیہ کا پتہ نہیں لگتا، معلوم نہیں کہ مرثیہ کی ابتدا کس نے کی، لیکن اس قدر یقینی ہے کہ سودا اور میر سے پہلے مرثیہ کا رواج ہو چکا تھا، سودا نے اپنے شہر آشوب میں میاں مسکین مرثیہ گو کا ذکر کیا ہے ؎

اسقاط حمل ہو تو کہیں مرثیہ ایسا — پھر کوئی نہ پوچھے میاں مسکین کہاں ہے

میر تقی صاحب کے دیوان میں اگرچہ کوئی مرثیہ نہیں، لیکن انھوں نے بھی کہا ہے، اُن کے ایک مرثیہ کا رد مرزا سودا نے لکھا ہے، جس کے چند شعر یہ ہیں ؎

دلوں پہ محبوں کے حالت عجب ہے — مصیبت ہے ماتم ہے غم ہے تعب ہے
غرض کیا کہوں کس روش کا غضب ہے — حسینؑ علیؑ کی شہادت کی شب ہے
کوئی دل نہیں جس کو ماتم نہ ہوگا — وہ دل دیر ہے جس میں یہ غم نہ ہوگا
یہ دل کچھ قیامت سے بھی کم نہ ہوگا — قیامت میں یہ کچھ نہ ہوگا جواب ہے
بجا ہے کہ تو ہو کے دریا بہائے — یہ کشتی فلک کی لہو میں ڈبائے
شہ تشنہ لب کا کسے غم سنائے — یہ کس منہ سے کہیے کہ وہ تشنہ لب ہے

اُس وقت تک مرثیے عموماً چو مصرع ہوتے تھے، غالباً سب سے پہلے سودا نے

مسدس لکھا جو اُن کے دیوان میں موجود ہے، اُردو میں مرثیہ کی وسعت اور ترقی کا یہ پہلا قدم تھا، کیونکہ جو مصرع میں اوّل سے آخر تک ایک خاص قافیہ کی پابندی کی وجہ سے ہر قسم کے مطالب نہیں ادا کیے جا سکتے تھے،

میر انیس کے اس مصرع سے ع پانچویں پشت ہے شبیر کی مدّاحی میں ثابت ہوتا ہے کہ میر ضاحک صاحب نے جو میر انیس کے پردادا اور سودا کے معاصر تھے، اور میر حسن اُن کے بیٹے نے بھی مرثیہ لکھا ہے، لیکن ضاحک کا کلام تو سرے سے مفقود ہے میر حسن کا دیوان مدت ہوئی میں نے دیکھا تھا، یاد نہیں آتا کہ اس میں مرثیہ بھی ہے یا نہیں۔

یہ امر تعجب سے خالی نہیں کہ میر تقی، اور مرزا سودا جیسے قادر الکلام نے بھی مرثیہ کو چنداں ترقی نہیں دی اور میر ضمیر تک یہ فن گویا ابتدائی ہی حالت میں رہا، چنانچہ سودا کے مسدس کا ایک بند ہم نقل کرتے ہیں، جس سے اس زمانہ کی مرثیہ گوئی کا اندازہ ہوگا۔

اس سے لے چرخ کہوں جا کے تری بیدادی — جو ہے دنیا میں سو کہتا ہے مجھے ایذا دی
تجھ سے کون نہیں آج تیرے فریادی — یاں تلک پہونچی ہے ملعون تری بیدادی

کون فرزند علیؑ پر یہ ستم کرتا ہے
کیوں مکافات سے اُس کے تو نہیں ڈرتا ہے

خویش و فرزند و عزیز اُس کے تھے جتنے پیارے — دشنہ و تیغ سے ہیں ظالموں نے سب مارے
اہل بیت اُس کے جو باقی ہیں تو ہیں آوارے — قید میں کوفیوں کے بلتے ہیں وہ بیچارے

نہ اُنھیں چین ہے دن کو نہ اُنھیں رات آرام
اس مصیبت میں چلے جاتے ہیں کربل سے شام

شاید یہ خیال ہو کہ اس وقت تک شعراء مرثیہ کو محض ایک مذہبی فرض سمجھتے تھے اور

سے شاعرانہ طباعی اور زور آوری سے اجتناب کرتے تھے اُنکا مقصد صرف رونا
رُلانا ہوتا تھا، جس کو شاعری سے تعلق نہیں لیکن یہ خیال صحیح نہیں، مرزا سودا
میر تقی کے مرثیہ کی رد کی تمہید میں لکھتے ہیں،

"لیکن مشکل ترین و فائق، طریقہ مرثیہ کا معلوم کیا، کہ مضمون واحد کو ہزار رنگ
میں ربط معنی دیا، اس کام میں مختتم سا کسو نے عز قبول نہیں پایا، پس لازم ہے کہ مرتبہ
در نظر رکھ کر مرثیے کہے نہ کہ برائے گریۂ عوام اپنے تئیں ماخوذ کرے"

اس سے ثابت ہوتا ہے، کہ مرزا مرثیہ کو مشکل ترین فنون سمجھتے تھے اور اسکا
مقصد محض گریۂ عوام نہیں قرار دیتے تھے،

غرض اس زمانہ میں جو کچھ ترقی ہوئی وہ صرف اسقدر تھی کہ مرثیے چومصرع سے
مسدس ہو گئے، سب سے پہلے جس شخص نے مرثیہ کو موجودہ طرز کا خلعت پہنایا، وہ
میر ضمیر، مرزا دبیر کے اُستاد ہیں، میر ضمیر کے مرثیے چھپ کر شایع ہو چکے ہیں انھوں نے
مرثیہ میں جو جدتیں پیدا کیں حسب ذیل ہیں۔

میر ضمیر

۱، رزمیہ لکھا،

۲، سراپا ایجاد کیا،

۳، گھوڑے، تلوار اور اسلحۂ جنگ کے الگ الگ اوصاف لکھے، اور یہی
مضامین آج موجودہ مرثیوں کے نہات موضوع ہیں۔

۴۔ واقعہ نگاری کی بنیاد ڈالی چنانچہ ایک ایک جزئی واقعہ کو تفصیل کے ساتھ لکھا

۵، سب سے بڑھ کر یہ کہ کلام میں زور اور بندش میں چستی اور صفائی پیدا کی،
اغلاط الفاظ جو مرثیوں کے لیے گویا جائز مان لیے گئے تھے اکثر ترک کر دیے، ان کے عمدہ
کلام کا اگر انتخاب کیا جائے تو میر انیس کا کلام معلوم ہوگا،

اب سے پہلے مرثیے سوز کے لہجے میں پڑھے جاتے تھے، اب تحت لفظ کا بھی

رواج ہوا اور غالباً پہلا شخص جس نے منبر پر بیٹھ کر تحت لفظ پڑھا میر ضمیر صاحب تھے
نئی تشبیہات۔ لطیف استعارے۔ مبالغہ۔ واقعہ نگاری۔ مناظر قدرت کی تصویر
غرض میر انیس اور مرزا دبیر کے کلام کے جسقدر محاسن ہیں ضمیر کے ہاں سب پائے جاتے
ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ میر ضمیر کے ہاں اُن کا رنگ ہلکا تھا۔ ان دونوں صاحبوں نے
شوخ کر دیا۔ میر ضمیر کے ہر نمونے کے چند اشعار ہم اس موقع پر نقل کرتے ہیں۔

روزمرہ و صفائی

جا کے میدان میں کس طرح یہ محبوب لڑے
یہ تو کہیے کہ غلام آپ کے کچھ خوب لڑے

چاہتا تھا کہ کروں ضبط پہ چپ رہتا تھا
پوچھا کہ غصے میں ہرا تو یہ کیا کہتا تھا

چیر کر فوج کو اِس پار سے اُس پار گئے
میں نے خود دیکھا کہ دریا پہ کئی بار گئے

واقعہ نگاری

پانی تو پی نہیں حیدرؑ کے نواسے آئے
بولے عباسؑ کہ پیاسے گئے پیاسے آئے

قریب جاتے ہی ہندؔ نے اُنکا تھاما ہاتھ
کہا سلام علیک اے ضعیفہ نیک صفات

وہاں سے لائے اُٹھا کر تو پھر کہی یہ بات
سمجھ میں کچھ نہیں آتے ہیں آپ کے حالات

وہ روشنی میں بغور اُن کے منہ کو تکتی تھی
اگرچہ قصد تھا۔ پر کچھ وہ کہہ نہ سکتی تھی

کہا یہ ہندؔ نے کچھ میں نے تم کو پہچانا
کہیں ہو شہر مدینہ میں غالباً دیکھا

محلہ ہے وہاں مشہور آل ہاشم کا
ہمیشہ آمد و شد تھی غرض مری اُس جا

ضرور دیکھا ہے آل عقیلؑ و جعفرؑ میں
و یا جناب رسالتمآبؐ کے گھر میں

سوا اس کلام کے سلطنت پہ خدا ہے گواہ
جناب فاطمہؑ کے گھر میں ہر تھیں کچھ ماہ

خصوص زینبؑ و کلثومؑ سے بھی ہوا گاہ
ہیں دونوں بی بیاں شہزادیاں مری واللہ

وہ سب تو ایک طرف پر امام اچھے ہیں
کہو حسین علیہ السلام اچھے ہیں

تشبیہ

پنہاں زرہ میں ہوتی تھی اسطرح سے سناں	بجلی چمک کے ہوتی ہے جوں ابر میں نہاں
اس نیزۂ سیاہ سے تھا سب کو بیم جاں	تھا اژدہائے موسیٰ عمراں کی وہ زباں

نیزہ کی یہی تشبیہ ہے جسکو میر انیس صاحب نے زیادہ لطیف اور صاف کردیا ہے، چنانچہ کہتے ہیں ع گویا زباں نکالے ہوئے اژدہا چلا،
میر انیس نے اسی سے دو نیزوں کے باہم ٹکرانے کا مضمون پیدا کیا، اور اس لطف کو دوبالا کردیا ع دو سانپ گتھ گئے تھے زبانیں نکال کے،

حسن تعلیل — میر ضمیر

تھا دیدۂ حیراں ہر اک زخم بدن میں	انگشت تاسف تھی زباں سب کے دہن میں

مبالغہ

گھوڑا وہ تیز دست کہ ناگاہ ایک بار	اتنا کہا تھا وہم نے ہاں چل تو ایک بار
دونوں نے ہم عنانی سرعت کی اختیار	آخر کہاں وہ اور کہاں وہم ہرزہ کار

کچھ دور تو ساتھ ساتھ وہ دوڑ کر گیا
پھر یہ خبر نہیں کہ کہاں تھا کدھر گیا

اسی زمانہ میں میر خلیق صاحب نے مرثیہ کے فن کو بہت ترقی دی، میر انیس صاحب اُن کے بیٹے جابجا اپنے مرثیوں میں اُنکی فصاحت اور روزمرہ کا ذکر کرتے ہیں ایک بند میں اپنے روزمرہ پہ ناز کرتے ہیں اور کہتے ہیں ع حقا کہ یہ خلیق کی ہے سرسبز زباں، میر خلیق کے ایک سلام کا مطلع و مقطع مشہور ہے ؎

نجر اپنی طبع کی سبب لطف بیاں گیا	دنداں گئے کہ جوہر تیغ زباں گیا
گزری بہار میر خلیق اب کہیں سب	باغ جہاں سے بلبل ہندوستاں گیا

ان اشعار سے قیاس ہوتا ہے کہ میر خلیق نے مرثیہ کے فن پر احسان کم نہیں کیا ہوگا، لیکن افسوس ہے کہ اُن کا کلام نہیں ملتا۔ میر نواب صاحب امی ایک بزرگ نے جو میر خلیق کے بیک واسطہ شاگرد تھے، ۱۳۰۲ھ میں بمقام گلبرگہ حیدرآباد دکن ایک مجموعہ چھاپا تھا جسمیں میر خلیق، مونس، اور انیس کے

چند مرثیے جمع کیے تھے، اس میں میر خلیق کے متعدد مرثیے ہیں۔ لیکن اکثر وہ ہیں جو آج میر انیس کے نام سے مشہور ہیں اور جو میر انیس کے چھپے ہوئے مرثیوں میں شامل ہیں، بعض ایسے ہیں جو مطبوعہ مرثیوں میں شامل نہیں۔ لیکن زبان اور طرز ادا سے قیاس ہوتا ہے کہ میر انیس ہی کے نتائج فکر ہیں، اور اگر وہ واقعی میر خلیق کا کلام ہے، تو بیٹے کو باپ پر ترجیح کی کوئی وجہ نہیں۔

چند نمونے ملاحظہ ہوں ؎

مرتا ہے باپ اے علی اکبرؑ! ابھی نہ جا
دل مانتا نہیں مرے دلبر ابھی نہ جا
اے لال! سوئے نیزہ و خنجر ابھی نہ جا
بے ہے نہ جا شبیہ پیمبر ابھی نہ جا
مضطر ہوں چین آنے پہ آتا نہیں مجھے
رونے میں منھ ترا نظر آتا نہیں مجھے

ماتھے کو چومتے تھے کبھی اور دہن کبھی
تکتے تھے سوئے زلف شکن در شکن کبھی
روتے تھے لیکے بوسہ سیب ذقن کبھی
یوسف کا اپنے سونگھتے تھے پیرہن کبھی
ملتے تھے خشک ہونٹھ لب گلعذار سے
سینہ پہ رکھتے تھے کبھی منھ اپنا پیار سے

پیاسے پہ شل ابر جو اُمنڈ آئے دل کے دل
شعلے صفت چمکنے لگے برچھیوں کے پھل
جلوں میں تیر کھکے بڑھے دم زدنے کے پل
تیغیں اٹھی ہوئیں جو کھنچیں ہٹ گئی اجل
دن کو سیاہی شب ظلمات ہو گئی
کھوئے نشان شامیوں نے رات ہو گئی

ہو جیسی زرہ حباب ہے ہیں سر اسکے سامنے
شق ہیں بہادروں کے جگر اسکے سامنے
رکھتی ہے کیا بساط سپر اسکے سامنے
تھکے ہیں جبرئیل کے پر اسکے سامنے

ماریں کمر کا ہاتھ اگر پاؤں گاڑ کے
دو ٹکڑے آسیا کی طرح ہوں پہاڑ کے

حیران تھے کہ جسم سے کب تھی جدا ہوئی
ترکش میں ڈھونڈتے تھے کہ تلوار کیا ہوئی

میر انیس تقریباً ۱۸۰۲ء میں پیدا ہوئے، انھوں نے مرثیہ کو جو ترقی دی، اُس کی تفصیل آگے آئے گی، یہاں جو باتیں کہنے کے قابل ہیں یہ ہیں۔

۱۔ میر انیس کا خاندان دلی کا خاندان تھا، اگرچہ ان کے پردادا ضاحک دلی سے چلے آئے تھے، اور فیض آباد میں سکونت اختیار کر لی تھی، تاہم دہلی کی جو خصوصیات تھیں، وہ اخیر تک اس خاندان میں قائم رہیں، میر انیس اکثر موقعوں پر زنانے لہجہ میں کہتے تھے، صاحبو! ارباب لکھنؤ اس طرح نہیں بولتے، یہ میرے گھر کی زبان ہے، اسی بنا پر جا بجا جگہ کو "جاگہ" لکھا ہے، اور یہ صرف تحریری زبان نہیں، وہ یوں ہی بولتے بھی تھے، میں نے اپنے معزز دوستوں سے جو میر صاحب کی صحبتوں میں اکثر شریک رہے ہیں، سنا ہے کہ جب کبھی ان کی مجلس میں لوگ صف نعال میں آکر بیٹھ جاتے تھے، تو فرماتے تھے، صاحبو! جاگہ ادھر ہے، افعال کو فاعل کی مطابقت سے جمع لکھنا بھی دہلی ہی کا اثر ہے، مثلاً چاندی میں گو جوانوں نے جگہیں بچائیں

۲۔ میر صاحب نے شاعری میراث میں پائی تھی، اُن کے جو خاص جوہر ہیں وہ میراث ہی کی یادگار ہیں، اُن کے دادا میر حسن گو غزل بھی کہتے تھے لیکن جس چیز نے اُن کو عالم شہرت کا تاجدار بنایا، وہ ان کی مثنوی بدر منیر ہے" اس مثنوی کا خاص وصف، واقعات اور کیفیات کا سین دکھانا ہے، وہ جس واقعہ یا حالت کو لکھتے ہیں اس کا سماں باندھ دیتے ہیں۔

میر انیس کے مرثیوں میں واقعات اور کیفیات کی تصویر کھینچ دینے کی جو خصوصیت ہے، دادا کی میراث ہے۔ البتہ یہ فرق ہے کہ میر حسن واقعہ نگاری کی وسعت میں

ابتذال، اور عامیانہ بول چال کی پروا نہیں کرتے، میر انیس نے واقعہ نگاری اور مصوّری کے ساتھ، بندش کی چستی، اور خواص کی طرز گفتگو کی خصوصیت بھی قائم رکھی اور قادر الکلامی کی انتہا ہے۔

۳۔ میر حسن صاحب غزل گوئی میں اگرچہ سودا اور میر درد کے شاگرد تھے، لیکن سودا کا پرتو اُن پر نہیں پڑا صرف میر درد کا رنگ ہے، یعنی روزمرہ صفائی، گھلاوٹ اور درد یہی باتیں میر انیس صاحب کے ہاں بھی ہیں، جو لوگ کہتے ہیں کہ میر انیس صرف بین لکھنا جانتے ہیں اس جھوٹ میں سچ بھی ہے۔ یعنی بین رزم سے بہتر لکھتے ہیں، یہ وہی خصوصیت ہے جو دادا سے ترکہ میں ملی ہے،

۴۔ میر انیس کی شاعری کے متعلق یہ مسئلہ نہایت مہتم بالشان مسئلہ ہے کہ مرزا دبیر کی رقابت اور مقابلہ نے اُن کے کلام پر کیا اثر پیدا کیے، اگر یہ پتہ لگ سکتا کہ دونوں حریفوں میں سے اوّل کس نے میدان شاعری میں قدم رکھا اور خاص خاص مرثیے، بلکہ خاص خاص بند جو دونوں کے ہاں قریب المعنی پائے جاتے ہیں، اوّل کس نے کہے، تو شاعری کی تاریخ کے بہت سے دقیق نکتے حل ہو جاتے ہیں، لیکن افسوس ہے کہ باوجود بہت سی جد وجہد کے اس بارہ میں مجکو کچھ کامیابی نہیں ہوئی،

دونوں حریفوں کے مرثیوں کو دیکھو، تو صاف نظر آتا ہے کہ ایک نے دوسرے کے کلام کو سامنے رکھ کر لکھا ہے، لیکن زمانہ کے تقدیم و تاخیر کے نہ معلوم ہونے سے یہ نہیں متعین ہوتا کہ ایجاد کا فخر کس کو ہے، اور کس نے کس سے کیا اثر لیا ہے؛ میر انیس جا بجا فخریہ شعروں میں اس بات کا اشارہ کرتے ہیں کہ اُن کے حریف اُن کے کلام سے فائدہ اُٹھاتے ہیں، مثلاً

لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار	خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو
نو اسنجیوں نے تری اے انیس	ہر اک زاغ کو خوش بیاں کر دیا

ملتی نہیں دزدان معانی سے نجات
سچ ہے کہ مگس سے کب شکر بچتی ہے

ان چوٹوں کو سن کر مرزا دبیر صاحب برابر کا جواب نہیں دیتے، یعنی یہ نہیں کہتے کہ میں نہیں، میرا حریف سرقہ کرتا ہے، بلکہ صرف تبری کرتے ہیں کہ میں اس جرم کا مرتکب نہیں، چنانچہ فرماتے ہیں ؎

شکر خدا کہ سرقہ کی حد سے بعید ہوں
ہر مرثیہ میں موجد طرز جدید ہوں
ہے استفادہ مجھ کو احادیث و سیر سے
یعنی بری ہوں سرقہ مضمون غیر سے

اس سے اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے کہ میر انیس، مرزا صاحب کے مقابلہ کا قصد نہیں کرتے تھے، اور ان سب کے مرثیوں کا جواب لکھنا نہیں چاہتے تھے ورنہ مرزا صاحب اس کا اشارہ کرتے۔ اسکے ساتھ جب بعض مرثیوں سے صاف ثابت ہے کہ وہ ایک دوسرے کے مقابلہ پر لکھے گئے ہیں، تو خواہ مخواہ ماننا پڑتا ہے کہ مقابلہ اور ہم طرحی و مسابقت کی کوشش مرزا صاحب ہی کی طرف سے ہوتی تھی۔ میر انیس نے اسی کی طرف ایک موقع پر اشارہ کیا ہے، چنانچہ کہتے ہیں ؎

بھلا تردد بیجا سے اس میں کیا حاصل
اٹھا چکے ہیں زمیندار جن زمینوں کو

جن مرثیوں یا اشعار یا مضامین میں اتحاد یا توارد ہے، ان کی تفصیل آگے آئیگی اور وہاں اس تمہیدی بحث کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔

۵۔ میر انیس کا جو کلام موجود ہے وہ جلدوں میں شائع ہوا ہے، لیکن میر صاحب کے متوسلین کا خاص دعویٰ ہے، کہ ان مرثیوں میں بہت کچھ تحریف اور خلط ہوا ہے مولوی عبدالغفور نساخ نے ایک رسالہ مرزا دبیر اور میر انیس کے اغلاط کے متعلق لکھا تھا، اس کا جواب میرزا محمد رضا متخلص بہ معجز، شاگرد ناسخ نے لکھا جس کا نام لطمۃ الاوساخ ہے، اور جو ۱۲۹۶ھ میں شعلہ طور کانپور میں چھپا تھا، اس کے دیباچہ میں مرزا رضا صاحب لکھتے ہیں،

"ثانیاً یہ بات بھی کالنار علی العلم ہے کہ اکثر تلامذۂ میر صاحب و مرزا دبیر صاحب نے بلحاظ اپنے پڑھنے کے اکثر تصرفات بہ تغیر و تبدل الفاظ و مصرعہ و بند کے کیے ہیں، بہ نظر اختصار کسی مرثیہ کے کچھ بند نکال ڈالے، اور کہیں درمیان مرثیہ میں کوئی مطلع یا بند ایجاد کر کے الحاق کیا تاکہ وہیں سے پڑھنا شروع کریں کہیں بغرض بکا و ابکا، مضامین مُبکیہ موزوں کر کے شامل مرثیہ کیے، کہیں الفاظ میں واقف اپنے فہم و سلیقہ کے کمی و بیشی کی، یا مشتاقین نے جو مرثیہ جدید زبان سے ان صاحبوں کی مجلس میں سُنا خفیہ تحریر کیا، اور جو الفاظ یا مصرع بسبب عجلت تحریر یا عدم سماعت کے رہ گئے، اس کی تکمیل بطور خود کی، اس باعث سے کہ نقل مرثیہ جدید و نو تصنیف کا دستیاب ہونا شاعرین سے غیر ممکن تھا، پس جو کہ مرثیے اُن کے تلامذہ کے پاس ہیں، اُن میں اکثر کا اصل نہیں ہیں تغیر و تبدل و اضافہ و نقصان اُن میں بہت ہے، اور انھیں مرثیوں کی نقل وہ مرثیے ہیں، جو مطبوع ہوئے ہیں پس مراثی مطبوعہ من قبیل بنار الفاسد علی الفاسد ہیں؛

اس بنا پر میرزا رضا صاحب نے میر نفیس صاحب سے جو میر انیس کے فرزند رشید تھے مطبوعہ مرثیوں کی تصحیح کی جسکا نتیجہ حسب ذیل ہے:

یہ مرثیہ ع اے تیغ زبان جوہر تقریر دکھا دے، اس مصرعہ تک ملنے لگا آنکھیں قدم سرور دین پر، میر صاحب کا کلام ہے، باقی ۱۴۵ سے لیکر ۱۵۰ تک اور مقطع کے دو اول مصرعے سب الحاقی ہیں۔

یہ مرثیہ ع دشت وغا میں نور خدا کا ظہور ہے، ۸۰ بند تک یعنی اس بیت تک مصرع چھاتی سے پار نیزہ کی نوکیں نکل گئیں، میر صاحب کا کلام ہے، باقی الحاقی ہے، یہ شعر

لپٹوں گلے سے میں پدر ناتوان کے		سینہ سے تو سرک تو مرے بابا جان کے"

الحاقی ہے،

میرزا رضا صاحب نے اور بہت سے اعتراضات کے جواب مین جو خاص خاص الفاظ یا تراکیب پر تھے اُن الفاظ اور تراکیب سے انکار کیا ہو، اور کہنا ہو کہ اصل مرثیہ مین یون نہین، یون ہو، چونکہ اس قسم کے الفاظ نہایت کثرت سے تھے اسلیے ہم اُن کو قلم انداز کرتے ہین۔ ناظرین چاہین تو اصل رسالہ کو ملاحظہ فرمائین۔

ہم کو اس سے انکار نہین کہ مطبوعہ مرثیے نہایت غلط چھپے ہین، لیکن مرزا رضا صاحب نے تو یہ غضب کیا ہو کہ جہان کوئی لفظ محاورہ حال کے خلاف نظر آیا اُسکے وجود سے انکار کر دیا، حالانکہ یہ تعمیم صحیح نہین۔ میرانیس نے بہتر برس کی عمر پائی، اُنکی ابتدا مشق مین قدیم محاورے اور غلط الفاظ نہایت کثرت سے متداول تھے، اور شعرا بے تکلف اُن کو استعمال کرتے تھے، شیخ ناسخ نے البتہ اس قسم کے تمام الفاظ کو ترک کر دیا تھا، لیکن جو لوگ اپنے تئین دلّی کی طرف منسوب کرتے تھے، وہ ان الفاظ اور محاورات کو وطن کی یادگار سمجھتے تھے، چنانچہ غالب و ذوق جو خاتم الشعرا ہین اُن کے ہان وہ الفاظ بے تکلف ملتے ہین، جن کو شیخ ناسخ مدتون سے چھوڑ چکے تھے مثلاً میرزا غالب فرماتے ہین۔

ع ستمکش مصلحت سے ہون کہ خوبان تجھ پہ عاشق ہین،

حالانکہ اس قسم کی جمع، ایک مدت سے متروک ہو، اس قسم کے الفاظ میر انیس کے ہان بھی ہین، اور کثرت سے ہین، لیکن وہ ابتدائی مشق کے ہین، پھر شیخ ناسخ کے اثر یا خود مذاق کے بدلنے سے جس قدر زمانہ گذرتا گیا، میر صاحب قدیم مخصوص الفاظ اور تراکیب چھوڑتے گئے۔

میر انیس کی شاعری کی خصوصیات

اب ہم تفصیل کے ساتھ میر صاحب کی شاعری کی خصوصیات بیان کرتے ہیں،

فصاحت

فصاحت۔ علمائے ادب نے فصاحت کی یہ تعریف کی ہے کہ لفظ میں جو حروف آئیں اُن میں تنافر نہو، الفاظ نامانوس نہوں، قواعد صرفی کے خلاف نہو"

اِس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ لفظ درحقیقت ایک قسم کی آواز ہے، اور چونکہ آوازیں بعض، شیریں، دلآویز، اور لطیف ہوتی ہیں مثلاً طوطے و بلبل کی آواز، اور بعض مکروہ و ناگوار مثلاً کوّے اور گدھے کی آواز، اس بنا پر الفاظ بھی دو قسم کے ہوتے ہیں بعض شستہ، شاداب، شیریں اور بعض ثقیل بھدّے، ناگوار، پہلی قسم کے الفاظ کو فصیح کہتے ہیں اور دوسرے کو غیر فصیح۔ بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں کہ فی نفسہٖ ثقیل اور مکروہ نہیں ہوتے لیکن تحریر و تقریر میں اُن کا استعمال نہیں ہوا ہے یا بہت کم ہوا ہے، اس قسم کے الفاظ بھی جب ابتداءً استعمال کیے جاتے ہیں تو کانوں کو ناگوار معلوم ہوتے ہیں، اُن کو فن بلاغت کی اصطلاح میں غریب کہتے ہیں اور اس قسم کے الفاظ بھی فصاحت میں مخل انداز خیال کیے جاتے ہیں،

میر انیس کے کمال شاعری کا بڑا جوہر یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ اُنھوں نے اردو شعرا میں سے سب سے زیادہ الفاظ استعمال کیے اور سیکڑوں مختلف واقعات بیان کرنے کی وجہ سے، ہر قسم اور ہر درجہ کے الفاظ اُن کو استعمال کرنے پڑے، تاہم اُن کے تمام کلام میں غیر فصیح الفاظ نہایت کم پائے جاتے ہیں۔ اکثر جگہ عربی، فارسی کے الفاظ جو اُردو زبان میں کم مستعمل ہیں ضرورت سے لانے پڑے ہیں لیکن اس قسم کے الفاظ جہاں آئے ہیں، فارسی ترکیبوں کے ساتھ آئے ہیں جس سے اُنکی غرابت

کم ہو گئی ہی، ورنہ اگر اُردو کی خاص ترکیب میں اُن الفاظ کا استعمال کیا جاتا تو بالکل خلاف فصاحت ہوتا مثلاً انگشتری، خاتم، رُخ، بادہ، ثنا، حُسن، اور اِس قسم کے سیکڑوں ہزاروں الفاظ ہیں جو بجائے خود فصیح ہیں لیکن ٹھیٹ اردو میں ان کا استعمال نہیں ہوتا۔ میر ضمیر ایک موقع پر کہتے ہیں ع ذریت رسول کی خاطر جلائی نار۔ نار کا لفظ اس موقع پر نہایت نامانوس اور بیگانہ ہی؛ لیکن یہی لفظ جب فارسی ترکیبوں کے ساتھ اُردو میں مستعمل ہوتا ہی مثلاً نار دوزخ، نار جہنم تو وہ غرابت نہیں رہتی،

فصاحت کے مدارج میں اختلاف ہی، بعض الفاظ فصیح ہیں، بعض فصیح تر، بعض اُس سے بھی فصیح تر۔ میر انیس صاحب کے کلام کا بڑا خاصہ یہ ہے کہ وہ ہر موقع پر فصیح سے فصیح الفاظ ڈھونڈھ کر لاتے ہیں میرزا دبیر، اور میر انیس کے ہم مضمون اشعار لو، اگر میرزا صاحب کے ہاں غریب اور ثقیل الفاظ ہوں گے تو ان کے مقابلہ میں میر صاحب کے ہاں فصیح الفاظ ہوں گے، اور اگر میرزا صاحب کے ہاں فصیح الفاظ ہوں گے تو میر صاحب کے ہاں فصیح تر ہوں گے مرزا دبیر کی تخصیص نہیں تمام مرثیہ گویوں کے مقابلہ میں میر انیس کے کلام کا یہی حال ہی،

ہم مثال کے طور پر دو چار شعر نقل کرتے ہیں۔ جن سے فصاحت اور فصاحت کے اختلاف مراتب کا اندازہ ہو سکے گا۔

میرزا دبیر — ع — کس نے نہ دی انگوٹھی رکوع و سجود میں
میر انیس — ع — سائل کو کس نے دی ہی انگوٹھی نماز میں
میرزا دبیر — ع — آنکھوں میں بھرے اور نہ مردم کو خبر ہو
میر انیس — ع — آنکھوں میں یوں بھرے کہ مژہ کو خبر نہ ہو
میرزا دبیر — ع — رویا میں بھی حسینؑ کو رویا ہی کرتے ہیں
میر انیس — ع — حسرت ہی کہ خواب میں بھی رویا کیجے

میرزا دبیر	ع جیسے مکان سے زلزلہ میں صاحب مکان
میر انیس	ع جیسے کوئی ہو بخال میں گھر چھوڑ کے بھاگے

ابتذال

فصاحت کے متعلق ایک بڑا دھوکا یہ ہوتا ہے کہ چونکہ فصاحت کے یہ معنی ہیں کہ لفظ سادہ، آسان، کثیر الاستعمال ہو، اس لیے مبتذل اور سوقی الفاظ کو بھی فصیح سمجھ لیتے ہیں، حالانکہ ان دونوں میں سفید و سیاہ کا فرق ہے، میرزا دبیر صاحب جہاں واقعہ نگاری اور معاملہ بندی میں میر انیس کی تقلید کرتے ہیں، اکثر ان کے کلام میں مبتذل الفاظ آجاتے ہیں ؎

مثلاً جہاں حضرت شہر بانو نے حضرت عباسؑ کی لاش پر نوحہ کیا ہے شہر بانو کی زبان سے فرماتے ہیں ع ہے ہے مرے دیور مرے دیور مرے دیور۔ ایک اور جگہ فرماتے ہیں ع ناڑہ تو اُن کی سالگرہ کا نکال لا +

ابتذال کی صاف اور بین مثال نظیر اکبرآبادی کا کلام ہے اگر یہ تمیز ہوتا تو سادگی اور صفائی میں نظیر کا کلام میر انیس یا میر تقی سے ٹکر کھاتا۔

ابتذال کے معنی عام طور پر یہ سمجھے جاتے ہیں کہ جو الفاظ عام لوگ استعمال کرتے ہیں وہ مبتذل ہیں۔ لیکن یہ صحیح نہیں، سیکڑوں الفاظ عوام کے مخصوص الفاظ ہیں لیکن سب میں ابتذال نہیں پایا جاتا، ابتذال کا معیار مذاق صحیح کے سوا اور کوئی چیز نہیں، مذاق صحیح خود بتا دیتا ہے کہ یہ لفظ مبتذل، پست اور سوقیانہ ہے،

میر صاحب کو اگرچہ واقعہ نگاری کی وجہ سے نہایت چھوٹی چھوٹی چیزوں اور ہر قسم کی جزئی جزئی واقعات اور حالات کو بیان کرنا پڑتا ہے لیکن یہ انکی انتہا درجہ کی قادر الکلامی ہے کہ پھر بھی اُن کی شاعری کے دامن پر ابتذال کا دھبہ نہیں لگنے پاتا،

کلام کی فصاحت یہ بحث مفرد الفاظ سے متعلق تھی لیکن کلام کی فصاحت میں صرف لفظ کا فصیح ہونا کافی نہیں، بلکہ یہ بھی ضرور ہے کہ جن الفاظ کے ساتھ وہ

ترکیب مین آئے اُن کی ساخت ہیئت نشست ہُلکی اور گرانی کے ساتھ اُس کو خاص تناسب اور توازن ہو، ورنہ فصاحت قائم نہ رہیگی قرآن مجید مین ہے۔ ماکذب الفواد ما رأی فواد اور قلب دو ہم معنی الفاظ ہین، اور دونون فصیح ہین لیکن اگر اس آیت مین فواد کے بجاے قلب کا لفظ آئے تو خود یہی لفظ غیر فصیح ہو جائیگا جسکی وجہ یہ ہے کہ گو قلب کا لفظ بجاے خود فصیح ہے لیکن ماقبل اور مابعد کے جو الفاظ ہین اُن کی آواز کا تناسب قلب کے لفظ کے ساتھ نہین ہے۔

میر انیس کا مصرع ہے ع فرمایا آدمی ہے کہ صحرا کا جانور صحرا اور جنگل ہم معنی ہین اور دونون فصیح ہین میر انیس نے جا بجا ان دونون لفظون کو استعمال کیا ہے اور ہم معنی ہونے کی حیثیت سے کیا ہے لیکن اگر اس مصرعہ مین صحرا کے بجاے جنگل کا لفظ استعمال کیا جاے تو یہی لفظ غیر فصیح ہو جائیگا میر صاحب کا ایک شعر ہے

طائر ہوا مین مست ہرن سبزہ زار مین		جنگل کے شیر گونج رہے تھے کچھار مین

یہان جنگل کے بجاے صحرا لاؤ تو مصرعہ کا مصرعہ پھُس پھُسا ہو جاتا ہے۔

شبنم اور اوس ہم معنی ہین اور برابر درجہ کے فصیح ہین لیکن میر صاحب کے اس شعر مین سے

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا		تھا موتیون سے دامن صحرا بھرا ہوا

اگر اوس کے بجاے شبنم کا لفظ لایا جاوے تو فصاحت خاک مین ملجائیگی لیکن یہی اوس کا لفظ جو اس موقع پر اس قدر فصیح ہے اس مصرعہ مین ع شبنم نے بھر دیے تھے کٹورے گلاب کے۔

شبنم کے بجاے لاؤ تو فصاحت بالکل ہوا ہو جائے گی۔

اس مین نکتہ یہ ہے کہ ہر لفظ چونکہ ایک قسم کا سُر ہے اس لیے یہ ضرور ہے کہ جن الفاظ کے سلسلہ مین وہ ترکیب دیا جائے، اُن آوازون سے اسکو خاص تناسب

بھی ہو ورنہ گویا دو مخالف سُرون کو ترکیب دینا ہوگا، نغمہ اور راگ مفرد آوازون
یا سُرون کا نام ہی، ہر سُر بجائے خود دلکش اور دلآویز ہی، لیکن اگر دو مخالف
سُرون کو باہم ترکیب دیدیا جائے تو دونون مکروہ ہوجائین گے،

راگ کے دلکش اور موثر ہونے کا گُر یہی ہی کہ جن سُرون سے اُسکی ترکیب
ہو اُن مین نہایت تناسب و توازن ہو۔

الفاظ بھی چونکہ ایک قسم کی صوت اور سُر ہین اس لیے اُنکی لطافت اور
شیرینی اور روانی، اسی وقت تک قائم رہتی ہی جب گرد و پیش کے الفاظ بھی
لَے مین اُن کے مناسب ہون۔

میرزا دبیر صاحب کا مشہور مصرعہ ہی ع زیر قدم والدہ فردوس برین ہے
اس مین جتنے الفاظ ہین یعنی زیر قدم۔ والدہ۔ فردوس۔ برین۔ سب بجائے خود
فصیح ہین، لیکن اُن کے باہم ترکیب دینے سے جو مصرع پیدا ہوا ہی وہ اس قدر
بھدا اور گران ہی کہ زبان اُس کا تحمل نہین کر سکتی، شاید تم کو یہ خیال ہو کہ مصرع کی
ترکیب چونکہ فارسی ہو گئی ہی، اس لیے ثقل پیدا ہو گیا ہی لیکن یہ صحیح نہین سیکڑون
شعرون مین اس قسم کی فارسی ترکیبین ہین، لیکن یہ ثقل نہین پایا جاتا، مثلاً
میر انیس صاحب کہتے ہین ؎

مین ہون سردار شباب چمن خلد برین	مین ہون خالق کی قسم دوش محمد کا مکین

پہلے مصرعہ مین فارسی ترکیب کے علاوہ توالی اضافات بھی موجود ہی لیکن
یہ بھدا پن اور ثقل نہین ہی۔

جب کسی مصرعہ یا شعر کے تمام الفاظ مین ایک خاص قسم کا تناسب توازن
اور توافق پایا جاتا ہی اُس کے ساتھ وہ تمام الفاظ بجائے خود بھی فصیح ہوتے ہین
تو وہ پورا مصرعہ یا شعر فصیح کہا جاتا ہی اور یہی چیز ہی جسکو بندش کی صفائی، نشست

کی خوبی، ترکیب کی دلآویزی، برجستگی، سلاست اور روانی سے تعبیر کرتے ہین یہی چیز ہی جس کی نسبت خواجہ حافظ فرماتے ہین ؎

آن را کہ خوانی استاد گر بنگری بتحقیق
صنعت گر است اما شعر روان ندارد

الفاظ کے توازن و تناسب سے کلام مین جو فرق پیدا ہوجاتا ہی وہ ایک خاص مثال مین آسانی سے سمجھ مین آسکتا ہی میر انیس حضرت علی اکبر کے اذان دینے کی تعریف ایک موقع پر اس طرح کرتے ہین ع

تھا بلبل حق گو کہ چہکتا تھا چمن مین

اسی مضمون کو میر صاحب دوسرے موقع پر اس طرح ادا کرتے ہین ع

بلبل چہک رہا تھا ریاض رسول مین

وہی مضمون ہی وہی الفاظ ہین لیکن ترکیب کی ساخت نے دونون شعرون مین کس قدر فرق پیدا کر دیا ہی

میر انیس کا تمام کلام اس خوبی سے معمور ہی اور اُن کا ہر شعر اس وصف کا مصداق ہی، نمونہ کے طور پر ہم چند اشعار اس موقع پر نقل کرتے ہین ؎

تعریف مین چشمہ کو سمندر سے ملا دون
ذرے کی چمک مہر منور سے ملا دون
قطرہ کو جو دون آب تو گوہر سے ملا دون
کانٹون کو نزاکت مین گل تر سے ملا دون

گلدستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھون
اک پھول کا مضمون ہو تو سو رنگ سے باندھون

برہم ہوے یہ سنتے ہی عباس خوشخصال
قبضہ پہ ہاتھ رکھ کے یہ بولا علی کا لال
ولہ
غازی کو شیر حق کی طرح آگیا جلال
اب یان سے ہم کو کوئی ہٹا دے یہ کیا مجال

حملہ کرین جو بڑھا کے اگر آستین کو
ہم آسمان سمیت الٹ دین زمین کو

تھا فوج قاہرہ میں تلاطم کہ الحذر — تھیں موج کی طرح سب اُدھر کی صفیں اُدھر
چکر میں تھی سپاہ کہ گردش میں تھا بھنور — پانی میں تھے نہنگ ابھرتے نہ تھے مگر
فوجیں فقط نہ بھاگی تھیں منھ موڑ موڑ کے
دریا بھی ہٹ گیا تھا کنارے کو چھوڑ کے

چھایا تھا سب پہ رعب علمدار نوجواں — تسلیم کو جھکے ہوئے تھے فوج کے نشاں
گوشہ اماں کا ڈھونڈھ رہی تھی ہر اک کماں — ترکش بھی تھے ہراس سے کھولے ہوئے زباں
تیروں کا بیگماں تھا ارادہ گریز کا
منھ کند ہو گیا تھا ہر اک تیغ تیز کا

آگے چل کر کہتے ہیں ؎

تب شمر نے کہا کہ فصاحت سے کیا حصول — بیعت اُنھیں تو صلح ہمیں بھی نہیں قبول
غازی پکارا او نجس و مرتد و جہول — لیجو نہ منھ سے نام جگر گوشۂ رسول
سمجھا ہے کیا امام عراق و حجاز کو
گُدی سے کھینچ لوں گا زبانِ دراز کو

تو کیا ہے اور کیا ہے ترا وہ امیر شام — کرتے ہیں بادشاہ کہیں بیعتِ غلام
تو بھی نمک حرام ہے وہ بھی نمک حرام — او بے ادب یزید کجا! اور کجا امام!!
دوزخ سے دور رہتے ہیں سالکِ بہشت کے
کعبہ کبھی جھکا نہیں آگے کنشت کے

ولہ

ماتم اِدھر تھا جشن میں تھے اہلِ شر اُدھر — بجتے تھے شادیانۂ فتح و ظفر اُدھر
انعام بانٹتا تھا ہر اک کو عمر اُدھر — روتے تھے دیکھ دیکھ کے حضرت اِدھر اُدھر
غل تھا کہ بس حسین بہت رو لیے بھائی کو — کوئی جوان ہو اور تو بھیجو لڑائی کو

باقی نہین کوئی تو وغا کو خود آئیے
زخمِ سنان و خنجر و شمشیر کھائیے
حیدر کی ذوالفقار کے جوہر دکھائیے
گرمی بڑی ہر آج لہو مین نہائیے
آمادہ ہم تو دیر سے ہر سستیز مین
تیغین بھی مین آئی ہوئی خنجر بھی تیز مین

صابر بڑے ہین آپ تو یا شاہِ انس و جان
رونے سے جی اُٹھین گے نہ عباس نوجوان
اِک بھائی کے فراق مین یہ نالہ و فغان
حضرت پکارتے ہین کسے بھائی اب کہان
ملتا ہر کب جہان مین بھائی جو گذر گیا
اب فکر اپنی کیجیے وہ شیر مر گیا

اکبر نے کی غضب کی نظر سوئے فوجِ شام
کی عرض ہاتھ جوڑ کے اے قبلۂ انام
کانپے یہ غیظ سے کہ اُگلنے لگی حسام
سُنتے ہین آپ لشکرِ اعدا کے یہ کلام
خون اب تو جوش کھاتا ہی ہنگامِ جنگ ہے
مولا بس اب تو حوصلۂ صبر تنگ ہے

برچھا اُدھر شقی نے لیا دیکھ بھال کے | ولہ | اکبر اِدھر سنبھل گئے بھالا سنبھال کے
دے کے جواب کسے ڈرے کدھر بھرے | ولہ | بجلی کے ساتھ ساتھ کہاں تک سپر پھرے
سب نشۂ غرورِ جوانی اُتر گیا | ولہ | تلوار کھنچی کہ حلق سے پانی اُتر گیا

کلام کی اصلی ترتیب کا قائم رہنا۔ ترکیبِ لفاظ کے لحاظ سے شعر کی بڑی خوبی یہ ہر کہ کلام کے اجزا کی جو اصلی ترتیب ہر وہ بحال خود قائم رہے، مثلاً فاعل، مفعول، مبتدا، خبر، متعلقاتِ فعل جس ترتیب کے ساتھ ہر وقت بول چال مین آتے ہین وہی ترتیب شعر مین بھی قائم رہے، اگرچہ اس مین شبہ نہین کہ شعر مین اِس ترتیب کا بعینہ قائم رہنا قریب قریب ناممکن ہر صرف ایک آدھ شعر یا بہت بہت شعر دو شعر مین اتفاقیہ یہ بات پیدا ہو جاتی ہر مثلاً سعدی کے یہ اشعار ؎

کلام کی اصلی ترتیب کا قائم رہنا

بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری — کہ از بوے دلآویز تو مستم
بگفتا من گلے ناچیز بودم — ولیکن مدتے با گل نشستم
جمال ہمنشین در من اثر کرد — وگرنہ من ہمان خاکم کہ ہستم

لیکن چونکہ نظم کا درحقیقت سب سے بڑا کمال یہی ہر کہ اگر اس کو، نثر کرنا چاہین تو نہ ہو سکے اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہر جب شعر مین الفاظ کی وہی ترتیب باقی رہے جو نثر مین معمولاً ہوا کرتی ہر، اُس بنا پر شاعر کو کوشش کرنی چاہیے کہ اگر اصلی ترتیب پوری پوری قائم نہین رہ سکتی تو بہر حال اُس کے قریب قریب پہونچ جائے، جسقدر اس کا لحاظ رکھا جائے گا۔ اُسی قدر شعر زیادہ صاف، برجستہ، روان، اور ڈھلا ہوا ہوگا اور اُردو مین جہانتک ہم کو معلوم ہر یہ صفت میر انیس صاحب سے زیادہ کسی کے کلام مین نہین پائی جاتی، نمونہ کے طور پر ہم چند اشعار اس موقع پر نقل کرتے ہین ؎

صغریٰ حضرت امام علیہ السلام سے کہتی ہین ؎

قربان گئی، اب تو بہت کم ہر نقاہت — تپ کی بھی ہر شدت مین کمی، درد سے خفت
بستر سے مین خود اُٹھکے ٹہلتی بھی ہون حضرت — پانی کی بھی خواہش ہر غذا کی بھی ہر رغبت

حضرت کی دعا سے مجھے صحت کا یقین ہر
اب تو مرے منھ کا بھی مزہ تلخ نہین ہے

ولہ

صغریٰ نے کہا آپکی باتو کے مین قربان — تم جان بچا لو کہ مین لونڈی ہون پھوپھی جان
بیٹی ہو علی کی، مری مشکل کرو آسان — جیتی ہی صغریٰ تو نہ بھولیگی یہ احسان

کچھ بات بجز گریہ و زاری نہین کرتین
امّاں تو سفارش بھی ہماری نہین کرتین

حضرت زینبؑ، حضرت عباسؑ سے فرماتی ہیں ؎

تم سے بڑی امید ہے زہرا کی جائی کو
بھیا ہمیں سے لیگی بہن ماں نے بھائی کو

حضرت امام علیہ السلام یزیدیوں سے مخاطب ہوکر فرماتے ہیں ؎

مجکو لڑنا نہیں منظور یہ کیا کرتے ہو
تیر جوڑے ہیں جو مجھ پہ تو خطا کرتے ہو
کیوں نبی زادہ پہ غربت میں جفا کرتے ہو
دیکھو اچھا نہیں یہ ظلم، برا کرتے ہو

شمع ایمان ہے طلق اگر سر مرا کٹ جائیگا
یہ مرقع ابھی اک دم میں اُلٹ جائیگا

خولی امام علیہ السلام کی فوج کی حالت ابن سعد سے بیان کر رہا ہے ؎

یہ سب غلط سُنا تھا کہ ہے لشکر کثیر
کچھ نوجوان ہیں طفل ہیں کچھ اور کچھ ہیں پیر
ہیں ان میں سات آٹھ تو لڑکے کئی صغیر
پس جائینگے وہ ٹاپوں سے ہنگام دار و گیر

کیا چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کی طاقت دکھائینگے
ان سے تو تیغے بھی سنبھالے نہ جائینگے

کیا جانے دل میں سمجھے تھے کیا شاہ کربلا
مقتل میں کھینچکر اُنھیں لے آئی ہے قضا
لشکر تو یہ قلیل اور اس فوج سے وغا
عمریں ہیں چھوٹی چھوٹی بھلا وہ لڑینگے کیا

کچھ آزمودہ کار نہیں کچھ مسن نہیں
ان کے ابھی تو گھر سے نکلنے کے دن نہیں

اس قسم کے اور ہزاروں اشعار ہیں آگے مختلف موقعوں پر جو اشعار نقل کیے جائیں گے اُن میں اور دوسری خوبیوں کے ساتھ یہ خصوصیت بھی اکثر نظر آئیگی،

روزمرہ

روزمرہ اور محاورہ جو الفاظ اور جو خاص ترکیبیں اہل زبان کے بول چال میں زیادہ مستعمل اور متداول ہوتے ہیں، اُن کو روزمرہ کہتے ہیں، روزمرہ اگرچہ ایک جداگانہ وصف سمجھا جاتا ہے لیکن درحقیقت وہ فصاحت ہی کا

ایک فرد خاص ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ عام بول چال مین وہی الفاظ زبان پر آتے ہین جو سادہ صاف اور سہل الادا ہون، اور اگر اُن مین کچھ ثقل اور گرانی بھی ہو تو رات دن کی بول چال اور کثرت استعمال سے وہ منجھکر صاف ہو جاتے ہین۔ ابو العلا معری جو ایک ملحد شاعر تھا اُس نے قرآن مجید کا جواب لکھا تھا۔ لوگون نے اس سے کہا کہ گو یہ کلام بلیغ ہے لیکن اس مین قرآن مجید کی سی روانی اور صفائی نہین پائی جاتی۔ اس ملعون نے کہا ابھی تو نہین، لیکن جب دو چار سو برس نمازون مین منجھکر صاف ہو جائیگا تو روانی آجائے گی۔

غرض روزمرہ کے لیے فصیح ہونا لازم ہے۔ میر انیس کے کلام مین نہایت کثرت سے روزمرہ اور محاورہ کا استعمال پایا جاتا ہے، اور اس پر اُن کو ناز بھی تھا۔ چنانچہ فرماتے ہین ؎

مرغان خوش الحان چمن بولین کیا
مرجاتے ہین سُن کے روزمرہ میرا

چونکہ میر انیس کا کوئی کلام روزمرہ سے خالی نہین ہوتا، اس لیے ہم نمونہ کے طور پر صرف دو چار مثالین نقل کرتے ہین ؎

خشک تھا حلق مین یہ ذکر غم انگیز رہا — تو تو بچپن سے غلامون سے بھی کچھ تیز رہا

تعریف کرین ڈر کے تو خورسند نہ ہونا — اعدا سے کسی بات مین تم بند نہ ہونا

زینب نے کہا جس مین رضائے شہ عالی — مالک ہین وہی مین تو ہون اک جاننے والی

عبد نے سمجھے فرزند بھی سوگ نشین ہے
سمجھین تو مرا حق ہے نہ سمجھین تو نہین ہے

زندہ نہ محمد ہے نہ اب عون ہے بیٹا — تم بھی جو نہ پوچھو تو مرا کون ہے بیٹا

خادم جدا نہ تھا شہ گردون سریر سے — ولہ — کس جرم پر حضور خفا ہین حقیر سے

کس کی مجال ہو جو کہے گا یہ کیا کیا | ولہ | بی بی نے دی غلام کو رخصت بجا کیا

کہتے تھے راہ مین نہ کہ وار اپنا چل گیا | ولہ | افسوس ہو کہ ہاتھ سے دریا نکل گیا

مضامین کی نوعیت کے لحاظ سے الفاظ کا استعمال

حسن کلام کا ایک بڑا نکتہ یہ ہے کہ مضامین کی نوعیت کے لحاظ سے الفاظ استعمال کیے جائین۔

لفظ چونکہ آواز کی ایک قسم ہو اور آواز کے مختلف اقسام ہین، مہیب، پُر رعب سخت، نرم، شیرین، لطیف، اسی طرح الفاظ بھی صورت اور وزن کے لحاظ سے مختلف طرح کے ہوتے ہین بعض نرم، شیرین اور لطیف ہوتے ہین بعض سے جلالت اور شان ٹپکتی ہو، بعض سے درد اور غمگینی ظاہر ہوتی ہو اسی بنا پر غزل مین سادہ، شیرین، سہل اور لطیف الفاظ استعمال کیے جاتے ہین، قصیدہ مین زوردار اور شاندار الفاظ کا استعمال پسندیدہ سمجھا جاتا ہو، اسی طرح رزم، بزم، مدح وذم، فخر، دعا، وعظ و پند، ہر ایک کے لیے جُدا جُدا الفاظ ہین، شعرا مین سے جو اس نکتہ سے آشنا ہین وہ ان مراتب کا لحاظ رکھتے ہین اور یہ اُن کے کلام کی تاثیر کا بڑا راز ہو، لیکن جو اس فرق مراتب سے واقف نہین یا ہین لیکن ایک خاص رنگ اُن پر اسقدر چڑھ گیا ہو کہ ہر قسم کے مضامین مین ایک ہی قسم کے الفاظ ان کی زبان سے ادا ہوتے ہین، اُن کا کلام بجز ایک خاص رنگ کے بالکل بے اثر ہوتا ہو، یہی نکتہ ہو کہ سعدی سے رزم، اور فردوسی سے بزم نہین بنھ سکتی۔

میر انیس صاحب نے رزم، بزم، فخر، ہجو، نوحہ، سب کچھ لکھا ہو لیکن جہان جس قسم کا موقع ہوتا ہو اُسی قسم کے الفاظ اُن کے قلم سے نکلتے ہین رزمیہ فخر لکھتے ہین، تو فرماتے ہین ؎

طاقت اگر دکھاؤن رسالتمآب کی | | رکھدون زمین پہ چیر کے ڈھال آفتاب کی

جلال اور غیظ کو ان الفاظ مین ادا کرتے ہین ؎

گم تھا نہ ہمہمہ اسدِ کردگار سے
کیا جانے کس نے روک دیا ہے دلیر کو
تھا یہ بپھرا ہوا عباس مرا شیر جواں
لرزہ تھا رعبِ حق سے ہر اک نابکار کو

نکلا ڈکارتا ہوا ضیغم کچھار سے
سب دشت گونجتا ہے یہ غصہ ہے شیر کو
سینۂ حُر پہ رکھے دیتا تھا نیزہ کی سناں
روکے تھا ایک شیرِ جری دس ہزار کو

دیکھو ان اشعار میں جو الفاظ آئے ہیں، جسطرح اُن کے مفہوم میں غیظ و غضب ہے اسی طرح، الفاظ کی صورت و لہجہ سے بھی ہیبت اور غیظ و غضب کا اظہار ہوتا ہے۔

بحروں کا انتخاب اور حسن قافیہ و ردیف

شعر کی دلآویزی اور دلفریبی کا ایک بڑا نکتہ یہ ہے کہ ہر مضمون کی مناسب بحریں اختیار کی جائیں فردوسی کی اسی غلطی نے اس کے یوسف زلیخا کو مقبول ہونے سے محروم رکھا۔

شاہنامہ کی بحر رزم کے لیے مخصوص ہے، فردوسی نے عشقیہ واقعات بھی اسی بحر میں ادا کرنے چاہے اور اس وجہ سے ناکام رہا۔ میر انیس سے پہلے مرثیے اکثر بڑی بڑی بحروں میں لکھے جاتے تھے، مثلاً ع

جب مشک بھر کر نہر سے عباس غازی گھر چلے

ع آپ تو جیتے رہے، بابا کا سر کٹوا دیا،

یا نہایت چھوٹی بحروں میں

ع یہ کس منہ سے کہیے کہ وہ تشنہ لب ہے،

میر صاحب نے مین چار بحریں خاص کر لیں جن میں چند خصوصیتیں پائی جاتی تھیں،

۱- رزم و بزم، دونوں کے لیے موزوں تھیں مثلاً یہ بحر جس پہ یا تھا کہ تیغِ خرد بجا چلی،

۲- فقروں کی ترکیب اُن میں خواہ مخواہ چست ہو جاتی ہے مثلاً یہ بحر:

ع قطرہ کو جو دوں آب تو گوہر سے ملا دوں،

۳- کانوں کو خوش معلوم ہوتی ہیں،

قدیم مرثیوں میں ردیف کا بہت کم التزام ہوتا تھا قافیہ ہی قافیے ہوتے تھے میر صاحب نے ردیف کا گویا التزام کر لیا۔ آج کل جو لوگ انگریزی شاعری کی کورانہ تقلید کرتے ہیں وہ تو سرے سے قافیہ ہی کو بیکار کہتے ہیں ردیف کا کیا ذکر ہے، شاید انگریزی زبان کی ساخت اسی قسم کی ہو جیسا کہ عربی میں ردیف نہایت بدنما معلوم ہوتی ہی، لیکن فارسی اور اُردو میں تو ردیف تال اور سم کا کام دیتی ہی جسطرح راگ میں تال نہو تو بدمزہ ہی، یہی حالت اُردو شعر کی ہی البتہ ردیف کے التزام کے لیے بہت بڑا قادر الکلام ہونا ضروری ہی، ورنہ ردیف کے التزام کے ساتھ آمد اور بے ساختگی قائم نہیں رہتی۔ لیکن اگر یہ خوبی ہاتھ سے نہ جانے پائے تو ردیف سے شعر چمک جاتا ہی، ان دونوں شعروں پر غور کرو، ؎

ساقیا عید ہے لا بادہ سے مینا بھر کے	کہ مے آشام پیاسے ہیں مہینہ بھر کے
چاہتا خلق کو صہبا و صنم سے محروم	ایسی نیت پہ، بہشت آپ کو واعظ معلوم

دونوں شعر اپنی حیثیت سے لاجواب ہیں، لیکن پہلے شعر کو ردیف نے کسقدر چمکا دیا ہی بعض جگہ ردیف کی تکرار نہایت لطف پیدا کر دیتی ہی میر صاحب کے ہاں اس کی مثالیں بھی کثرت سے ملتی ہیں حسن قافیہ و ردیف، و تکرار کی یکجائی کی چند مثالیں ہم اس موقع پر نقل کرتے ہیں ؎

کہیں صفیں صاف مگر منھ کی صفائی نہ گئی	ولہ	سیکڑوں خون کیے اور کہیں آئی نہ گئی
شیطان عمر و سعد کی گردن پہ چڑھا ہی	ولہ	بھاگو پسر شیر خدا رن پہ چڑھا ہے
رکتا نہ تھا علی ولی کے پسر کا ہاتھ	ولہ	دو ہو گئے گرا جسے مارا کمر کا ہاتھ
بُلبلیں یہ کھلی کہ باپ نہ ٹھیرا پسر کے ساتھ	ولہ	اس معرکہ میں چھوٹ گئے عمر بھر کے ساتھ
ڈھالوں نے پھول لے لیے پھولوں سے زر لیا	ولہ	اپنا خراج تیغ نے ان سب سے بڑھ لیا
سب بھاگ گئے مگر نہ گئے تیغ زن کے ہاتھ	ولہ	وہ معرکہ رہا اسی گل پیرہن کے ہاتھ

ظالم شکار بن گیا گیہان خدیو کا	ولہ	کافر وہ تھا تو ہاتھ بھی مارا جنیو کا
ماتم ادھر تھا جشن میں تھے اہل شر ادھر انعام بانٹتا تھا ہر اک کو عمر و ادھر	ولہ	بجتے تھے شادیانۂ فتح و ظفر ادھر روتے تھے دیکھ دیکھ کے حضرت ادھر ادھر
پہچانتے تھے خوب پیمبر مرے جوہر کھولے ہیں ید اللہ نے اکثر مرے جوہر	ولہ	مخفی نہیں جبریل امیں پر مرے جوہر کرار نے دیکھے ہیں مکرر مرے جوہر
کیا کیا جگہ نے کھائی تھی سر کاٹ کاٹ کے باقی وہ خود بیے ہوئے تھی گھاٹ گھاٹ کے	ولہ	تنتی تھی کیا تنوں سے زمیں پاٹ پاٹ کے دم اور بڑھ گیا تھا لہو چاٹ چاٹ کے
بڑھتے تھے جو پرے سے بڑی بول بول کے حملہ کیا جو تیغ دو دم تول تول کے	ولہ	پہلے انھیں کو مار لیا ڈھول ڈھول کے ہتھیار رستے پھینک دیے کھول کھول کے
شہ کے غضب سے مانگتی تھی ہر کماں اماں دیتے نہ تھے کسی کو امام زماں اماں	ولہ	مضطر زمیں تھی مانگتا تھا آسماں اماں ہر سمت میں تھا یہ شور کہ مولا اماں اماں

تنسیق الصفات — جب کسی موقع پر چند الفاظ ایک وزن یا ایک قسم کے پے در پے آتے ہیں تو ایک خاص لطف پیدا ہوتا ہے، میر صاحب کے کلام میں اسکی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں ۔

دوزخ کی زبانوں سے بھی آنچ اسکی سوا تھی		برچھی تھی کٹاری تھی سروہی تھی چھری تھی
موجود بھی ہر غول میں اور سب سے جدا بھی اک گھاٹ پہ تھی آگ بھی پانی بھی ہوا بھی	ولہ	دم خم بھی لگاوٹ بھی صفائی بھی ادا بھی امرت بھی ہلاہل بھی مسیحا بھی قضا بھی
کوفہ میں یہی معرکہ دن بھر نظر آیا	ولہ	شمر آیا۔ سناں آیا۔ حُر آیا۔ عمر آیا
سمٹا۔ جما۔ اڑا۔ ادھر آیا۔ اُدھر گیا	ولہ	چمکا۔ پھرا۔ جمال دکھایا۔ ٹھہر گیا
چلتی تھی عجب ڈھنگ سے شمشیر قضا رنگ جم جم کا جدا رنگ تھا کس بل کا جدا رنگ	ولہ	ہر ہاتھ میں دکھلاتی تھی اعدا کو نیا رنگ لب سرخ۔ دہن صاف۔ بدن گل۔ ہرا رنگ

تلوار کی سبق ہے

بلاغت

انیس و دبیر کے موازنہ مین یہ فقرہ ضرب المثل ہو گیا ہے کہ میر صاحب مین فصاحت زیادہ ہی، اور مرزا صاحب مین بلاغت، لیکن یہ فقرہ جسقدر زیادہ مشہور ہی اُسی قدر غلط بلکہ اس سے زیادہ غلط اور بے معنی ہی، بلاغت کی جو تعریف تمام کتابون مین مذکور ہی اور جس سے کسی کو کسی قسم کا اختلاف نہین، اُسکی رو سے بلاغت کی پہلی شرط یہ ہی کہ کلام فصیح ہو، اس لیے فصاحت و بلاغت کو باہم حریف قرار دینا اجتماع النقیضین ہی، اگر مرزا صاحب مین بلاغت زیادہ ہی تو اسکے یہ معنی ہین کہ فصاحت بھی زیادہ ہی، کیونکہ کلام اُسوقت تک بلیغ نہین ہو سکتا جبتک اسکے تمام الفاظ، مفردات و مرکبات فصیح نہون اگر فصاحت مین کسی قسم کی کمی ہوگی تو بلاغت مین بھی کمی ہوگی، اس لیے کسی کلام کی نسبت یہ کہنا کہ اسمین بلاغت زیادہ ہی اور فصاحت کم۔ گویا یہ کہنا ہی کہ فصاحت زیادہ بھی ہی اور کم بھی،

بلاغت کی تعریف علماے معانی نے یہ کی ہی کہ کلام اقتضاے حال کے موافق ہو، اور فصیح ہو، مقتضاے حال کے موافق ہونا، ایسا جامع لفظ ہے جسمین بلاغت کے تمام انواع و اسالیب آجاتے ہین، لیکن افسوس ہی کہ کتب معانی مثلاً مطول، ایضاح، وغیرہ مین بلاغت کی جو تشریح کی ہی اور اُسکے جسقدر انواع و اقسام قرار دیے ہین، وہ نہایت جزئی اور معمولی باتین ہین، ان تصریحات کی رو سے بلاغت اس کا نام ہی کہ مبتدا اور خبر کہان مقدم لائے جائین اور کہان مؤخر؟ کہان معرفہ ہون کہان نکرہ؟ کہان مذکور ہون، کہان محذوف، اسناد کہان حقیقی ہو، کہان مجازی؟ جملہ کہان خبریہ ہو، کہان انشائیہ؟ دو فقرون مین کہان فصل ہو کہان وصل؟ کلام مین کس موقع پر اطناب کیا جائے کس موقع پر اختصار؟ گویا بلاغت کا

صرف اسقدر فرض ہے کہ جب تم کسی مطلب کو کسی خاص جملہ مین ادا کرنا چاہو تو وہ یہ بتا دے کہ جملہ کے اجزا کیا ہونے چاہئین اور اُن اجزا کی ترکیب کیا ہونی چاہیے، لیکن اگر عام طور پر یہ پوچھا جائے کہ کس قسم کے مضامین کو کیونکر ادا کرنا چاہیے، مثلاً مدح۔ ذم فخر۔ ہجا۔ تہنیت۔ تعریض۔ شوق۔ محبت۔ ان مضامین سے ہر ایک کے ادا کرنے کے کیا کیا خاص پیرائے ہین؟ ہر مضمون کا خاکہ کیونکر قائم کرنا چاہیے؟ کس قسم کے خیالات کس خاص مضمون کے ساتھ تعلق رکھتے ہین؟ تو موجودہ فن بلاغت اسکے متعلق کچھ رہبری نہین کرسکتا، حالانکہ بلاغت کا اصلی تعلق مضامین ہی سے ہے نہ الفاظ سے مثلاً یہ امر کہ ایک واعظ کو کسی بات کے ثابت کرنے کے لیے کس قسم کے مقدمات سے کام لینا چاہیے؟ اور اسی بات کو اگر ایک حکیم ثابت کرنا چاہے تو اُسکے استدلال کا کیا طرز ہوگا؟ اسمین الفاظ کی حیثیت سے بحث نہین ہوتی بلکہ صرف نوعیت استدلال کا لحاظ ہوتا ہے یعنی اگر ایک حکیم کے استدلال مین واعظانہ مقدمات پائے جائین تو کہا جائیگا کہ خلاف بلاغت ہے، کیونکہ بلاغت کے معنی مقتضائے حال کے موافق کلام کرنا ہے اور ظاہر ہے کہ ایک حکیم کو واعظانہ مقدمات سے استدلال کرنا اُسکے رُتبہ سے خلاف ہے، اس سے ظاہر ہوا کہ بلاغت کو الفاظ سے چندان تعلق نہین، محض مضامین کو بھی بلیغ یا غیر بلیغ کہا جاسکتا ہے، بلاغت الفاظ درحقیقت بلاغت کا ابتدائی درجہ ہے اصلی اور اعلیٰ درجہ کی بلاغت، معانی کی بلاغت ہے۔

میر انیس صاحب کے کلام مین بلاغت الفاظ بھی اگرچہ اعلیٰ درجہ کی ہے لیکن یہ اُن کے کمال کا اصلی معیار نہین، اُن کے کمال کا اصلی جوہر معانی کی بلاغت مین کھلتا ہے کربلا کے واقعات جو میر انیس اور تمام مرثیہ گویون کا موضوع شاعری ہے جہانتک تاریخ و روایت سے ثابت ہین نہایت مختصر ہین، لیکن مرثیہ گویون نے انمین نہایت وسعت پیدا کی ہے۔ بعض جگہ محض ایک اجمالی واقعہ مذکور تھا، اُس کو اسقدر وسعت دی

اکہ واقعہ کے تمام جزئیات بیان کر دیے، بعض جگہ روایت میں اس واقعہ کا نام و نشان بھی نہ تھا لیکن اس لحاظ سے کہ وقت اور حالت کے اقتضا سے اُس واقعہ کا پیش آنا ضرور تھا، واقعہ کو فرض کر لیا ہے اور پھر اُسکو اس طرح پھیلا کر لکھا ہے کہ گویا پورا واقعہ بعینہٖ روایتوں میں مذکور تھا۔

مثلاً یہ واقعہ کہ جب حضرت عباس کو علم ملا تو عون و محمد کو رنج ہوا کہ یہ ہمارا حق تھا وہ اپنی ماں حضرت زینب کے پاس شکایت لیکر گئے، انھوں نے سمجھایا کہ امام علیہ السلام نے جو کچھ کیا بجا کیا، یہ واقعہ نہایت تفصیل سے تمام جزئیات کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے حالانکہ کتب تاریخ میں سرے سے اسکا ذکر نہیں، یا مثلاً حضرت علی اکبر کی تیاری جنگ کے وقت حضرت زینب کا آزردہ ہونا اور جانے سے روکنا، یا مثلاً حضرت شہربانو کا حضرت علی اکبر سے اس بات پر ناراض ہونا کہ امام علیہ السلام کو تنہا چھوڑ کر کیوں چلے آئے، ان تمام واقعات کا تاریخ میں پتہ نہیں اس قسم کے واقعات کے بیان کرنے میں **بلاغت** کا پہلا فرض یہ ہے کہ جو واقعہ فرض کیا جائے وہ ایسا ہو کہ وقت اور حالت کے لحاظ سے اسکا واقع ہونا یقینی ہونے کے برابر ہو، اسکے ساتھ واقعہ کے جزئیات اور کیفیات جو بیان کیے جائیں وہ بالکل مقتضائے حال کے موافق ہوں اور اس طرح بیان کیے جائیں کہ واقعہ کی صورت آنکھوں میں پھر جائے۔

اس نکتہ کی حقیقت ایک مثال سے زیادہ تر واضح ہوگی، مرزا دبیر صاحب نے ایک مرثیہ میں یہ واقعہ باندھا ہے کہ جب حضرت علی اکبر جوان ہوے تو جابجا اُن کے حسن و جمال کا شہرہ ہوا، یہانتک کہ بادشاہان وقت نے اپنے اپنے ملک سے مصوّر بھیجے کہ اُن کی تصویر کھینچکر لائیں، حلب کا بادشاہ سب سے زیادہ مشتاق ہوا اور جب تصویر اُس کے پاس پہونچی تو اُس نے فوراً اپنی بیٹی سے حضرت علی اکبر کی نسبت ٹھہرائی اور حضرت امام حسینؑ کے پاس پیغام بھیجا، امام ممدوح نے اپنی

بے اطمینانی کی حالت بیان کی اور اخیر مین لکھا ہے

اکبر کا بیاہ خالق اکبر کے ہاتھ ہے
بابا کے ہاتھ ہر نہ یہ مادر کے ہاتھ ہے

لیکن بادشاہ حلب نے باوجود اس کے نسبت ٹھہرا ہی دی اور شادی کے تمام سامان مہیا کرنے شروع کر دیے۔ ادھر کربلا کا واقعہ پیش آیا جب بادشاہ کو خبر پہونچی تو وہ مع اپنے خاندان کے کربلا پہونچا، بادشاہ کی لڑکی نے جو حضرت علی اکبر سے منسوب تھی اس طرح نوحہ کیا ہے

آئی ہون گھر سے بال پریشان کیے ہوے
دولھا اٹھو کھڑی ہے دولھن سر لیے ہوے

دولھا تمھاری بے وطنی پر نثار مین
دولھا! تمھاری خستہ تنی پر نثار مین

دولھا! تمھاری بے کفنی پر نثار مین
دولھا! تمھاری کم سخنی پر نثار مین

مرنے کا ذکر کرتے ہین سب شور و شین سے
ہے ہے بیان تمھارے کرون کیا مین مین سے

خو بو سے مطلع نہین مین سوختہ جگر
تھی چوڑیان پہنتے نہ پائی مین نوحہ گر

ہے ہے مین اپنے گھر سے نہ آئی تمھارے گھر
جو آج ٹھنڈی کرتی مین صاحب کی لاش پر

حسرت ہی عقد کی رہی لونڈی کے باپ کو
ہے ہے بندھا نہ مہر جو بختون مین آپ کو

دولھا! مین ننگے سر ہون مجھے تم ردا اڑھاؤ
دولھا! مجھے بھی فاطمہ کے پاس لیتے جاؤ

دولھا! کہاں مین بیٹھون ٹھکانا مجھے بتاؤ
دولھا! برابر اپنے مری قبر بھی بناؤ

دولھا مقام شرم ہے ذرہ نہ بکھرنے دو
پردہ دولھن کا رکھ لو کھلے سر نہ پھرنے دو

مرزا صاحب نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ زبانی ایک بڑا نوحہ الگ

لکھ کر مرثیے کے ساتھ بطور ضمیمہ کے شامل کیا ہی جسکا مطلع یہ ہی ؎

	کس عادل و منصف کی مین دون رُد کے دہائی		ہی ہی مرے نوشاہ
	سُنتی ہے دُلھن شکل رنڈاپے نے دکھائی		ہی ہی مرے نوشاہ

یہ تمام قصہ بالکل بلاغت اور مقتضاے حال کے خلاف ہی، تمام باتون سے قطع نظر کرکے، ایک کنواری لڑکی کا بین اور نوحہ کرنا جو خود کہتی ہی کہ مین آپکے عقد مین نہین آئی، اور پھر دولھا دولھا پکارتی جاتی ہی کس قدر بیہنی اور لغو ہی۔

میر انیس نے سیکڑون ہزارون مرثیے لکھے ہین، اور ہر مرثیہ بجاے خود ایک قصہ یا حکایت ہی، لیکن کوئی واقعہ ایسا نہین لکھا جو اقتضاے حال کے خلاف ہو، عون و محمد کی روایت کا سرے سے کہین پتہ نہ تھا، لیکن جب میر انیس نے اس کو مرثیہ مین لکھا تو تمام لوگون کو اس کی واقعیت کا دھوکا ہوا یہانتک کہ اب وہ بطور ایک واقعہ مسلمہ کے تمام مرثیہ گویون کے ہان مختلف پیرایون مین بیان کیا جاتا ہی، اسی طرح میر انیس نے جسقدر واقعات لکھے ہین باوجود رقت انگیز اور موثر ہونے کے واقعیت کے قالب مین اسقدر ڈھلے ہوے ہین کہ کہین سے اُنپر حرف گیری نہین ہوسکتی۔

مرثیون مین جو مضامین قدر مشترک کے طور پر ہین وہ یہ ہین، آمادگی سفر، راہ کی تکلیفات اور صعوبتین، قیام گاہ کا انتظام، دشمنون کی روک ٹوک، معرکہ کی تیاریان، رزم آرائی، رجز، حریفون کا قتال و جدال، دشمنون کی فتح، اہل حرم کی بیکسی اور بیچارگی، شام کا سفر، قیدخانہ، دربار کی حاضری۔

ان مین سے ہر عنوان کے ادا کرنے کے لیے بلاغت کے خاص خاص طریقے ہین مثلاً **سفر کی تیاری** کے بیان کرنے مین بلاغت کا یہ اقتضا ہی کہ سفر کے وقت، جو جو واقعات اور حالات پیش آتے ہین، اُن کی تصویر کھینچی جائے سفر کی آمادگی، سواریون کی تقسیم، زاد سفر کا انتظام، محلون اور کجاوُن کی تیاری، مستورات

کے پردہ کا انتظام، دوست اور احباب کے دداعی جذبات بھائی بہنون اور عزیزون کی گریہ وزاری، دلدہی اور صبر کے کلمات، یہ تمام باتین تفصیل سے بیان کیجائین اور اس طرح کی جائین کہ آنکھون کے سامنے نعینہ سفر کا نقشہ پھر جائے
میر انیس نے جہان جہان سفر کا بیان کیا، ان نکتون کو ملحوظ رکھا ہی؛

دو حریفون کی باہمی معرکہ آرائی کو اس طرح بیان کرنا چاہیے کہ پہلے دونو کے سراپا، ڈیل ڈول، اور اسلحہ جنگ سجنے کا نقشہ دکھایا جائے، پھر بتایا جائے کہ دونون نے فن جنگ کے کیا کیا ہنر دکھائے، حریف نے حریف پر کیونکر حملہ کیا، کس طرح وار بچایا، تلوار کے کیا کیا ہاتھ دکھائے، بند کیونکر باندھے، وغیرہ وغیرہ میر انیس کے ہان یہ تمام باتین پائی جاتی ہین، بخلاف اسکے مرزا دبیر صاحب آسمان و زمین کے قلابے ملا دیتے ہین، لیکن یہ پتہ نہین لگتا کہ دونون حریفون مین سے کسی نے دوسرے پر وار بھی کیا تھا یا نہین،

غرض ہر واقعہ اور ہر معاملہ کے بیان کرنے مین بلاغت کا یہ اقتضا ہے کہ اُس کی تمام خصوصیات، اسطرح دکھائی جائین کہ دلون پر وہی اثر طاری ہو جو خود واقعہ کے پیش آنے سے پڑتا ہے میر انیس کے کلام مین عموماً یہ وصف پایا جاتا ہے ہم نے اس موقع پر مثالین اس لیے قلم انداز کین کہ آگے چل کر واقعہ نگاری اور اظہار جذبات وغیرہ کے عنوانون مین جو مثالین آئین گی وہی بلاغت کے لیے بھی کافی ہون گی،

بلاغت کا ایک بڑا نکتہ یہ ہے کہ واقعات کے بیان مین جس درجہ، رتبہ اور جس سن و سال کے لوگون کا ذکر آئے، اُسی قسم کے طرز خیال اور طریق ادا کو ملحوظ رکھا جائے، بوڑھے، بچے، جوان، مرد، عورت، کنواری، بیوہ، آقا، غلام، نوکر، چاکر، غرض جسکی زبان سے جو خیال ظاہر کیا جائے اُسکی زبان اور طرز خیال کی تمام خصوصیتون

کو قائم رکھا جائے، میر انیس نے تمام مرثیوں میں یہ نکتہ ملحوظ رکھا ہے، مثلاً حضرت امام حسین کے سفر کے وقت محلہ کی بی بیاں حضرت زینب کو سفر سے روکتی ہیں ؎

ہمسایوں کی ہمدردی اور اظہار افسوس کا کیا طریقہ ہے

سب کہتے ہیں زینب کہ اے شاہ کی شیدا
پانی کی کمی، گرمی کے دن خون کا رستہ
کس طرح کے خط آئے یکایک یہ ہوا کیا
وہ دھوپ پہاڑوں کی وہ لوں اور وہ صحرا
کیا سوچ کے اس فصل میں شبیر چلے ہیں
بچوں پہ کرو رحم کہ نازوں کے پلے ہیں

ہے ہے ابھی چھ مہینے کے بھی بچہ کا سفر ہے
غربت میں جوانوں کے تلف ہونیکا ڈر ہے
کچھ تم کو پہاڑوں کی بھی گرمی کی خبر ہے
رحم اس پہ ہے لازم کہ یہ بچہ گل تر ہے
اصغر کو جدا دکھ ہو، قلق ماں کو سوا ہو
گرمی کے سبب دودھ جو گھٹ جائے تو کیا ہو

ایک اور موقع پر اسی مضمون کو ادا کیا ہے۔

عورتیں کیونکر صلاح دیتی ہیں

ہم لے کے بلائیں یہی سب کرتی ہیں تقریر
سمجھاتی نہیں بھائی کو اے شاہ کی ہمشیر
اس گرمی کے موسم میں کہاں جاتے ہیں شبیر
مسلم کا خط آئے تو کریں کوچ کی تدبیر
للّٰہ ابھی قبر پیمبر کو نہ چھوڑیں
گھر فاطمہ زہرا کا ہے اس گھر کو نہ چھوڑیں

یا مثلاً جب حضرت امام حسینؑ اپنی چھوٹی صاحبزادی صغریٰ کو سفر میں لیجانے سے انکار کرتے ہیں تو وہ حضرت زینب سے سفارش کراتی ہیں ؎

بچوں بچگی ادا سے مدعا کا طرز

صغریٰ نے کہا آپکی باتوں کے میں قربان
بیٹی ہو علی کی مری مشکل کرو آسان
تم جان بچا لو کہ میں لونڈی ہوں پھوپی جان
جیتی رہی صغرا تو نہ بھولیگی یہ احسان
کچھ بات بجز گریہ و زاری نہیں کرتیں
اماں تو سفارش بھی ہماری نہیں کرتیں

دوسروں کی محبت کا طعنہ

بیاری ہیں جو دو بیٹیاں وہ جائینگی ہمراہ
بابا کو نہ اماں کو نہ بہنوں کو مری چاہ
کیا اُنس کہ میں گور کنارے بھی تو ہوں آہ
سب جیتے رہیں خیر ہمارا بھی ہے اللہ

بھولے سے نہ اب خاطر ناشاد کریں گے
میں قبر میں جب ہوں گی تو سب یاد کریں گے

خاص عزیزوں کی شکایت

عاشق مرے شبو ہیں بھیا کے میں پیاری
قاسم کو غرض کیا جو سُنیں گریہ و زاری
دو دن سے خبر بھی نہیں لی آکے ہماری
میں کون ہوں؟ سکینہ ہیں چچا جان کو پیاری

اللہ تو ہے گر کوئی غمخوار نہیں ہے
مٹی مری کچھ قبر کو دشوار نہیں ہے

یا مثلاً حضرت علی اصغر کے پیاس سے جاں بلب ہونے کے وقت، ان کی
ماں کی حالت اس طرح بیان کی ہے

چلاتی تھی بکھرائے ہوئے بالوں کو مادر
فریاد ہے اے لخت دل ساقی کوثر
دولت مری لُٹتی ہے اُجڑتا ہے مرا گھر
آنکھیں بھی جھپکتی نہیں اب تو علی اصغر

کیا ہوگیا اس صاحب اقبال کو میرے
ہے ہے لیے جاتی ہے اجل لال کو میرے

یا مثلاً حضرت امام حسین کی رخصت کے وقت، شہر بانو فرماتی ہیں

کچھ حق میں اس کنیز کے فرما کے جائیے
صاحب اِسی جگہ مجھے بُھلا کے جائیے

یا مثلاً جب حضرت امام حسین کربلا میں پہونچے اور وہاں اُترنے کا ارادہ کیا، تو
حضرت زینب اس مقام کی وحشت اور ویرانی سے گھبرا کر فرماتی ہیں

کیوں چلتے چلتے آپ نے باں روک لی لگام
بھیا اِدھر تو آؤ یہ ہے کون سا مقام؟

بستی بھی ہے کوئی کہیں ایک نہر ہے
اس دشت پر خطر میں اُترنا تو قہر ہے

جنگل میں ہر بشر کے لیے سو طرح کا ڈر — اُٹھتے ہیں بار بار بگولے اِدھر اُدھر
دن کٹ گیا تو ہوئے گی شب کس طرح بسر — لشکر میں غل رہیگا درندوں کا رات بھر
بچے بھی مارے ہول کے تر ہیں پسینے میں
میرا تو دل ابھی سے اُچھلتا ہے سینے میں

اسی واقعہ کو ایک اور موقع پر لکھا ہے ـــــ

بھائی سے اس زمین کی سُنی ہے بہت صفت — ہے وہ امام واقفِ اسرارِ شش جہت
جو جو ستم ہیں ان سے بھی لازم ہے مشورت — صدقے گئی حبیب سے بھی کر لو مصلحت
ساحل پہ دشمنوں میں کسی کا عمل نہ ہو
بھیّا مجھے یہ ڈر ہے کہ رد و بدل نہ ہو

یا مثلاً جب امام حسینؑ نے حضرت عباس کو علم دیا ہے تو حضرت زینبؑ عباسؑ کو مبارکباد دیتے ہوئے فرماتی ہیں ـــــ

گھر میں سلامت آئینگے جب سرورِ امم — تب دوں گی تم کو تہنیتِ عہدۂ علم
ہاتھوں کو جوڑتی ہے یہ بھیّا اسیرِ غم — کیجو صلاح صلح، کہ لشکر ادھر ہے کم
تم سے بڑی امید ہے زہرا کی جائی کو
بھیّا تمھیں سے لیگی بہن اپنے بھائی کو

اسی موقع پر سکینہ مبارکباد کو آتی ہیں، تو اُن کے صغرسن کے لحاظ سے اُن کی مبارکباد دینے کو کس پیرایہ میں ادا کیا ہے ـــــ

اتنے میں پاس آکے سکینہ نے یہ کہا — چہرہ کی لوں بلائیں میں صدقے جھکو ذرا
عہدہ علم کا، تم کو مبارک ہو اے چچا — میں نے دعائیں کی ہیں کہو مجکو دوگے کیا
میدان کا رُخ کروگے کہ دریا پہ جاؤگے
کیا اب بھی تم نہ پیاس ہماری بجھاؤگے

"مجھکو ذرا" کی بلاغت پر لحاظ کرو، اور دعا کے صلہ مانگنے کو دیکھو۔
ایک اور موقع پر لکھتے ہیں۔

چلاتی ہے سکینہ کہ تجھے مرے چچا، محمل میں گھٹ گئی مجھے گودی میں لو ذرا
بابا سے کہہ دو اب کہیں خیمہ کریں بپا ٹھنڈی ہوا میں لیکے چلو تم پہ میں فدا
سایہ کسی جگہ ہے نہ چشمہ نہ آب ہے
تم تو ہوا میں ہو مری حالت خراب ہے

بچوّں کی بول چال سے قطع نظر، یہ دیکھو کہ بچوّں کی فطرت کو کس نکتہ سنجی سے ظاہر کیا ہی بچوّں کی مدعا طلبی کا بڑا آلہ طعن اور تعریض ہی، اس کو کس خوبی سے ادا کیا ہے

ع تم تو ہوا میں ہو، مری حالت خراب ہی،

ایک اور موقع پر جب حضرت عباسؓ لڑنے کے لیے چلے ہیں اور سب لوگ تن بہ تقدیر ان کو رخصت کر چکے ہیں، تو حضرت سکینہ کو خبر ہوئی ہی وہ گھبرا کر روکنے کے لیے آتی ہیں، اور بچپن کے ناز سے کہتی ہیں۔

خیمہ میں ہوا غل کہ چلے حضرت عباسؓ سب بولے کہ لو اوٹھ بھی سرور کے بھی پاس
گھبرا کے سکینہ نے کہا تب یہ بصد یاس کیا کہتے ہو تم، مجھکو تو جانے دو چچا پاس
منہ شہ سے وہ موڑینگے نہ مانوں گی کبھی میں
عمو مجھے چھوڑینگے نہ مانوں گی کبھی میں

عباسؓ پکارے میں اس آواز کے قربان ہم جاتے ہیں پانی کے لیے آ مری جان
دامن سے لپٹ کر یہ لگی کہنے وہ نادان گھر سے تمھیں جانے نہ دونگی کسی عنوان
بابا کا مرے کوئی مددگار نہیں ہے
صدقے گئی، پانی مجھے درکار نہیں ہی

یا مثلاً جب حضرت عباسؓ کے شہید ہونے کی خبر آئی ہی، اور لوگ جڑاس مع رہے ہیں

حضرت عباس کی زوجہ نے یہ خبر نہین سُنی ہی لیکن قرینون سے اُن کو شبہ ہوتا ہی، اُن کے بدحواسانہ استفسار کو یون ادا کیا ہی ؎

کہتی تھی یہ گھبرائی ہوئی زوجۂ عباس ۔۔۔ کیون بی بیو! بچے مری کیا ہو گئی بے آس
کیا کہتے ہین شاہ شہدا؟ کس سے ہوئی یاس ۔۔۔ اے وائے مقدر نہ سکینہ کی بجھی پیاس
کیسی خبر آئی ہی کہ جی کھوتے ہو لوگو
تم سب مرا منھ دیکھ کے کیون روتے ہو لوگو

اس مصرعہ مین ع اے وائے مقدر نہ سکینہ کی بجھی پیاس انتہائی ایثار نفس کا خیال ظاہر کیا ہی، یعنی اپنے شوہر کے مرنے کا غم اپنی مصیبت کے لحاظ سے نہین بلکہ اس وجہ سے ہی کہ وہ سکینہ کے لیے پانی نہ لا سکے اور انکی پیاس بجھا سکے۔

یا مثلاً جب حضرت علی اکبر نے مان سے اجازت لیکر میدان جنگ مین جانیکا ارادہ کیا ہی اور حضرت امام حسین علیہ السلام نے فرمایا کہ پھوپی سے بھی تو اجازت لو اُس وقت حضرت زینب فرماتی ہین ؎

زینب نے کہا جبکہ رضائے شہ عالی ۔۔۔ مین نے تو کوئی بات نہین منھ سے نکالی
کیا غم ہی نہ پوچھا مجھے مان سے تو رضا لی ۔۔۔ مالک ہین وہی مین تو ہون اک چاہنے والی
صدقے گئے فرزند پھوپی سوگ نشین ہے
سمجھین تو مرا حق ہے نہ سمجھین تو نہین ہے

بچپن مین پلا ہے کہ مری چھاتی پہ سوئے ۔۔۔ اک جاگتی مین تا صبح جو یہ چونک کے روئے
کنگھی نہین کی گیسوئے مشکین نہین دھوئے ۔۔۔ ان کے لیے کب مین نے بسر ہاتھ سے کھوئے
کیون ڈرتے ہین یہ بس لیے حضرت کو قلق ہی
حق دار مین کاہے کو مرا کون سا حق ہے

حضرت علی اکبر کو، حضرت زینب ہی نے پالا تھا، اور وہ اُن کو اپنے بچون سے زیادہ

عزیز رکھتی تھین، حضرت علی اکبر بھی، ہر بات مین اُنہی کا مُنھ دیکھتے رہتے تھے، چونکہ اُن کو معلوم تھا کہ حضرت زینب میدان جنگ مین جانے کی اجازت بڑی مشکل سے دین گی اس لیے اُنھون نے پہلے اپنے ماں باپ سے اجازت لی ہے کہ اور لوگ اجازت دین تو حضرت زینب سے درخواست کرنے کے لیے سند ہاتھ آئے، اتنے مین حضرت امام حسین علیہ السلام نے فرمایا کہ پھوپی سے بھی تو اجازت لو، وہ بھری ہوئی بیٹھی تھین، اُن کی طعن آمیز تقریر کو کس خوبی سے ادا کیا ہے۔

یا مثلاً جب یزید کی بیوی ہندہ نے قیدخانہ مین اہل حرم کے دیکھنے کے لیے جانا چاہا ہے، تو لونڈیون اور پیش خدمتون کی تقریر کو اس طرح ادا کیا ہے

سب عورتون کو لیکے چلی جب وہ حق شناس کپڑے یہ بھگے ہین بدل ڈالیے لباس	کہنے لگین یہ تب جو کنیزین تھین آس پاس اُس نے کہا کہ ہے مرے دل پر ہجوم یاس

اک دم مین سوگوارون کو مین دیکھ آتی ہون
کیسا لباس، کیا کسی شادی مین جاتی ہون

جب وہ قیدخانہ کے دروازہ پر پہونچی ہے تو

بڑھ کر کسی کنیز نے تب یہ کیا بیان چلیے محل مین آپ بھلا جائینگی کہان	بی بی! کوئی اس گھر مین زندہ نہین ہے ہان قابل نہین حضور کے جانے کے یہ مکان

گر غش ہوئی تو آپ مین آیا نہ جائے گا
ہم سے تو اس خرابہ مین جایا نہ جائے گا

لونڈیان، ہندہ کو قیدخانہ مین جانے سے روکنا چاہتی ہین اس غرض کے حاصل کرنے کے لیے پہلے تو یہ کہا کہ یہان کوئی زندہ نہین، پھر یہ کہ یہ مکان آپکے جانے کے قابل نہین، پھر اس مین مبالغہ کا یہ اسلوب کہ آپ کو اختیار ہے لیکن ع ہم سے تو اس خرابہ مین جایا نہ جائے گا،

اسی مضمون کو ایک اور مرثیہ مین اس طرح باندھا ہی کہ دربانون نے اس خیال سے کہ قید خانہ مین امام زین العابدین بھی ہین اور وہ غیر محرم ہین اہل حرم کی طرف مخاطب ہوکر کہا ہی ؎

یا ہم آکر کسی حجرہ مین جُدا بند کرین		یا تو بیمار کی آنکھین اُسیر بند کرین

غور کرو لونڈیون اور پیش خدمتون کی خوشامدانہ فطرت کا کس طرح اظہار کیا ہی اور دربانون کی تحقیرانہ فرمایش کس قدر دلدوز ہی کہ یا تو زین العابدین کی آنکھین بند کردو، یا ہم آکر کسی حجرہ مین اُن کو بند کردین۔

یا مثلاً جب حُر نے اپنے بھائی، بیٹے اور غلام سے مشورہ کیا ہی کہ کسکا ساتھ دینا چاہیے، تو اُنھون نے یون جواب دیا ہی ؎

آنکھون سے چلین گے کہ یہ ہی عین عبادت		بیٹے نے کہا، شہ کی غلامی ہی سعادت
کچھ ڈر نہیں، بس آج سے کی ترک رفاقت		بھائی نے کہا کفر ہے حاکم کی اطاعت

مظلوم سے، دور وزکے پیاسے سے لڑین ہم
کیا خوب! محمد کے نواسے سے لڑین ہم

گر لاکھون جاین تو نثار سر شبیر		عبد حُر غازی نے کہا تول کے شمشیر
کہیے تو کرون اُسکے مٹا دینے کی تدبیر		دنیا مین نہو گا عمر وسعد سا بے پیر

حافظ ہی خدا، زور سے تلوار کے چلیے
اس فوج مین چلیے تو اُسے مار کے چلیے

دیکھو بھائی اور بیٹے نے جو کہا اور جو ارادہ کیا، اُن کو اجازت طلبی کی ضرورت نہین، بخلاف اسکے غلام کہتا ہی کہ ع کہیے تو کرون اس کے مٹا دینے کی تدبیر یہ وہی غلامانہ انداز گفتگو ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ اس فعل کو بھی اپنی طرف منسوب نہین کرتا، بلکہ کہتا ہی ع اس فوج مین چلیے تو اُسے مار کے چلیے،

یا مثلاً جب حضرت عباسؑ میدان جنگ کو جا رہے ہین تو ان کی زوجہ حضرت شہربانو سے کہتی ہین، ؎

کہتی ہی رو کے بانوے عالم سے بار بار	ہم کو تباہ کرتے ہین عباس نامدار
ہی لونڈیون کے باب مین بی بی کو اختیار	کچھ آپ بولتی نہین اسوقت ہین نثار

کیسے جو روکنے کی کوئی ان کے راہ ہو
اب عنقریب ہی کہ مرا گھر تباہ ہو

اسی طرح کہتے کہتے آخر مین کہتی ہین ع بی بی مین کیا کرون مری بچی صغیر ہین دیکھو بیقراری کی معذرت مین کسقدر حسرت بھری ہوئی ہی حضرت عباسؑ نے زوجہ کی یہ حالت دیکھی تو اُن کو روکا ؎

عباس دیکھتے ہین جو زوجہ کا اضطرار	ہوتا ہی تیر غم جگر ناتوان کے پار
روتے ہین خود، مگر یہ اشارہ ہی بار بار	شوہر کے غم مین یون کوئی ہوتا ہی بیقرار

آؤ ادب سے دلبر زہرا کے سامنے
روتی ہین لونڈیان کہین آقا کے سامنے

یا مثلاً جب حضرت عباسؑ، حضرت امام حسینؑ کے اصرار اور امتثال امر کی بنا پر دریا سے ہٹ آئے تو حضرت عباسؑ کی شجاعانہ حسرت کو اسطرح ادا کیا ہی۔

کہتے تھے راہ مین کہ نہ زور اپنا چل گیا
افسوس ہی کہ ہاتھ سے دریا نکل گیا

یا مثلاً حضرت عباسؑ نے جب حضرت امام حسینؑ سے خیمہ نصب کرنے کے متعلق دریافت کیا ہی تو ؎

کچھ سوچ کر امام دو عالم نے یہ کہا	زینب جہان کہین وہین خیمہ کرو بپا
پیچھے ہٹا یہ سنتے ہی عباس باوفا	جا کر قریب محمل زینب یہ دی صدا

حاضر ہے جان نثار امام غیور کا
برپا کہاں ہو خیمۂ اقدس حضور کا؟

یا مثلاً حضرت زینب نے حضرت علی اکبر کو حضرت عباس کے بلانے کے لیے بھیجا ہو تو وہ جا کر مؤدبانہ طریقہ سے حضرت عباس سے کہتے ہیں ع چلیے پھوپھی نے یاد کیا ہے حضور کو

یا مثلاً جب یہ بحث پیدا ہوئی ہے کہ فوج کا علم کس کو دیا جائے تو حضرت عباس کی بیوی اپنے شوہر کا استحقاق اسطرح سے بیان کرتی ہیں ؎

خادم شہ دین کے ہیں تو عباس علی ہیں
اس عہدے کے لائق جو اگر ہیں تو وہی ہیں

"جو اگر" غلط ترکیب ہے لیکن مستورات کی زبان کی بعینہ نقل کر دینے سے وہ بات پیدا کر دی ہے جو صحیح لفظ سے پیدا نہیں ہو سکتی تھی،

اس قسم کی صدہا مثالیں ہیں،

بلاغت کا ایک نازک موقع وہاں پیش آتا ہے جہاں حریف مخالف کا ذکر کرنا ہوتا ہے، دشمن کو اگر حقیر اور ذلیل ثابت کیا جائے تو اسکے مقابلہ میں فتحمندی کا مرتبہ گھٹ جاتا ہے، اور شان و شوکت دکھائی جائے تو مذہبی خیال کے خلاف ہوتا ہے ایسے مشکل موقع پر میر صاحب جسطرح ان دونوں مشکلوں سے عہدہ برآ ہوتے ہیں اور مدح و ذم کو پہلو بہ پہلو رکھتے ہیں، اُس کا اندازہ ذیل کی مثالوں سے ہوگا ؎

بالا قد و کلفت، و تنومند و خیرہ سر
ناوک پیام مرگ کے ترکش اجل کا گھر

رو میں تن و سیاہ درون، آہنی کمر
تیغیں ہزار ٹوٹ گئیں جس پہ وہ سپر

دل میں بدی طبیعت بد میں بگاڑ تھا
گھوڑے پہ تھا شقی کہ ہوا پر پہاڑ تھا

ساتھ اُسکے اور اُسی قد و قامت کا ایک یل
بدکار و بدشعار و ستمگار و پُر دغل

آنکھیں کبود رنگ سیہ ابروؤں پہ بل
جنگ آزما بھگائے ہوئے لشکروں کے دل

سجاد تنبیہ
چھوٹا بھائی
کس ادب سے
بڑی بہن سے
خطاب کرتا ہے

بھالے لیے، کسے ہوے کمر بن ستیز پر
نازاں وہ حرب گرز پہ، یہ تیغ تیز پر

ایک اور موقع پر لکھتے ہیں ؎

نکلا یہ سُن کے غیظ میں اک پہلوان ردم
گیتی کے چار دانگ میں تھی جس شقی کی دھوم
سرہنگ، پُرغرور، سیہ قلب، و نحس و شوم
لنگر سے جسکے ہل گئی مقتل کی مرز بوم
مرحب تھا کفر و شرک میں طاقت میں گیو تھا
گھوڑے پہ تھا شقی کہ پہاڑی پہ دیو تھا

چہرہ مہیب غیظ سے آنکھیں لہو کی جام
تھرائے سام خوف سے کاندھے پہ وہ حسام
موذی، سیاہ بخت، سیہ دل، سیاہ فام
کھاتا تھا لاکھ بل جو کوئی لے علی کا نام
کندہ سقر کے قعر کا، پتلا گناہ کا
دشمن تھا خاندان رسالت پناہ کا

ٹکڑے کرے پہاڑ کو وہ گرز گاؤسر
پہنے ہوے زرہ پہ زرہ، بر میں بد گہر
زنجیر آہنی سے کسے جنگ پر کمر
منھ پھیرے جس سے تیغ وہ فولاد کی سپر
دستانے دونوں دست تعدی پسند پر
پاکھر بھی آہنی تھی شقی کے سمند پر

ایک اور موقع پر ؎

نکلا ادھر سے بہر وغا ایک روسیاہ
زور آور و تہمتن و مغرور و کینہ خواہ
کاندھے پہ گرز، بر میں زرہ، خشمگیں نگاہ
سر پر مثال قبضۂ تیغ آہنی کلاہ
آمد شقی کی تھی کہ رواں رود نیل تھا
ہیبت میں تھا جو دیو، تو ہیکل میں پیل تھا

واقعات کے بیان میں، بلاغت کا ایک بڑا ضروری اصول یہ ہے کہ کہیں سے

سلسلۂ بیان ٹوٹنے نہ پائے، جب کوئی واقعہ مختلف اور متعدد واقعات پر مشتمل ہوتا ہے تو ایک واقعہ سے دوسرے واقعہ کی طرف منتقل ہوتے ہوئے اکثر بیان کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے یا زائد اور بھرتی کے لفظ لانے پڑتے ہین جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ زبردستی ایک واقعہ کا دوسرے سے پیوند لگایا ہے، مرزا دبیر صاحب کے کلام مین اس کی مثالین کثرت سے ملتی ہین، میر انیس کے اکثر مرثیے، بہت سے متعدد واقعات پر مشتمل ہوتے ہین، یہانتک کہ اگر اُن پر الگ الگ نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ ہر واقعہ ایک جداگانہ مرثیہ کا موضوع ہے لیکن تسلسل بیان کا یہ اثر ہے کہ تمام مختلف واقعات ایک مسلسل زنجیر بن جاتے ہین جسکی تمام کڑیان آپس مین ملی ہوئی نظر آتی ہین،

مثلاً حُر کا ایک مرثیہ لکھا ہے، اسمین حسب ذیل مضامین بیان کیے ہین:-

حُر کی مدح وصفت۔ امام علیہ السّلام اور اہلبیت کا میدان جنگ مین آنا دونون طرف کی تیاریان۔ حضرت امام حسین علیہ السّلام کا وعظ اور اتمام حجت کی تقریر۔ عمرو بن سعد کا حر کی طرف مخاطب ہونا اور دونون کے سوال وجواب۔ حر کا امام حسین کی طرف رُخ کرنا۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کا بزرگانہ استقبال۔ حُر کی عذرخواہی اور امام حسین علیہ السلام کا عفو وکرم۔ حر کا جنگ کے لیے اجازت طلب ہونا۔ میدان جنگ مین جانا اور شہید ہونا۔ مرنے کے وقت حضرت امام حسینؑ کا حُر کے پاس پہنچنا اور نزع کی گفتگو۔

یہ مرثیہ بہت بڑا ہے اور ہر واقعہ کو نہایت طول دیکر لکھا ہے۔ اس لیے پورا مرثیہ اس موقع پر نقل نہیں کیا جاسکتا، ہم صرف ان موقعون کے اشعار نقل کرتے ہین جہان جہان ایک واقعہ سے دوسرے واقعہ کی طرف انتقال کیا ہے۔

مرثیہ حُر کی تعریف سے شروع ہوتا ہے۔ تعریف کرتے کرتے لڑائی کا ذکر کرتے ہین اسے

وصفِ حُر مین ہے زبان معترفِ عجز و قصور
آمد آمد کی بہادر کا کرون اب مذکور
جب ہوئی مستعدِ جنگ سپاہِ مقہور
مہرِ افلاکِ امامت نے کیا رن مین ظہور

غل ہوا جنگ کو اللہ کے پیارے نکلے
اے فلک دیکھ زمین پر بھی ستارے نکلے

ہو گئے سُرخ شجاعت سے رُخِ آلِ نبی
آئی ٹھنڈی جو ہوا بھول گئے تشنہ لبی
رن مین گرجا کا ہوا بجنے لگے باجے عربی
یکہ تازون نے کیا شورِ مبارز طلبی

اک گھٹا چھا گئی ڈھالون سے سیہ کارون کی
برق ہر صف مین چمکنے لگی تلوارون کی

برچھیان تول کے ہر غول سے اسوار بڑھے
نیزے ہاتھون مین سنبھالے ہوئے خونخوار بڑھے
تیر جوڑے ہوئے چلّون مین کماندار بڑھے
بولے شہ بان سے ابھی کوئی نہ زنہار بڑھے
(یہان سے امام حسین کا وعظ و نصیحت اکیس بند تک ہے)

اسدِ حق کے گھرانے کا یہ دستور نہین
مین نبی زادہ ہون سبقت مجھے منظور نہین

یہ سخن سُن کے مخاطب جو ہوا اعدا سے امام
اے سپاہِ عرب و مصر و رے و کوفہ و شام
تم پہ کرتا ہے حسینؑ آخری حجت کو تمام
پسرِ مصحفِ ناطق ہون سنو میرے کلام

سخنِ حق کی طرف کانون کو مصروف کرو
شور باجون کا مناسب ہو تو موقوف کرو

امام حسینؑ کا وعظ نہایت تفصیل سے لکھا ہے اسکے بعد عمرو بن سعد اور حُر کی مخاصمانہ گفتگو اور سوال و جواب کا بیان کرنا تھا اُس کے لیے ربطِ کلام کا یہ طریقہ نکالا کہ حضرت امام حسینؑ کے وعظ سے تمام فوج متاثر ہوئی یہانتک کہ عمرو بن سعد نے حُر کی طرف (ایک افسر فوج کی حیثیت سے) دیکھا کہ یہ کیا رنگ ہے اُس نے کہا امام بالکل سچ کہتے ہین اسطرح دونون مین تکرار اور ردوکد کا سلسلہ شروع ہوا اس موقع کے اشعار یہ ہین

شہ کی مظلومی پہ گریاں ہوئی ظالم کی سپاہ
عمرو سعد نے کی مڑ کے رُخِ حر پہ نگاہ
بولا وہ اشہد باللہ بجا کہتے ہیں شاہ
محسن و منعم و آقا ہیں مرے وہ ذیجاہ
اُن کے احسان کا کیونکر کوئی منکر ہو جائے
سخنِ حق میں جو شک لائے وہ کافر ہو جائے

دونوں میں دیر تک رد و قدح ہوتی رہی۔ اب اس واقعہ کے بیان کرنے کا موقع آیا کہ حُر نے امام حسین کی طرف رُخ کیا اور ان سے جا کر ملگیا، اس کو یوں ادا کیا کہ عمرو بن سعد حُر سے کہتا ہے کہ خبردار! اگر تو نے اُدھر جانے کا قصد کیا تو پرچہ نویس یزید کو خبر کر دیں گے اور تیری جان پر آفت آ جائے گی، حُر جواب دیتا ہے ؎

عقل حُر سے بہکا نہ مجھے اے ابلیس
وہی کونین کا مالک ہے وہی کل کا رئیس
کیا مجھے دیگا سزا حاکمِ ملعون و خسیس
کچھ تردد نہیں کہہ دے کہ لکھیں پرچہ نویس
ہاں سوئے ابنِ شہنشاہِ عرب جاتا ہوں
اے ستمگر جو سمجھتا تھا تو اب جاتا ہوں

کہہ کے یہ ڈاب سے غازی نے نکالی تلوار
سُرخ آنکھیں ہوئیں ابرو پہ بل آیا یکبار
تن کے دیکھا طرفِ فوجِ امامِ ابرار
پانوں رکھنے لگا تن تن کے زمیں پر رہوار
غل ہوا سیّدِ والا کا ولی جاتا ہے
لو طرفدارِ حسین ابن علی جاتا ہے

کیا دو تین رسالوں نے تعاقب ہرچند
کہتے تھے ہاتھ میں وہ لیکے جو دوڑے تھے کمند
حُر کا ہاتھ آنا تو کیسا نہ ملی گردِ سمند
یہ فرس تھا کہ چھلاوہ یہ پری تھا کہ پرند
کیا سُبک سوئے چمن بادِ بہاری پہونچی
ہم یہیں رہ گئے واں حُر کی سواری پہونچی

حضرت امام حسین نے عباس علمدار کو حُر کے استقبال کو بھیجا، اُسکی تقریب

یون پیدا کی ہی ؎

ہان ہوے علم امامت سی شہ دین آگاہ
سیرے لشکر کی طرف ہی رُخِ حُر ذیجاہ

ہنسکے عباس سی فرمایا کہ لے غیرت ماہ
سب سے کہدو کہ نہ روکے کوئی اُس شخص کی راہ

جاؤ لینے کو عجب رتبہ شناس آتا ہے
میرا مہمان، مرا عاشق مرے پاس آتا ہے

اسکے بعد حُر کی معذرت خواہی حضرت امام حسینؑ کا عفو پھر حُر کی طلبی اذنِ جنگ کو نہایت خوبی اور پُر اثر طریقہ سے ادا کیا ہی پورا مرثیہ پڑھو، اور جہان جہان ایک واقعہ کے بعد، دوسرا واقعہ شروع ہوتا ہی، ان پر غور سے نظر ڈالتے جاؤ تو معلوم ہوگا کہ سلسلۂ تقریر کے زور سے مختلف واقعات کو کس خوبصورتی سی ایک لڑی مین پرو دیا ہی

بلاغت کی جزئیات بلاغت کے جزئی اسالیب نہایت مختلف الصورۃ ہین اور چونکہ ہر جگہ ایک نئی صورت پیدا ہوتی ہی اس لیے اُن کی کلیات مشکل سے قائم ہوسکتے ہین، چند مثالون سے اس کا اندازہ ہوسکے گا :

مثال ۱ ، جب امام حسین علیہ السلام کے تمام عزیز واقارب دفعتا شہید ہوچکے ہین تو اتفاق سے ایک راہرو کا اُدھر گذر ہوا، وہ یہ عبرت انگیز موقع دیکھکر ٹھہر گیا اور امام علیہ السلام سے واقعہ کی کیفیت پوچھنی شروع کی، آپنے اپنی مظلومی اور دشمنون کی بے رحمی کی داستان سنائی۔ لیکن اپنا نام نہ بتایا۔ وہ آپکا صورت شناس نہ تھا لیکن قرائن سی اُس کو اشتباہ ہوتا تھا کہ آپ خاندان نبوت سی تعلق رکھتے ہین بالآخر اُس نے کہا کہ ع اظہارِ اسمِ قدس و اعلیٰ مین کیا ہی باک: آپ نے جو کچھ اور جسطرح جواب دیا اس کو اس طرح ادا کیا ہی ؎

یہ تو نہین کہا کہ شہ مشرقین ہون
مولا نے سر جھکا کے کہا مین حسینؑ ہون

اس شعر مین بلاغت کے جو نکتے ہین صرف مذاق صحیح اُن کا احاطہ کرسکتا ہے

تاہم جس حد تک بیان میں آسکتا ہے ہم بیان کرتے ہیں،

موقع کی حالت یہ ہے کہ حضرت امام حسین اپنا نام اس حیثیت کے ساتھ بتائیں جس سے کسی قدر شرف و فضیلت کا اظہار ہو تا کہ پوچھنے والا سمجھ سکے کہ یہی امام حسین ہیں جن کا وہ غائبانہ دلدادہ اور مشتاق ہے، لیکن امام ممدوح کو خاکساری مانع آتی ہے، وہ اُس پر اکتفا کرتے ہیں کہ میں حسین ہوں، لیکن چونکہ مستفسر قرائن سے اس حد تک پہونچ چکا ہے کہ محض نام لینے سے بھی غالباً پہچان لے گا، اور اس لیے حسین کہنا بھی گویا اپنے آپ کو امام کہنا ہے، اس بنا پر نام لینا بھی ایک طرح پر شرف اور فضیلت کا اظہار ہے، اس لیے خالی نام لیتے ہوے بھی آپ شرما جاتے ہیں اور شرم سے آپ کی گردن جھک جاتی ہے، اس بنا پر شاعر کہتا ہے کہ ع مولا نے سر جھکا کے کہا میں حسین ہوں، لیکن شاعر کو جو کہ امام حسین علیہ السلام کی عظمت کے اثر سے لبریز ہے، گوارا نہیں ہوتا کہ آپ کا نام اس سادگی سے لیا جائے اس کے نزدیک امام حسین علیہ السلام اگر اپنے آپ کو بادشاہ مشرقین کہتے تو یہ کچھ خودستائی نہ تھی، بلکہ محض ایک واقعہ تھا، جس طرح رسول اللہ اپنے آپ کو رسول اللہ کہتے تھے؛ اور یہ خودستائی نہیں خیال کیجاتی تھی، شاعر کے لیے حسرت ہے کہ کاش امام نے بیان واقعہ ہی کیا ہوتا، اس کو وہ اسطرح ادا کرتا ہے ع یہ تو نہیں کہا کہ شہ مشرقین ہوں، تاہم اس سے یہ خیال بھی ظاہر ہوتا ہے کہ امام علیہ السلام کی عالی ظرفی اور شرافت نفس کا یہی اقتضا تھا کہ وہ خاکساری کو بیان واقعہ پر مقدم رکھتے،

اس موقع پر یہ کہے بغیر رہا نہیں جاتا کہ اسی واقعہ کو مرزا دبیر صاحب نے اس طرح باندھا ہے ع فرمایا میں حسین علیہ السلام ہوں،

میر انیس اور مرزا دبیر کے موازنہ کی جو بحث ہے، اُس کے فیصلہ کے لیے دونوں کے صرف یہ دونوں مصرعے کافی ہیں،

مثال ۲، میدان کربلا میں امام علیہ السلام یزیدیوں سے پہلے پہنچے تھے اور نہر فرات کے قریب اُترے تھے، یزید کی فوج پہونچی تو اُس فوج نے امام علیہ السلام کی فوج کو وہاں سے ہٹا دینا چاہا اور کہا۔ کہ ؎

ہم گھاٹ روکنے کے لیے آئے ہیں ادھر	ہے آج شب کو داخلۂ حشر کی خبر

اُن کی آمادگی اور شرارت دیکھ کر امام علیہ السلام کے رفقا برہم ہوئے، اس موقع کی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں، ؎

بگڑے ابو ثمامہ و سعدِ فلک سریر	تولی زہیر قین نے شمشیر بے نظیر
جوڑا کمان میں ابن مظاہر نے ایک تیر	بولے اسد کہ زجر کے قابل ہیں یہ شریر

عابس کو غیظ شکر بدخو پہ آگیا
غصہ سے بل ہلال کے ابرو پہ آگیا

اُلٹی جناب قاسمِ ذیشان نے آستیں	قبضہ پہ ہاتھ رکھکے بڑھے اکبر حسیں
بولے بگڑکے بیچے زینب کے مہ جبیں	شیر دن سے کیا تراٸی کو لے لینگے اہل کیں

ابو ثمامہ، سعد، زہیر قین۔ اسد۔ عابس۔ حضرت امام حسینؑ کے رفقا میں سے تھے حضرت قاسم بھتیجے، حضرت علی اکبر صاحبزادے اور حضرت زینب کے صاحبزادے آپ کے بھانجے تھے، اس موقع پر بلاغت یہ ہے کہ جن لوگوں کو جسقدر امام علیہ السلام سے قرب تھا، اُسی نسبت سے اُن کی طیش و آمادگی جنگ کی حالت دکھائی ہے ابو ثمامہ اور سعد بگڑ کر رہ گئے، اسد نے کہا کہ یہ زجر کے قابل ہیں عابس کو غصہ آگیا، ہلال کے ابرو پر بل پڑگئے، زہیر قین نے تلوار تول لی۔ حضرت قاسم نے آستین اُلٹی حضرت علی اکبر تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھ کے آگے بڑھے، زینب کے صاحبزادوں نے تیغے سنبھال لیے، اس فرق مراتب کو اس خوبی سے ادا کیا ہے کہ واقعہ کی تصویر کھینچدی ہے،

مثال ۳، جب تمام اعزہ اور احباب شہید ہو چکے، اور حضرت علی اکبر کا دم

باقی رہ گیا، تو دشمنوں نے چاہا کہ امام حسین علیہ السلام اُن کو بھی میدان جنگ میں بھیجیں تاکہ بیٹا باپ کی آنکھوں کے سامنے خاک و خون میں ملا دیا جائے اس غرض سے اُنھوں نے اس طرح امام حسین علیہ السلام کو مخاطب کیا، ـــ

اعدا پکارتے تھے کہ یا شاہ دین پناہ
عباس سا تو اب کوئی ہوگا نہ خیر خواہ
باقی ہے اور کوئی کہ بس ہو چکی سپاہ
بھیجو کسی کو جلد کہ ہم دیکھتے ہیں راہ
اُجڑنے دو گُل پسر کو شہادت کے باغ سے
کب تک بچایئے گا کلیجہ کو داغ سے

دنیا سے کوچ کر گئے عباس نامدار
حضرت کا صبر و شکر ہے عالم پہ آشکار
اب بے چراغ ہے لحد شیر کردگار
مثل خلیل بھیجئے فرزند کو نثار
آہیں نہ بھریے پیٹ کے سر کو نہ ردیئے
جب جانیں ہم کہ کوکھ کے پسر کو مروا دیئے

بھائی کا داغ اور ہے داغ پسر ہے اور
قوت بدن کی اور ہے نور نظر ہے اور
بازو کا درد اور ہے درد جگر ہے اور
سینہ کا زخم اور ہے درد کمر ہے اور
گر صبر ہے تو گود کے پالے کو بھیجیے
برزن میں اپنے گیسوؤں والے کو بھیجیے

دشوار ہے اگر غم فرزند نوجوان
مشتاق تیر ہیں تبر و خنجر و سنان
مرنے کو آپ آیئے اے قبلہ زمان
جان اپنی دیجیے جو ہے پیاری پسر کی جان
اصغر سے کچھ غرض ہے نہ اکبر سے کام ہے
ہم کو تو آپ کے سر انور سے کام ہے

ان تمام اشعار میں دشمنوں کی طنز، تعریض اور لاگ ڈانٹ کو علی اکبر کو بھجوانے کو کس بلاغت کے ساتھ ادا کیا ہے، طنز کا سب سے بڑا نکتہ یہ ہے کہ اسمیں ذاتیت کا پہلو

موجود ہو، کیونکہ سچا طعنہ نہایت سخت اثر کرتا ہے، یہ امر کہ بیٹا بھائی سے زیادہ عزیز ہوتا ہے، ایک بدیہی بات ہے، پھر اس دعوی کو تعدد تمثیلون سے اور زیادہ قطعی کر دیا ہے، یعنی بازو کے درد کو جگر کے درد سے کچھ نسبت نہین، جسم کی جراحت پر آنکھون کی جراحت کو ترجیح ہے، سینہ کے زخم سے کمر کے درد کو کیا نسبت ہے،

امام حسین علیہ السلام نے حضرت عباس کو حضرت علی اکبر سے پہلے میدان جنگ مین بھیجدیا تھا تو اس وجہ سے بھیجا تھا کہ عباس کسی طرح گوارا نہین کرتے تھے کہ اُن کے ہوتے علی اکبر پر آنچ آجائے، لیکن دشمن اسکی یہ وجہ بتاتے ہین کہ بیٹا بھائی سے زیادہ عزیز ہے، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ امام حسین کی یہ لڑائی دینداری پر مبنی نہین ہے، ورنہ خدا کی راہ مین بیٹے اور بھائی کی کیا تمیز تھی بلکہ بیٹے کو خدا کی راہ مین پہلے نثار کرنا تھا جیسا کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے کیا تھا، پھر یہ بڑھا دیتے ہین کہ آپ کا صبر و شکر تو مسلم الثبوت ہے، بیٹے کے لیے یہ بیقراری کیون؟ ان طنزیہ فقرون مین جن الفاظ سے امام علیہ السلام کو خطاب کیا ہے، بالکل تعریض سے بھرے ہوے ہین، شاہ دین پناہ۔ قبلہ زمان برنور ان سب الفاظ کے یہ معنی کہ آپ اپنے آپ کو ایسا سمجھتے ہین۔

مثال ۴، واقعۂ کربلا کے بعد جب اہل بیت یزید کے دربار مین آگئے ہین، تو یزید نے اُن سے اس طرح خطاب کیا ہے :-

تخت کے سامنے رہتے ہوے کے جو اسیر	دیکھ کر سید سجاد کو بولا وہ شریر
سرکشی کرکے دس بڑھو مجھ سے شبیر	شکر کرتا ہون کہ خالق نے کیا تم کو حقیر

بیٹھنے کا کہین دنیا مین سہارا نہ رہا
پنجتن اُٹھ گئے اب زور تمھارا نہ رہا

ہان کہو آج حمایت کو پیمبر ہین کہان
کیا ہوے ابن علی حیدر صفدر ہین کہان

قید مین انکی ہو آل ہی شبر ذیشان کہان
ننگے سر زینب دلگیر ہی سرور دین کہان

ذبح خنجر سے ہوا جو وہ پسر کس کا ہے
اک ذرا غور سے دیکھو کہ یہ سر کس کا ہے

ان اشعار مین یزید کے کفر اور ارتداد کو ایسے بلیغ اور لطیف پیرایہ مین ادا کیا ہی جس سے زیادہ خیال مین نہین آسکتا، یزید کو تسلیم ہی کہ شید سجاد یعنی امام زین العابدین اور اہل حرم نہال نبوت کے شاخ و برگ ہین نہ یہ بھی تسلیم کرتا ہی کہ ان کا جو کچھ زور ہی وہ جناب رسالت پناہ اور آل عبا کے بل پر ہے، باوجود اس کے اس بات پر مسرت ظاہر کرتا ہی کہ ان کا زور نہین رہا، جس سے یہ معنی کہ اُس کو خود رسول اللہ کے دنیا مین نہ رہنے کی خوشی ہی، اس پر بھی اکتفا نہین کرتا بلکہ صاف صاف کہتا ہی کہ رسول اللہ کہان ہین؟ علی کہان ہین؟ حسن کہان ہین؟ ان سب پر طرّہ یہ کہ ان باتون پر خدا کے احسان کا ممنون ہی کہ اس نے اہل بیت کو خوار اور حقیر کیا، گویا یہ امر خود خدا کو پسند اور مرغوب تھا۔ اخیر کا مصرع اک ذرا غور سے دیکھو کہ یہ سر کس کا ہی، بلاغت کی جان ہی۔ غور سے دیکھنے کی فرمایش اس لیے ہی کہ امام زین العابدین کے نزدیک، حسین اس پایہ کے شخص تھے کہ انکے سر کا کاٹا جانا اور یزید کے دربار مین حاضر کیا جانا عقل مین نہین آسکتا، اس لیے کہتا ہی کہ شک ہو تو ذرا غور سے دیکھو، ذرا کا لفظ اور زیادہ بلیغ ہی،

مثال ۱۵

ٹھرا رہے تھے سن کے یہ آکے خاص و عام
چین بر جبین قریب گیا حر نیک نام

دیکھا کیا شقی پہ نہ حر نے کیا سلام
کافر سے کیا جھکے وہ خدا سے ہو جسکو کام

چین بر جبین قریب جو وہ شیر نر گیا
اللہ رے رعب حق کہ پسر سعد ڈر گیا

ڈر کر کہا عمر نے کہ لے حُر نامور
کتنے جوان صفوں میں ہیں کتنے ہیں نہر پر
رَن میں سوار تیرے رسالے کے ہیں کدھر
حُر نے کہا کہ مجکو کچھ اس کی نہیں خبر
دنیا میں زور اپنا ہے اور اپنا ہاتھ ہے
میں ہوں کسی طرف نہ کوئی میرے ساتھ ہے

کہنے لگا یہ حُر سے بہ نرمی وہ حیلہ ساز
سر بر نہ ہوں گے ہم سے کبھی سرورِ حجاز
قدرت سے ہے یزید کو تیری وفا پہ ناز
اب بعد فتح اور بھی ہوگا تو سرفراز
دیر اس میں کیا جو امر قریب الوقوع ہو
تو مصلحت جو ہے تو لڑائی شروع ہو

جو اس میں قدر تیری لئے ہی ہے مجھے پسند
تھوڑے بہت ہیں یاورِ سلطان ارجمند
پانی تو تین دن سے ہے پردیسیوں پہ بند
بس جائیں گے اُٹھے سوار نئے جب سمند
لشکر میں یاں چھ لاکھ دلاور جوان ہیں
واں ایک صف ہے جس میں بہتّر جوان ہیں

آمادہ قتل شاہ پہ ہیں سب جوان دلیر
کیوں برچھیاں حسین پہ پہلے چلیں کہ تیر
کٹتا ہے اب سر پسر شاہ قلعہ گیر
حُر نے کہا کہ مجھ سے نہ یہ پوچھ اے امیر
انسان کو اختیار ہے خود اپنے کام میں
مجکو شریک کرتا ہے قتل امام میں

یہ وہ موقع ہے کہ حُر جو یزید کے رسالہ کا افسر تھا، اس بات پر آمادہ ہو چکا ہے کہ یزید سے ٹوٹ کر امام علیہ السّلام کی فوج میں آجائے، یہ خبر سپہ سالار یعنی ابن سعد کو پہونچی تو وہ حُر کو طلب کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ اُس کو رام کرکے اس ارادہ سے روک لے، باوجود اسکے کہ حُر کے ارادہ کی خبر سُن چکا ہے اور جب حُر اُسکے سامنے گیا تو سلام تک نہ کیا، تاہم ابن سعد اس تجاہل کے ساتھ پیش آتا ہے کہ گویا اُس کو

اِس واقعہ کی مطلق خبر نہیں، بالکل خالی الذہن ہو کر پوچھتا ہے ع رن میں سوا تیرے رسالے کے ہیں کدھر، حُر نہایت بے پروائی اور گستاخی سے جواب دیتا ہے، ابن سعد اِس کو بھی نظر انداز کرتا ہے اور اِس بھرے پر چڑھاتا ہے کہ یزید کو مدت سے تیری وفاداری پر ناز ہے، اُس کے ساتھ یہ ثابت کرتا ہے کہ امام علیہ السلام کسی طرح اِس معرکہ میں کامیاب نہیں ہو سکتے، پھر کس استمالت سے کہتا ہے کہ ؎

ع تو مصلحت جو دے تو لڑائی شروع ہو،
ع جو اِس میں تیری راے وہی ہے مجھے پسند،
ع کیوں برچھیاں حسین پہ پہلے چلیں کہ تیر،

گویا کوئی کام حُر کے مشورہ کے بغیر کرنا نہیں چاہتا اسکے ساتھ یہ ثابت کرتا جاتا ہے کہ امام حسین علیہ السلام کی فوج نہایت کم ہے۔ کل ایک صف ہے، اور اسمیں بھی صرف بہتر جوان ہیں، امام سے لڑنے کے لیے کہتا ہے لیکن انکا نام جب لیتا ہے تو کبھی سرور حجاز کبھی سلطان ارجمند، کبھی شاہ کے لفظ سے خطاب کرتا ہے یہ بھی استمالت کا ایک پہلو ہے، کیونکہ اگر صاف صاف امام علیہ السلام کی بُرائی کیجائے تو ڈر ہے کہ حُر بالکل ہتے سے اُکھڑ جائے،

مثال ۶، ؎

رخصت طلب ہے شاہ سے اکبر سالالفام	شہزادہ مرنے جائے سلامت رہے غلام
للہ ردکیے نہ اب اے خواہر امام	وہ امر کیجیے کہ بڑھے جس سے میرا نام

بیکس ہوں ساتھ ماں نہیں سر پر پدر نہیں،
میں آپ کا غلام تو ہوں گو پسر نہیں

یہ وہ موقع ہے کہ حضرت زینب کے دونوں صاحبزادے شہید ہو چکے ہیں اور حضرت عباسؑ میدان جنگ میں جانا چاہتے ہیں، لیکن حضرت زینب روکتی ہیں

حضرت عباس منت اور لجاجت کرتے ہین کللہ نہ روکیے،

اسکے لیے کس قدر بلیغ پیرایہ اختیار کیا ہی، اول تو ان کو خواہرِ امام سے مخاطب کیا ہی، حالانکہ وہ حضرت عباس کی بھی بہن تھین، اس سے علاوہ اسکے کہ ان کا احترام مقصود ہی، خفیف سا اشارہ اس بات کی طرف بھی ہی کہ آپ کو مجھ سے وہ محبت نہین، جو حقیقی بھائی بہن مین ہوتی ہی، اور چونکہ درحقیقت حضرت زینبؑ کی حقیقی بہن نہ تھین، یہ تعریض زیادہ کارگر ہوتی ہی، پھر فرماتے ہین کہ مین بیکس ہون، نہ باپ سر پر ہی نہ ماں ساتھ ہی، سب سے کارگر یہ فقرہ ہی کہ ع مین آپ کا غلام تو ہون گو پسر نہین، یعنی اگر آپ کا فرزند ہوتا تو مجکو بھی اسی طرح اجازت دیتین جسطرح اپنے صاحبزادون کو دی اور انھون نے شہادت کی دولت حاصل کی،

مثال ۷، اسے

بیکس ہون مرا کوئی مددگار نہین ہے		تم ہو سو تمھین طاقت گفتار نہین ہے

یہ وہ موقع ہی کہ حضرت امام حسین علیہ السلام، مدینہ منورہ سے روانہ ہو رہے ہین، تمام خاندان کو ساتھ لیا ہی، لیکن صغریٰ کو باوجود اس کے کہ آپکی چہیتی بیٹی تھین بیماری کی وجہ سے ساتھ نہین لیجاتے، صغریٰ نہایت گریہ وزاری کرتی ہین اور ایک ایک سے سفارش کراتی ہین کہ مجکو بھی ساتھ لیتے چلئے لیکن کوئی ہامی نہین بھرتا اسوقت علی اصغر سے جو شش ماہہ بچے تھے خطاب کرکے کہتی ہین کہ اسوقت میرا درد کوئی مددگار نہین ہی، ایک تم ہو لیکن افسوس تم کو بولنے کی طاقت نہین، تمام لوگون سے مایوس ہوکر ایک بچہ کا سہارا ڈھونڈنا اور پھر یہ خیال کہ وہ بولنے کے قابل نہین، انتہا درجہ کی حسرت اور ناکامی کی تصویر ہی،

مثال ۸، ایضاً

استغاثہ یہ کیا حُر نے جو با دیدۂ نم	،	جوش مین آگیا اللہ کا دریائے کرم

خود بڑھے ہاتھوں کو پھیلا کے شہنشاہ امم	حُر کو یہ ہاتف غیبی نے صدا دی اسدم

شکر کر سبط رسول الثقلین آتے ہیں
اے برادر ترے لینے کو حسین آتے ہیں

اخیر شعر میں امام حسین علیہ السلام کا نام، جس سادگی سے لیا ہے کمال بلاغت ہے اس موقع پر اگر بہت سے اوصاف کے ساتھ اُن کا نام لیا جاتا تو یہ بات حاصل نہوتی جب کوئی شخص کمالات فضائل میں انتہا کے رتبہ تک پہونچ جاتا ہے تو اسکے نام لینے کے ساتھ اُسکے تمام اوصاف اور کمالات خیال میں آجاتے ہیں ان کے سادہ نام لینے سے اسی نکتہ کی طرف اشارہ ہے، نظامی نے بھی ایک موقع پر اس اسلوب کو برتا ہے، دارا نے جب سکندر کو خط لکھا ہے تو سکندر کے دعوای ہمسری پر نہایت تعجب اور افسوس ظاہر کیا ہے اس موقع پر کہتا ہے ؎

فلک بین چہ ظلم آشکارا کند	کہ اسکندر آہنگ دارا کند

دارا نے یہ فرض کیا ہے کہ سکندر کی حقارت اور میری جاہ وعزت اس قدر مسلمہ عام ہے کہ صرف دونوں کا نام لے لینا کافی ہے، چنانچہ کہتا ہے کہ آسمان کا یہ ظلم دیکھو! کہ سکندر، دارا کے مقابلہ کا قصد کرتا ہے لیکن یہان اس طرز بیان کا موقع نہ تھا اس لیے سننے والوں پر کچھ اثر نہیں پڑتا دارا کے زمانہ میں ممکن ہے کہ یہ حالت رہی ہو، لیکن آج سکندر کی عظمت وشان اسقدر مسلم ہے کہ سکندر کے محض نام لینے سے اسکی حقارت کا تصور نہیں ہوتا اس لیے شاعر (نظامی) کو چاہیے تھا کہ وہ اور واقعات سے پہلے سکندر کی ذلت اور حقارت ثابت کرتا، تب یہ طریقہ بیان مؤثر ہوتا، یہی موقع فردوسی کو بھی عرب و عجم کے مقابلہ میں پیش آیا۔

چونکہ فردوسی بلاغت کے تمام اصول سے واقف تھا اُسنے سمجھا کہ گو اُس زمانہ میں عرب کی وہی حالت تھی، لیکن جس زمانہ میں خود فردوسی موجود ہے وہ حالت

بدل گئی ہی، یعنی عرب کی عظمت تمام قلوب پر چھائی ہوئی ہو اسلیے محض عرب کے نام لینے سے سامعین کے دل مین عرب کی حقارت اور ذلت کا خیال نہین آسکتا اس لیے اُس نے پہلے یہ بیان کیا کہ عرب اونٹ کا دودھ اور گوہ کا گوشت کھایا کرتے تھے اس طرح اُس نے عرب کی قدیم حالت کی تصویر کھینچدی اور چونکہ بیان واقعی تھا، اس لیے اُس کا پورا اثر ہوا ہے

زشیر شتر خوردن و سوسمار	عرب را بجاے رسید است کار
کہ تخت کیان را کنند آرزو	تفو بر تو اے چرخ گردان تفو

اس کے ساتھ عجم کا ذکر، تخت کے ساتھ کیا، اور عجم کا نام لیا تو کیان کے لفظ سے لیا جو خود شوکت وشان پر دلالت کرتا ہی، اب جب دونون قومون کی ذلت اور عظمت کا نقشہ کھنچ چکا تو یہ الفاظ ع تفو بر تو اے چرخ گردان تفو آج بھی سامعین کے دل مین انقلاب زمانہ پر حسرت کا وہی اثر پیدا کرتے ہین جو اس وقت عجم کے دل مین پیدا ہوا تھا۔

مثال ۹، حُر نے جب یزید کی فوج سے الگ ہو کر امام حسین علیہ السلام کی خدمت مین حاضر ہونا چاہا ہی تو دور ہی سے عفو تقصیر کے لیے اسطرح فریاد کی ہی ہے

ذکر یہ تھا کہ صدا دور سے آئی اک بار	الغیاث اے جگر و جان رسول مختار
مجرم ایسا ہون کہ عصیان کا نہین جسکے شمار	عفو کر عفو کر اے چشمۂ فیض غفار

پار دریاے خطا سے مری کشتی ہو جاے
دوزخی بھی تری صدقے سے بہشتی ہو جاے

اے مددگار و معین الضعفا اد رکنی	اے خبر گیر گروہ غربا ادرکنی
پانون لغزش مین ہین اے دست خدا ادرکنی	ہاتھ باندھے ہین مین اے عقدہ کشا ادرکنی

دیجیے حُر کو سندنارسے آزادی کی
آپئے جلد خبر لیجیے فریادی کی

میرے اعمال مین ہرچند سراسر ہو بدی
آپ ہین مالکِ سرکارِ جنابِ احدی

ہون گنہگار خدا اے ازلی وابدی
اے خداوند جہان خذبیدی خذبیدی

جو تہیدست ہین تکتے ہین شہنشاہ کا ہاتھ
آپ کا ہاتھ زمانے مین ہو اللہ کا ہاتھ

پھر جب جناب امام علیہ السلام نے اس کی تقصیر معاف کردی ہو اور کمال مہربانی سے پیش آئے ہین تو ؎

حُر پکارا بابی انت وامی یاشاہ
مجھ سے گمراہ کو اک آن مین ملجای پناہ

قابل عفو نہ تھے بندۂ آثم کے گناہ
سب ہے صدقہ انھین قدمون کا خدا ہو آگاہ

مہر ذرّہ پہ جو ہو تیر تابان ہو جاسے
آپ جس مور کو چاہین وہ سلیمان ہو جاسے

اس موقع پر میرانیس نے اپنی عادت کے خلاف متعدد عربی جملے استعمال کیے ہین جو اردو مین بظاہر غریب اور نامانوس معلوم ہوتے ہین، لیکن ان جملون کی وجہ سے اُس وقت کی حالت کی جو تصویر کھنچ جاتی ہو وہ اور کسی طرح ممکن نہین دعا، استغاثہ اور فریاد کے لیے عربی جملے ایک خاص اثر رکھتے ہین، اور اس لیے جاہل سے جاہل آدمی بھی جب دعا مانگتا ہو تو عربی ہی لفاظ استعمال کرتا ہو استغاثہ اور فریاد کے وقت بھی اسی قسم کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہین، مثلاً الامان الغیاث چونکہ حُر عربی النسل ہو اسلیے اُسکی زبان سے بعینہ وہ الفاظ جو ان موقعون پر عرب استعمال کرتے ہین او واقعہ کی تصویر کھینچنے کے لیے زیادہ کارگر ہوسکتے ہین، بابی انت وامی فدا اور قربان ہونے کے موقع پر بولتے ہین، اور یہ فقرہ ایسا موثر اور دلنشین ہے کہ اردو

کا کوئی جملہ وہ اثر پیدا نہین کر سکتا تھا،

مثال ۱۰ :- حضرت عباس کو جب امام حسین علیہ السلام نے فوج کا علم عنایت فرمایا ہی تو حضرت زینب اُن سے فرماتی ہین ؎

گھر مین سلامت آئین گے جب سرورِ امم	تب دین گی ہم تو تہنیتِ عہدۂ علم
ہاتھون کو جوڑتی ہی یہ بھینا اسیرِ غم	کیجو صلاح صلح کہ لشکر ادھر ہی کم

تم سے بڑی اُمید ہی زہرا کی جائی کو
بھیّا تمھین سے لے گی بہن اپنے بھائی کو

اخیر شعر مین معمولی طریقۂ کلام یہ تھا کہ مجکو تم سے بڑی امید ہی اور مین امام حسین کو تمھین سے لون گی لیکن حضرت زینب نے اپنے آپ کو زہرا کی جائی کہا، اور پھر کہا کہ بہن اپنے بھائی کو تمھین سے لیگی، اس اسلوب کلام کے بدل دینے نے جو بلاغت پیدا کی وہ خود ظاہر ہی،

مثال ۱۱ ؎

پرسا تمھین شہید کا دینے کو آئے ہین	کس کس کے داغ آج جگر پر اُٹھائے ہین
بیٹھے ہین، خاک اُڑائی ہی آنسو بہائے ہین	یہ ہم تمھارے لال کے خون مین نہائے ہین

یہ وہ موقع ہی کہ حضرت علی اکبر شہید ہو چکے ہین اور امام علیہ السلام زنانہ مین تشریف لے گئے ہین اور حضرت زینب سے علی اکبر کی شہادت کا واقعہ بیان فرماتے ہین اس موقع پر یہ لفظ "تمھارے لال" ایک خاص اثر پیدا کرتا ہی، علی اکبر، امام حسین علیہ السلام کے صاحبزادے تھے لیکن امام علیہ السلام اُن کو حضرت زینب کا لال کہکر خطاب کرتے ہین اور کہتے ہین کہ ہم جو خون مین نہائے ہین یہ تمھارے لال کا خون ہی۔ انسان کو رنج و غم کی حالت مین جب کوئی نہایت قریب کا عزیز ہمدرد اور غمگسار ملجاتا ہی تو جوشِ محبت مین اس غم کو اپنی ذات کے ساتھ نہین بلکہ اُسی شخص کی طرف منسوب

کرتا ہو، گویا اُس سے ایسی ہمدردی کی امید کرتا ہو کہ وہ واقعہ خود اُسی شخص پر پیش آیا ہو، یہاں اس طرز بیان سنے زیادہ اثر اس وجہ سے پیدا کیا ہو کہ فی الواقع حضرت زینب کو علی اکبر سے نہایت سخت محبت تھی، علی اکبر کو بچپن سے اُنہی نے پالا تھا اور اُن کو اپنے بیٹون سے زیادہ عزیز رکھتی تھین،

مثال ۱۲، جب حضرت عباس نے پانی لانیکے کے لیے نہر پر جانا چاہا ہو تو حضرت زینب نے خطرہ کے لحاظ سے اُن کو روکنا چاہا، امام حسین بھی اُن کا جانا گوارا نہین کرتے، اُسوقت حضرت عباس کی زوجہ حضرت زینب سے کہتی ہین ؎

کہنے لگی یہ زوجہ عباس خوش صفات	بی بی بھلا یہ کون سے دیا اس کی ہر بات
مشکیزہ لیکے گر یہ نجائین سوے فرات	پھر ننھے ننھے بچون کی ہو کسطرح حیات

ہر وقت کبریا سے طلبگار خیر ہون
آگے جو کچھ بھون کی رضا مین تو غیر ہون

یہ نقرہ "مین تو غیر ہون" اس موقع پر نہایت موثر اور بلیغ نقرہ ہو، وہ حالانکہ حضرت عباس کی بیوی ہین لیکن اپنے آپ کو غیر کہتی ہین۔ یہ اس بات کی تعریض ہو کہ میری بات نہ مانا، گویا مجکو غیر سمجھنا ہو۔

مثال ۱۳، ؎

قید ہون ظلم رسیدہ بھی ہون نادار بھی ہون	اس لُٹے قافلے کا قافلہ سالار بھی ہون

یہ وہ موقع ہو کہ ہند (یزید کی بیوی) قیدخانہ کے دیکھنے کے لیے گئی ہو، وہان امام زین العابدین کو قید مین دیکھ کر نام و نسب پوچھا ہو اور امام موصوف نے جواب دیا ہو۔ اس شعر مین قافلے کے ساتھ لٹے کی قید نے نہایت بلاغت پیدا کی ہو۔ حسرت اور رنج کے اظہار کا یہ انتہائی درجہ ہو کہ انسان اپنے آپ کو ایک ظاہری معزز لقب سے یاد کرتا ہو اور ساتھ ہی ایک دوسرا لفظ بھی ایسا استعمال کرتا ہو جس سے

وہ معز لقب، اور زیادہ ناکامی اور حرمان ثابت کرتا ہے۔ امام زین العابدین نے اپنے آپ کو قافلہ سالار کہا، لیکن یہ بھی کہدیا کہ لٹے قافلے کا قافلہ سالار ہوں،

مثال ۴۔۱۰

یہ سخن کہہ کے مخاطب ہوئے اعداسے امام	اے سپاہِ عرب مہرورے وکونہ دشام
تم یہ کرتا ہے حسین آخری حجت کو تمام	پسرِ مصحفِ ناطق ہوں سنو مجھ سے کلام

سخنِ حق کی طرف کانوں کو مصروف کرو
شور باجوں کا مناسب ہو تو موقوف کرو

تیسرے شعر میں "مناسب ہو" کے جملۂ معترضہ نے نہایت بلاغت پیدا کی ہے چونکہ وعظ اور پند کا موقع ہے اور یزیدیوں سے توقع بھی نہ تھی کہ وہ امام کی کسی بات کو جو تحکم کے لہجہ میں کہی جاتی قبول کرتے۔ اس لیے اُنھیں کی مرضی پر رکھا گیا کہ اگر تم مناسب سمجھو تو باجوں کا شور ذرا موقوف کر دو۔

استعارات و تشبیہات یہ چیزیں حسن کلام کا زیور ہیں بلکہ سچ یہ ہے کہ نظم و نثر اور تقریر و تحریر میں جو کچھ جادوگری ہے بہت کچھ انہی کی بدولت ہے لیکن جس طرح ہر چیز جبتک نیچرل حالت میں رہتی ہے اُس کا اصلی حُسن قائم رہتا ہے۔ جب تکلف اور تصنع شروع ہوتا ہے تو اثر میں کمی آجاتی ہے، اِسی طرح تشبیہ اور استعارہ میں بھی جب تقصد و تکلف، غرابت اور غیر معتدل ندرت پیدا کی جاتی ہے تو اصلی اثر جاتا رہتا ہے۔

اُردو کی شاعری میں جس طرح اور بہت سے بے معنی تکلفات پیدا ہو گئے ہیں جنھوں نے شاعری کا اصلی جوہر خاک میں ملا دیا ہے، اسی طرح تشبیہات اور استعارات کی حالت بھی بالکل مل گئی ہے، اور لطف یہ کہ آج کل کے اہل سخن بدمذاقی سے، اُسی کو کمال سخن سمجھتے ہیں۔

انسان میں فطرتاً یہ بات پیدا کی گئی ہے کہ وہ اشیا کی تصویر سے لطف اُٹھاتا ہے

ایک بدصورت حبشی ہمارے سامنے آئے تو ہم کو نفرت ہوگی لیکن اگر کوئی ہوبہو اسکی تصویر کھینچدے تو ہم کو لطف آئے گا، اور جسقدر وہ زیادہ اصل کے مطابق ہوگی اُسی قدر طبیعت پر لطف اور استعجاب کا زیادہ اثر ہوگا چونکہ تشبیہ بھی ایک قسم کی تصویر ہے اس لیے طبیعت کا اس سے محظوظ اور متلذذ ہونا ایک فطرتی امر ہے۔

تشبیہ کی دو قسمیں ہین، مفرد و مرکب، مفرد جسطرح چہرہ کو پھول سے تشبیہ دیجائے مرکب جس طرح کہا جائے کہ میدان جنگ مین گرد اُٹھی تو اُس مین تلوارین اس طرح چمکتی تھین جسطرح شب کو ستارے ٹوٹتے ہین۔

مفرد تشبیہ مین چندان جدت نہین ہوسکتی اولاً تو اس وجہ سے کہ مفرد چیزون کی طرف ہر شخص کا خیال منتقل ہوسکتا ہے ثانیاً مدت سے شعرا اور اہل قلم اس قسم کی تشبیہ سے کام لے رہے ہین، اس لیے عالم قدرت مین جو چیزین تشبیہ کے قابل تھین اکثر کام مین آچکین، مثلاً چہرہ کو پھول، آفتاب، مہتاب، آئینہ سے تشبیہ دے سکتے تھے، سُو سُو سُو دفعہ دے چکے، اب عالم فطرت مین کوئی نئی چیز پیدا ہو تو چہرہ کی تشبیہ مین بھی جدت پیدا ہو،

البتہ مرکب تشبیہ مین ہر وقت جدت پیدا ہوسکتی ہے کیونکہ اول تو ترکیب کی ہزارون صورتین ہین، دوسرے یہ کہ چند اشیا کی ترکیب سے جو مجموعی ہیئت پیدا ہوتی ہے اُس کی طرف ہر شخص کا خیال نہین منتقل ہوسکتا،

ایک نکتہ اور سمجھ لینے کے قابل ہے، تشبیہ کی اصلی خوبی یہ ہے کہ مشبہ کی تصویر آنکھون مین پھر جائے اور نیچرل شاعری مین جیسا کہ قدمائے عرب کی شاعری تھی تمام تشبیہین اسی قسم کی ہوتی تھین لیکن ایک مدت سے ایشیائی شاعری نیچرل حالت سے دور پڑگئی ہے اس لیے آج اس قسم کی تشبیہات کا ڈھونڈنا بیفائدہ ہے، تاہم تشبیہ کی خوبیان جسقدر میر انیس صاحب کے کلام مین پائی جاتی ہین، اُردو

زبان مین اُنکی نظیر نہین مل سکتی، اُنکی تشبیہات مین جو خصوصیات ہین اُنکی تفصیل حسب ذیل ہی،

(۱) اکثر تشبیہات مرکب ہین،

(۲) اکثر تشبیہات قریب الفہم اور سریع الانتقال الی الذہن ہین اور یہی تشبیہ کا بڑا کمال ہی،

(۳) علماے معانی نے لکھا ہی کہ تشبیہ کی غرض کبھی مشبہ کی رفعت اور حسن اور کبھی تحقیر اور ذلت اور کبھی رعب و ہیبت ہوتی ہی، یہ باتین میر انیس کی تشبیہات مین کمال کے درجہ پر پائی جاتی ہین، مثلاً حضرت عباس پر جب ہر طرف سے برچھیان چلنے لگین ہین تو اس حالت کو اسطرح ظاہر کیا ہی ؎

یون برچھیان تھین چار طرف اس جناب کے	جیسے کرن نکلتی ہی گرد آفتاب کے

برچھیون سے زخمی ہونا، شکست و مغلوبیت کی حالت ہی اس لیے اس کے بیان کرنے سے ذلت کا خیال پیدا ہوتا ہی۔ لیکن اس تشبیہ نے حالت بدل دی ہی

یا مثلاً جب حضرت عباس کے دونون ہاتھ تلوار سے کٹ کر گر پڑے اور اُنھون نے مشک کو دانتون سے پکڑ لیا تو اس حالت کی تصویر اس طرح کھینچی ہی، ع

شکیزہ تھا کہ شیر کے منھ مین شکار تھا

مشکیزہ کا منھ مین لینا ایک بدنما صورت ہی لیکن اس تشبیہ نے بدنمائی کے بجاے شان پیدا کر دی۔

یا مثلاً جب تمام اہل بیت ایک ہی رسن مین قید کیے گئے ہین تو اس حالت کو اسطرح بیان کیا ہی ؎

گردن مین بارہ اسیرون کی پڑی تھی ایک رسن	جسطرح رشتۂ گلدستہ مین گلہاے چمن

رسی مین باندھا جانا اور وہ بھی ایک ہی رسی مین بظاہر نہایت ذلت نما حالت تھی لیکن تشبیہ نے بدنمائی کو حسن سے بدل دیا،

یا مثلاً یہ شعر ؎

مقتل میں کیا ہجوم تھا اُس نورِ عین پر	پروانے گر رہے چراغِ حسین پر

یا مثلاً ان اشعار میں تشبیہ سے دشمن کی ہیبت اور بدنمائی پیدا کی ہے ؎

کستی تھی یہ زرہ بدنِ بدخصال میں	جکڑا ہے پیل مست کو لوہے کے جال میں

ع گھوڑے پہ تھا شقی کہ پہاڑی پہ دیو تھا ؎

سینے پہ تھے کواڑ کہ خیبر کا بند باب	تنور گرم تھا شکم خانمان خراب
جوشِ غضب سے سُرخ ہوئی چشم نابکار	مثلِ تنور مُنھ سے نکلنے لگا بخار

(۴) محسوسات سے جو تشبیہ دی جاتی ہے نہایت عمدہ خیال کی جاتی ہے، کیونکہ محسوسات رات دن محسوس ہوتے رہتے ہیں۔ اس لیے اُن کے ذکر کے ساتھ فوراً انکی صورت ذہن میں آجاتی ہے اور اس لیے مشبہ کی تصویر بھی آنکھوں میں پھر جاتی ہے اس قسم کی تشبیہات میرانیس کے ہاں کثرت سے ہیں مثلاً جانکنی اور اضطراب کا بیان ؎

یوں روح کے طائر تنِ بے سر چھوڑ کے بھاگے	جیسے کوئی بھونچال میں گھر چھوڑ کے بھاگے

تلوار کی تعریف ؎

جوشن کو کاٹ جاتی تھی یوں آکے اوج سے	پیراک جس طرح نکل آتا ہے موج سے
کالی وہ ڈانڈ اور وہ چمکتی ہوئی سنان	غل تھا کہ اژدہا ہے نکالے ہوئے زبان

یا مثلاً دو حریف برچھیوں سے ایک دوسرے پر وار کر رہے ہیں اور برچھیوں کی انیاں باہم ٹکراتی ہیں۔

ع دو سانپ گتھ گئے تھے زبانیں نکال کے

اسی حالت کی ایک اور تشبیہ،

ع شمعوں کی تھیں لوئیں کہ ملیں اور جدا ہوئیں

تعزیہ خانے میں لوگوں کا سیاہ ماتمی لباس ؎

مردم سیاہ پوش ہین سب ادیگر سفید	جیسے بیاض چشم ادھر اور اُدھر سفید

حضرت علی اکبر کا چھوٹا سا نیزہ، دشمن کے بھالے سے ٹکراتا ہی،

نکل تھا کہ اژدہے سے وہ افعی لپٹ گیا،

غیظ اور غضب کی حالت، ؎

یون غیظ تھا عمرو کی طلب سے دلیر کو	جسطرح ٹوک دے کوئی غصہ مین شیر کو

ڈھال پر تلوار کو آسانی سے روک لیتا، ؎

یون روکتے تھے ڈھال پہ تیغ جہول کو	جسطرح روک لے کوئی شہزور پھول کو

خزان کے موسم مین پتون کی حالت،

ع پتے برنگ چہرۂ مدقوق زرد تھے

(۵) بعض جگہ تشبیہ سے مبالغہ مقصود ہوتا ہی، اس قسم کی تشبیہین میر صاحب کے ان نہایت اعلیٰ درجہ کی پائی جاتی ہین، اگرچہ فی الحقیقت اُن سے تشبیہ کی اصلی غرض نہین حاصل ہوتی کیونکہ مبالغہ خود ایسی چیز ہی جو اصلیت سے دور کر دیتی ہی،

گرمی کی شدت کا بیان، ؎

گرداب پر تھا شعلۂ جوالہ کا گمان	انگارے تھے حباب تو پانی شرر فشان
منہ سے نکل پڑی تھی ہر اک موج کی زبان	تہ مین تھے سب نہنگ مگر تھی لبون پہ جان

پانی تھا آگ گرمی روز حساب تھی
ماہی جو سیخ موج تک آئی کباب تھی

اب ہم چند اشعار ہر قسم کی تشبیہ کے ایک جا نقل کرتے ہین جن سے اندازہ ہوگا کہ میر صاحب نے تشبیہ مین کیا کیا لطافتین اور نزاکتین پیدا کی ہین ؎

کہنی سے دونون ہاتھ جُدا تن سے سر جُدا	ہر نخل قد کی شاخ جُدا اور ثمر جُدا
ہر سنگ ریزہ نور سے دُر خوش آب تھا	ہر ریگ جو چھٹین کرن تو بھبو آفتاب تھا

ع ہم لوگ زمانہ مین حباب لب جو ہین سے

ہلنے لگے درخت لرزنے لگے جبال … سبزہ نہ تھا کھڑے تھے بدن زمین کے بال

ع چلنے مین نیزے کا بنتے تھے شل پاے پیر سے

یہ غیظ تھا عمرد کی طلب سے دلیر کو … جسطرح ٹوک دے کوئی غصہ مین شیر کو

سرعت مین تھا ہرن تو دغا مین ہزبر تھا … پستی مین سیل تھا تو بلندی مین ابر تھا

گھوڑے کی تعریف

پھولون کے سبز سبز شجر سرخ پوش تھے … تھالے بھی نخل کے سبدگل فروش تھے

اک گھٹا چھا گئی ڈھالون سے سیہ کارون کی … برق ہر صف مین چمکنے لگی تلوارون کی

ع لہراتی ہے کیا نہر مثال شکم مار

ع افلاک ہنڈولے کی طرح تھے تہ و بالا سے

یارب ترا نام پاک جپنے کے لیے … گویا اک ہڈیون کا مالا ہون مین

اڑ کر گری زمین پہ سنان اس نکان سے … گرتا ہی جیسے تیر شہاب آسمان سے

گر سیان تھی تو تیغ دم امتحان نہ تھی … یہ طرفہ بات تھی کہ دہن تھا زبان نہ تھی

یون جلوہ گر زرہ مین تن سرخ فام تھا … گویا بچھا ہوا چمنستان مین دام تھا

چپ ہون مگر زبان ہر دہی اپنی کام مین … گویا کہ ذو الفقار علی ہے نیام مین

ناخن نے دکھایا جو رخ جلوہ گر اپنا … شرماکے مہ نو نے جھکایا ہے سر اپنا

پلکون اور آنکھون کی تشبیہ

ع مرہوار کیا، ہوا پہ سلیمان کا تخت تھا

ع بیٹھا ہے شیر بنجہ کو ٹیکے ترائی مین سے

کالی دو ڈاڑھ اور وہ چمکتی ہوئی سنان … غل تھا کہ اژدہا ہی نکالے ہوئے زبان

ع ذرے نہ تھے زمین پہ سونے کے پھول تھے،

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا … تھا موتیون سے دامن صحرا بھرا ہوا

ع کھلتی تھین اور حبابیون کی گرہ کھپتی تھین

جل کر کبھی بڑھا کبھی پیچھے سرک گیا		شعلہ تھا آگ کا کہ بجھا اور بھڑک گیا

ع اعدا کا لہو تیغ کی باچھوں میں بھرا تھا

تلواریں منہ چھپاتی تھیں سایہ میں ڈھال کے		خنجر بھی رہ گئے تھے زبانیں نکال کے	
غل ہوا جنگ کو حیدر کے پیارے نکلے	ولہ	لے فلک دیکھ زمیں پر بھی ستارے نکلے	
سیماب تھا زمیں پہ فلک پر سحاب تھا	۔	دریا پہ موج تھا تو ہوا پر عقاب تھا	
آیا گیا فرس جو سمٹ کر اُدھر اُدھر	۔	ڈھالوں کا ابر ہو گیا پھٹ کر اِدھر اُدھر	گھوڑا
حملہ غضب ہے بازوے شاہِ حجاز کا		لنگر نہ ٹوٹ جائے زمیں کے جہاز کا	
ڈر سے ہوا فرات کی موجوں کو اضطراب		اور آب میں سروں کو چھپانے لگے حباب	
کڑیوں سے یوں زرہ کی نکل جاتی تھی شتاب		جس طرح دام سے نکل آتی ہے موج آب	تلوار
سرکش تھے بادکبر سے جو خانماں خراب		خود اُن کے گر کے ٹوٹ گئے صورت حباب	
خود نہر علقمہ کے بھی سوکھے ہوئے تھے لب	ولہ	خیمے جو تھے حبابوں کے تپتے تھے سب کے سب	گرمی کی شدت
ہر چند مچھلیاں تھیں زرہ پوش سر بسر	۔	منہ کھولے چھپتی پھرتی تھیں لیکن اِدھر اُدھر	تلوار کی ہیبت
بھاگی تھی موج چھوڑ کے گرداب کی سپر		تھے تہ نشیں نہنگ مگر آب تھے جگر	

دریا نہ تھمتا خوف سے اس برق تاب کے
لیکن پڑے تھے پاؤں میں چھالے حباب کے

ع ہو گیا جوڑ کے انکھوں کو حلا جل خاموش ؎

تیغوں کی کچھ خبر تھی نہ ڈھالوں کا ہوش تھا		نیزہ ہر اک سوار کو اک بار دوش تھا
خاک اُڑتی تھی منہ پہ حرم شیر خدا کے		تھا چین جبیں فرش بھی جھونکوں سے ہوا کے

صنائع وبدائع اگرچہ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ بعض صنائع ایسے بھی ہیں کہ اگر بے تکلفی سے آجائیں تو کلام میں حسن پیدا ہو جاتا ہے لیکن عام حالت یہ ہے کہ اکثر صنائع وبدائع شاعری اور انشا پردازی کا دیباچۂ زوال ہیں،

میر انیس جس زمانے میں تھے، شاعری کا مدار صنائع و بدائع پر رہ گیا تھا مبالغہ
ایہام، اور مناسبات لفظی، یہی چیزیں شاعری کا کمال خیال کی جاتی تھیں میر انیس کو
انھیں لوگوں میں رہنا سہنا تھا، انہی سے داد سخن لینی تھی اور سچ تو یہ ہے کہ انہی کی قدردانی
پر معاش اور ضروریات زندگی کا انحصار تھا، ایسی حالت میں کیونکر ممکن تھا کہ وہ زمانہ کی
حکومت سے آزاد رہتے، وہ جانتے تھے کہ جس شاعری کو وہ زندہ کرنا چاہتے ہیں صنائع
و بدائع اُسکے چہرہ کے داغ ہیں، لیکن اُنھوں نے مجبوراً اسکو گوارا کیا، یہ صرف قیاس
نہیں بلکہ مستند اور صحیح روایت سے ثابت ہے میرے ایک معزز دوست نے خود
میر انیس سے پوچھا کہ آپ لفظی رعایتوں اور صنائع و بدائع کو پسند کرتے ہیں انھوں نے
جواب دیا کہ "نہیں" "لیکن آخر لکھنؤ میں رہنا ہے"۔ تاہم میر انیس نے یہ کیا کہ جو صنعتیں
محض لغو تھیں مثلاً صنعت اہمال اور لزوم مالا یلزم وغیرہ وہ نہایت کم برتیں، اور جسقدر
برتیں، اُن سے صرف یہ ثابت کرنا تھا کہ اس جولانگاہ میں بھی وہ حریفوں سے پیچھے نہیں
باقی صنعتوں کو اُنھوں نے اس طرح برتا کہ کلام کی اصلی خوبی یعنی برجستگی، صفائی اور سادگی
میں فرق نہ آنے پائے، ہم اُن تمام صنعتوں کی کچھ کچھ مثالیں نقل کرتے ہیں جو میر صاحب
کے کلام میں پائی جاتی ہیں:

ایہام، کے یہ معنی ہیں کہ ایک لفظ کے دو معنی ہوں، ایک معنی مراد ہوں،
اور دوسرے معنی مراد نہوں، لیکن متقدم اور مؤخر الفاظ سے اُسکو مناسبت ہو مثلاً ع
اک پھول کا مضمون ہو تو سو رنگ سے باندھوں، رنگ کے دو معنی ہیں، ایک تو وہی معمولی
رنگ، دوسرے، طرح، قسم، طرز، یہاں یہی پچھلے معنی مراد ہیں، یعنی پھول کے مضمون کو
میں سو طرح سے باندھ سکتا ہوں، یہاں پہلے معنی مراد نہیں لیکن گل سے اسکو مناسبت ہے
یہ صنعت اگر بے ساختگی اور بے تکلفی سے برتی جائے تو کلام میں نہایت حسن پیدا ہو جاتا ہے
قدما میں یہ صنعت بالکل متروک تھی، سلمان ساوجی نے اسکی ابتدا کی اور اس میں

نہایت غلو کیا تاہم اکثر جگہ نہایت بے تکلفی سے بھی استعمال کیا ہی،

سلمان کے بعد خواجہ حافظ کے کلام مین کہین کہین اسکا پتہ لگتا ہی لیکن پھر کسی نے اسکی طرف توجہ نہین کی اُردو مین ابتدا ہی سے اسکی طرف میلان ہا میر انیس کے زمانہ تک اسکو رواج عام ہو چکا تھا اور یہ صنعت مضمون بندی کی ایک بڑی عمدہ صنعت خیال کیجاتی تھی میر انیس صاحب نے بھی عوام پسندی کی بنا پر یہ صنعت نہایت کثرت سے برتی ہی لیکن اکثر جگہ نہایت بے تکلفی سے ادا ہوئی ہی چند مثالین ذیل مین درج ہین ؎

جب تک یہ چمک مہر کے پرتو سے نہ جائے		اقلیم سخن میری قلمرو سے نہ جائے
ہر چند کہ ہون خسرو اقلیم سخن		پر غیر دولت کچھ قلمرو مین نہین
تعریف مین چشمہ کو سمندر سے ملادون		قطرہ کو جو دون آب تو گوہر سے ملادون
کیا خوف اُن کو نہر پہ گر روک ٹوک ہے		نیزہ نہین جو پاس تو اس مین بھی نوک ہے
بُت توڑ دیے ہین جو سوے دیر گئی ہون		خندق کو تو دو ہاتھ مین پر گئی ہون

تلوار کی زبان ہے

ع چلاتی تھین پریان کہ خدا جان بچائے (بان جن کو بھی کہتے ہین،

ع دم اوڑھ گیا تھا لہو چاٹ چاٹ کے، (دم خون کو بھی کہتے ہین)

ع سب فوج کی نیغین تھین اک شاد کا دم تھا (دم تلوار کی باڑھ کو بھی کہتے ہین ؎

ڈھالون کا دور برچھیون کا اوج ہو گیا		ہنگام ظہر خاتمہ فوج ہو گیا
پھر گل فقط نہ کرتے تھے رب علا کی مدح		ہر خار کو بھی نوک زبان تھی خدا کی مدح
کم نہ کچھ مرتبہ آل عبا ہووے گا	ولہ	عاصیون کا اسی پردہ مین بھلا ہوئے گا

ع اک ایک کوس راہ جبل مین پہاڑ تھا،

ع غل پڑ گیا کہ گھاٹ پہ تلوار چل گئی،

ع سر دھڑ سے گر پڑا تو جسد کو خبر ہوئی،

ع ایسا گنہ کیا ہی کہ کچھ جسکی حد نہین و حد گناہ کی سزا کو بھی کہتے ہین)

ع دریا لہو کا پھر گئی چار ہاتھ میں ہے

پیدل میں تھی نہ جان نہ دم تھا سوار میں		ٹوٹی ہوئی صفیں تھیں بھلا کس قطار میں
ایسا کوئی طفلی میں نمودار نہ ہوگا	ولہ	ہاتھ ایسا تو جعفر کا بھی تیار نہ ہوگا
اللہ رے سخن کی ترے تاثیر انیس	ولہ	رو دیتے ہیں مثل شمع جلنے والے
اگر بزم عزا سے شہ میں رونا		ہر آنکھ یہ فرض عین ہوجاتا ہے

ع حسرت ہو کہ خواب میں بھی رویا کیجے (عربی میں رویا کے معنی خواب کے ہیں)

ع چپ ہوں گر زبان ہر دہی اپنے کام میں (کام فارسی میں تالو کو کہتے ہیں)

ع آب بقا بھی ہو تو مرے کام کا نہیں،

مبالغہ، قدما کے نزدیک مبالغہ اس حد تک ممدوح تھا کہ کسی وصف کو ایک لطیف پیرایہ میں معمولی حالت سے کچھ بڑھ کر بیان کیا جائے لیکن جب حد سے بڑھا تو عیب اور نقص ہوگیا، فن بلاغت کے امام ابن قدامہ نے نقد الشعر میں اسکی مثال میں ابونواس کا یہ مصرعہ نقل کیا ہو۔

ب امین اللہ عش ابدا ۔ اے خدا کے امین! تو ہمیشہ زندہ رہ۔

امام موصوف نے لکھا ہو کہ کسی شخص کا ہمیشہ زندہ رہنا ناممکن ہو۔ اس لیے یہ مبالغہ معیوب اور قبیح ہو، شعراے عرب، اس قسم کا مبالغہ کرنا چاہتے تھے تو پہلے امکان کی شرط لگا دیتے تھے، یعنی اگر یہ ممکن ہوتا تو یوں ہوتا، ابوتمام کہتا ہو ہے

ولو ان مشتاقا تکلف فوق ما		فی وسعہ لمشی الیک المنبر

یعنی اگر کوئی مشتاق اپنی طاقت سے بڑھ کر کام کر سکتا، تو منبر خود ترے پاس چلا آتا، لیکن عرب میں بھی جب تکلف اور تصنع زیادہ بڑھا اور صحیح مذاق مفقود ہوگیا تو مبالغہ کی یہی خوبی رہ گئی کہ مستبعد اور ناممکن ہو، اور جسقدر زیادہ ناممکن ہو، اُسی قدر زیادہ اس کا کمال ہو، اب یہ حالت پہنچ گئی کہ گھوڑے کی تعریف میں کہتے ہیں ہے

رو برو سے اگر آئینہ کے اس گلگوں کو ق پھینک دے لیکے کبھی شرق سے تو غرب تلک
اتنے عرصہ مین پھر آئے تو اسے باور کر عکس بھی آئینہ سے ہونے نہ پائے منفک

میر انیس کے زمانہ مین مبالغہ کمال کی حد کو پہنچ چکا تھا اور یہ حالت ہو گئی تھی کہ جب تک مبالغہ مین انتہا درجہ کا استبعاد نہین ہوتا تھا، سامعین کو مزا نہین آتا تھا، مجبوراً امیر صاحب نے بھی وہی روش اختیار کی لیکن چونکہ ان کی اصل فطرت مین سلامت روی اور اعتدال تھا، اِس لیے اس میدان مین وہ اپنے حریف مرزا دبیر سے بہت پیچھے رہ گئے، اور یہی بات ہے جسکی بنا پر اُن کے حریف کہتے ہین کہ وہ خیال بندی اور مضمون آفرینی مرزا دبیر کا مقابلہ نہین کر سکتے۔

بہر حال اُن کے مبالغہ کا نمونہ یہ ہے گرمی کی شدت کے بیان مین لکھتے ہین —

وہ لُو وہ آفتاب کی حدت وہ تاب و تب کالا تھا رنگ دھوپ سے دن کا مثال شب
خود نہر علقمہ کے بھی سوکھے ہوئے تھے لب خیمے جو تھے حبابوں کے تپتے تھے سب کے سب
سُرخی اُڑی تھی پھولوں سے سبزی گیاہ سے
سایہ کنوئین مین اترا تھا پانی کی چاہ سے

آب رواں سے منھ نہ اُٹھاتے تھے جانور جنگل مین چھپتے پھرتے تھے طائر ادھر اُدھر
مردم تھے سات پردون کے اندر عرق مین تر خسخانۂ مژہ سے نکلتی نہ تھی نظر
گر آنکھ سے نکل کے ٹھہر جاے راہ مین
پڑجائین لاکھ آبلے پاے نگاہ مین

آئینۂ فلک کو نہ تھی تاب تپ کی تاب چھپنے کو برق چاہتی تھی دامن سحاب
سب سے سوا تھا گرم مزاجون کو اضطراب کافور صبح ڈھونڈھتا پھرتا تھا آفتاب
بھڑکی تھی آگ گنبد چرخ اثیر مین
بادل چھپے تھے سب کرۂ زمہریر مین

شیر اٹھتے تھے نہ خوف کے مارے کچھار سے
آئینہ مہر کا تھا مکدر غبار سے
آہو نہ منھ نکالتے تھے سبزہ زار سے
گردون کو تپ چڑھی تھی زمین کے بخار سے

گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر
بھن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر

گرداب پر تھا شعلۂ جوالہ کا گمان
منھ سے نکل پڑی تھی ہر اک موج کی زبان
انگارے تھے حباب تو پانی شرر فشان
تہ مین تھے سب نہنگ مگر تھی لبون پہ جان

پانی تھا آگ گرمی روز حساب تھی
ماہی جو سیخ موج تک آئی کباب تھی

لٹو کی تعریف

اُس کی ثنا اگر کوئی لائے زبان پر
گل کی طرح اشارے مین سو بار پھیر لو
کاوے مین شکل گنبد دوّار پھیر لو
ساکن جو حرف ہو وہ نہ آجائے زبان پر
بجلی ہے جس طرف دم پیکار پھیر لو
نقطہ کی گرد صورت پرکار پھیر لو

دوڑے بروے آب تو پتلی بھی تر نہو
آنکھون مین یون پھرے کہ مژہ کو خبر نہو

حسن التعلیل، یہ ایک لطیف صنعت ہی، اسکی حقیقت یہ ہی کہ شاعر ایک ایسی چیز کو کسی چیز کی علت فرض کرتا ہی، جو درحقیقت اسکی علت نہین، مثلاً ؎

بھلائی جو کرے دنیا مین ہو دی وہ پامال
بسان جادہ کسی کو تو راہ مت بتلا

جادہ یعنی راستہ پامال ہوتا ہی، شاعر اسکی یہ وجہ قرار دیتا ہی کہ راستہ لوگون سے بھلائی کرتا ہی اس لیے پامال ہی، یہ ایک قسم کی تخئیل ہی اور اس لحاظ سے یہ صنعت عین شاعری ہی کیونکہ شاعری درحقیقت تخئیل کا نام ہی، اس صنعت مین اسوقت زیادہ لطافت پیدا ہو جاتی ہی جب وہ وصف بھی جسکی علت بیان کرنی ہی تخئیل پر مبنی ہو مثلاً میر انیس کا یہ شعر ؎

ڈر سے ہوا فرات کی موجون کو اضطراب ۔۔ اور آب مین سر دن کو چھپانے لگے حباب

گرمی کی شدت

موجون کو اضطراب، اور حباب کا پانی مین سر چھپانے کی علت ڈر اور خوف کو قرار دیا ہو لیکن موج کا اضطراب اور حباب کا پانی مین سر چھپانا، خود کوئی واقعی چیز نہین بلکہ شاعر نے موج کی حرکت کو اضطراب قرار دیا ہو اور حباب جو ٹوٹ جاتا ہو تو اس کو فرض کیا ہو کہ اُس نے پانی مین منھ چھپا لیا، اس صنعت کو میر انیس نے اکثر جگہ نہایت خوبی سے برتا ہی

ع تیغین برہنہ ہو گئی تھین چوم کر نیام سے

گرمی کی شدت

پیاسی جو تھی سپاہ خدا تین رات کی ۔۔ ولہ ۔۔ ساحل سے سر ٹپکتی تھین موجین فرات کی

پرشن کے تہلکہ صف اعدا مین پڑ گیا ۔۔ ۔۔ ٹوٹا یہ مورچہ وہ رسالہ بگڑ گیا
ہر غول مین علم سے علم جھک کے لڑ گیا ۔۔ ۔۔ جو رہ گیا نشان وہ خجالت سے گڑ گیا

ڈر سے نہ بڑھاتے تھے جو سرکش قدم اپنے ۔۔ ولہ ۔۔ تیغین بھی نیامون مین چرائے تھین دم اپنے
تھم گیا طبل وغا کی بھی وہ آواز کا جوش ۔۔ ۔۔ ہو گیا جو ڈر کے ہاتھون کو جلاجل خاموش

ع اکبر سے بھی دغا مین کچھ آگے بڑھی رہی (حضرت علی اکبر کی تلوار کی تعریف سے)

ہر چند مچھلیان تھین زرہ پوش سر بسر ۔۔ منھ کھولے جھپتی بھرتی تھین لیکن ادھر ادھر
جا گے تھی موج چھوڑ کے گرداب کی سپر ۔۔ تھے نہ نشین نہنگ، مگر آب تھے جگر

دریا نہ تھمتا خوف سے اُس برق تاب کے
لیکن پڑی تھی پاؤن مین چھالے حباب کے

خاک اُڑتی تھی منھ پہ حرم شیر خدا کے ۔۔ تھا چین پہ جبین فرش تھی جھونکون سے ہوا کے

ع ڈھالون کا یہ عالم تھا کہ چھپتی تھین پس پشت،

صنعت طباق، یعنی دو متضاد یا مقابل چیزون کو یکجا جمع کرنا، میر انیس نے اس صنعت کو اکثر برتا ہو، اور نہایت بے تکلفی کے ساتھ برتا ہو۔

ع کھلتا نہین کچھ آپ نے کیون باندھی ہین ہتیار سے

ہاتھ باندھے ہوں میں اے عقدہ کشا امداد کیجیے ۔۔۔ پاؤں لغزش میں ہیں اے دست خضر امداد کیجیے

میری قدر کر اے زمین سخن ۔۔۔ ولہ ۔۔۔ کہ میں نے تجھے آسمان کر دیا

یہ فصل اور یہ بزم عزا یادگار ہے ۔۔۔ ولہ ۔۔۔ پیری کے ولولے میں خزاں کی بہار ہے

ع گرمی یہ تھی کہ زیست سے دل سب کے سرد تھے، سے

استادہ آب میں یہ روانی خدا کی شان ۔۔۔ پانی میں آگ آگ میں پانی خدا کی شان

ع یا تو یہ رہے یاد ہمیں بھول نہ جانا،

ع فاقے سے تین دن کے مگر زندگی سے سیر، سے

پانی نہ تھا وضو جو کریں وہ فلک مآب ۔۔۔ پر تھی رخوں پہ خاک تیمم سے طرفہ آب
نیزہ ہلا کے شاہ پہ آیا وہ خودپسند ۔۔۔ مشکل کشا کے لعل نے کھولے تمام بند

ع تو عالم و دانا ہے کہ میں ہیچمداں ہوں،

ع ثابت ہوا کب صف اوّل ہوئی آخر،

ع پانی ہے میرے زور کے آگے ہوا کا زور،

ع قرآن میں کیا خفی ہے کہ ہم پر جلی نہیں،

پیچھے کبھی قافلے سے رہنا نہ انیس ۔۔۔ اے عمر دراز تیری کوتاہی ہے

ع نیزوں سے کہیں عقدہ کشا بند ہوا ہے،

مراعات النظیر یعنی الفاظ کی رعایت، یہ وہی صنعت ہے جو آج عوام شعرا کا سرمایۂ کمال ہے، اور جسکو مہذب ضلع جگت کہہ سکتے ہیں، امانت لکھنوی اس شریعت کا پیغمبر ہے، اسکے مصحف کمال کی ایک آیت یہ ہے،

ع بھیڑیے ملتے ہیں آنکھیں تری گرگابی پر،

منشی امیر احمد صاحب مرحوم فرماتے ہیں، سے

کبوتر نہ ہوتا تھا جانے پہ راضی ۔۔۔ تو بھیجا اُسے روغن قازل کر

چونکہ عوام کی تسخیر کا سب سے چلتا جادو یہی صنعت ہے، اور چونکہ لکھنؤ کی شاعری کے رگ و پے میں یہ صنعت سرایت کر گئی تھی، اس لیے میر انیس صاحب کے ہاں بھی اس کی بہتات ہے لیکن اتنی احتیاط ہے کہ ابتذال نہیں آنے پاتا اور بعض جگہ تو واقعی اس سے لطف پیدا ہو جاتا ہے، فارسی شعرا نے بھی اس کو برتا ہے لیکن نہایت فصاحت کے ساتھ مثلاً ؎

تا دل ہرزہ گرد من رفت بچین زلف او		زان سفر دراز خود قصد وطن نمی کند	خواجہ حافظ
چشم بیمار ترا عین بلا می بینم		لیکن ابروی تو چیزیست کہ بالائے بلاست	سلمان

بہر حال میر انیس کی صناعی کے یہ نمونے ہیں ؎

جب تک یہ چمک مہر کے پرتو سے نہ جائے		اقلیم سخن میری قلم رو سے نہ جائے
ہر نخل برومند ہے یا حضرت باری		پھل ہم کو بھی مل جائے ریاضت کا ہماری

ع آتی ہوں میں سروں پہ ذرا فرق فرق سے، (تلوار کی زبان سے)

ع کیا مورچہ بندی تھی پے قتل سلیمان، ؎

اصغر سے اگر اکبر مہرو نہ ملے گا		تم ہاتھ سے جاؤ گے تو بازو نہ ملے گا
فرمانے لگے حسینؑ کہ او خانمان خراب	ولہ	دریا کو خاک جانتا ہے ابن بوتراب

ع آب بقا بھی ہو تو مرے کام کا نہیں،

ع یہ پھول کربلا کے بسانے کو آئے تھے،

ع کٹ کٹ گئے وہ سیف زبانی دکھا گئی، (تلوار) ؎

خالی نہ گیا وار کوئی تیغ دو سر کا		ہاتھ اڑ گئے گر پانوں بچا کر کوئی سر کا
اس ضعف میں لغزش ہے نہ وہ پانوں تھرا گئے	ولہ	پایا تھا ثبات قدم پاے ید اللہ
محتاج عصا ہوئے تو پیری نے کہا		چلیے اب چوبدار مرگ آیا ہے
کون سا باغ تجھے شاہ نے دکھلایا ہے		آنکھیں کوثر کے تو چھینٹوں میں نہیں پائی ہیں

ع تہ میں تھے سب نہنگ مگر تھی لبوں پہ جان،

ع کافر جو بچا تو ہاتھ بھی مارا جینو کا ، ہے

ابتک یہ لڑائی کے نہیں ڈھنگ سنے ہیں، دونوں میں نہیں ایک بھی جو رنگ سے واقف

ع سب فوج کی تیغیں تھیں اور اک شاہ کا دم تھا ، ہے

لف و نشر

واللیل و والضحیٰ ، رخ روشن خط سیاہ
ابرو و زلف و رخ شب قدر و ہلال و ماہ
چھپتی تھیں بھاگی جاتی تھیں گرتی تھیں خاک پر

لعل و غزال و گل لب و رخسار و چشم شاہ
تیر و سنان زرہ خزہ و سرمہ و نگاہ
قبضوں سے تیغیں جسم سے ردھیں تنوں سے سر

تفصیل

کٹ کٹ کے ذوالفقار سے گرتے تھے خاک پر
قبضہ سے تیغ ، بر سے زرہ ، ہاتھ سے سپر

پہنچوں سے ہاتھ شانوں سے بازو تنوں سے سر
برچھی سے پھل کمان سے زہ زین سے تبر

مہملہ

وہ طاہر و اطہر ہوا گر معرکہ آرا
آگاہ ہو کس طرح کہو عمرو کو مارا

معلوم ہو حملہ اسد اللہ کا سارا
صمصام کا اک وار ہوا کس کو گوارا

واللہ گر اک دم کو وہ صمصام علم ہو
ہر روح کو اُس دم ہوس ملک عدم ہو

کس کا اسد اللہ سا ہو والد مرحوم
صدر زد و سرا رحم دل و سرور و مہموم

حلال ہم مالک کل طاہر و معصوم
آسودہ ہر اک سالک و گمراہ و محروم

معصوم کا دلدار ہو سالار امم ہو
اولاد کا اس عالم و عادل کا الم ہو

اس طرح کا والا ہمم اس طرح کا سردار
وہ مصدر الطاف و احد محرم اسرار

اس طرح کا عالم کا ممد اور مددگار
وہ وصل اصول کرم داور دادار

حاصل۔ اگر اک مردِ دل آگاہ کو مارا مارا اگر اُس کو اسد اللہ کو مارا		

تلمیح، میر صاحب نے اس صنعت کو نہایت خوبی سے برتا ہے، وہ عربی فقروں کو اس خوبی سے اشعار میں لاتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے انگوٹھی پر نگینہ جڑ دیا ہے ؎

تحریر کیا ربانی انت واھی یاشاہ		قابل عفو تھے بندہ آثم کے گناہ

ع اے خداوند جہان خذبیدی ؎

انصاف کا اِس وقت طلبگار ہوں تم سے		ہے کون مرا آیہ کا اَسئلکم سے
انھی رانڈوں میں ہے اک دُختر فرزندِ نبی	ولہ	خوگر سینۂ دلبند رسولِ عربی
آفت فاقہ کشی بے پدری تشنہ لبی		دم بدم لب پہ یہ ہے این ابی این ابی
حامی ہے سب کا کون حیات و ممات میں	ولہ	کس کی ثنا ہے سورۂ والعادیات میں
کس کے لیے اکملت لکم دینکم آیا ہے انفسنا انفسکم کس سے اشارا		اتممت علیکم کا ملا ہے کسے پایا اللہ نے کس گھر میں ستارے کو اُتارا

انسانی جذبات یا احساسات

"یہاں تک جو محاسن کلام کا ذکر ہوا وہ شاعری سے نہیں بلکہ بلاغت سے تعلق رکھتے تھے، شاعری جس چیز کا نام ہے اس کی بحث اب شروع ہوتی ہے"

یہ شاعری کی اصل روح رواں ہے، اور اگر مُل صاحب کی رائے تسلیم کیجائے تو صرف اسی چیز کا نام شاعری ہے، شاعری درحقیقت مصوری ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ مادیات اور محسوسات کی تصویر کھینچنا اس قدر دشوار نہیں جس قدر غیر محسوسات اور غیر مادی اشیاء کا نقشہ اُتارنا مشکل ہے۔ ایک درخت کی تصویر کھینچنی ہو تو کسی قسم کی تخیل اور دیدہ وری کی ضرورت نہیں۔ ٹہنیاں، پھل، پھول، پتے سب سامنے ہیں

اور ہر شخص اُن کو محسوس کر سکتا ہی۔ مصوّر کا صرف یہ کمال ہی کہ ہر چیز کا پورا نقشہ کھینچ دے۔ لیکن رنج۔ غم۔ جوش۔ محبت۔ غیظ۔ بیقراری۔ بیتابی۔ مسرت۔ خوشی محسوس اور مادّی چیزین نہیں ہین۔ آنکھ ان کو محسوس نہیں کر سکتی البتہ دل پر اُن کا اثر ہوتا ہی۔ لیکن یہ اثر سب پر یکسان نہیں ہوتا۔ اس لیے اُن کی ہو بہو اور اصلی تصویر اُتارنا مشکل ہی،

میر انیس کا اصلی جوہر یہین آکر کھلتا ہی، اور یہین ان کی شاعری کی حد انکے ہمعصرون سے بالکل الگ ہو جاتی ہی۔ انسانی جذبات کی سیکڑون قسمین ہین۔ اور پھر ہر ایک کے مختلف مراتب اور مدارج ہین۔ مثلاً جذبات انسانی کی ایک قسم محبت ہی لیکن محبت کے بھی مختلف اقسام اور مدارج ہین۔ باپ بیٹے کی محبت۔ بھائی بھائی کی محبت۔ یار آشنا کی محبت۔ آقا اور غلام کی محبت وغیرہ وغیرہ میر انیس کے مرثیون مین نہایت کثرت سے اِن جذبات، اور اُن کے مختلف مدارج کا ذکر ہی۔ لیکن جس جگہ جس چیز کو لیا ہی اُس کے کمال کے ساتھ اُسکی تصویر کھینچی ہی کہ اسکا پورا نقشہ آنکھون کے سامنے پھر جاتا ہی۔

مثال ۱۔ حضرت امام علیہ السلام نے مدینہ سے جب سفر کیا تو تمام کنبہ ساتھ تھا۔ لیکن حضرت صغرا، چونکہ بیمار تھین، اس لیے اُن کو ساتھ نہین لیا ہی۔ رخصت کے وقت جب گھر مین تشریف لائے تو چاہتے ہین کہ صُغرا پر یہ راز ظاہر نہ ہونے پائے لیکن یہ راز کب چھپ سکتا تھا۔ بہرحال، حضرت امام حسینؑ خود صُغرا سے رخصت ہونے کے لیے اُن کے پاس تشریف لے گئے صُغرا کو اصرار ہی کہ مین تنہا نہین رہ سکتی، حضرت، سمجھاتے ہین کہ تم اس بیماری کی حالت مین کیونکر چل سکتی ہو۔ دہ نہین مانتین اسوقت باپ۔ بیٹی۔ مان بھائی۔ بہنون، پر محبت کا جو اثر ہی، اور جسطرح اُس کا اظہار ہوا ہی اُس کی تصویر اِس طرح کھینچی ہی، ؎

یہ کہتی تھی زینب کہ پکارے شہ عادل — تیار ہیں دروازے پہ سب ہودج و محمل
طے شام تلک ہوگی کہیں آج کی منزل — رخصت کرو لوگوں کو بس اب ذی حاصل
چلتی ہے ہوا سرد ابھی وقت سحر ہے
بچے کئی ہمراہ ہیں گرمی کا سفر ہے

رخصت کرو ان کو کہ جو ہیں ملنے کو آئے — کہدو کوئی گہوارۂ اصغر کو بھی لائے
نادان سکینہ کہیں آنسو نہ بہائے — جانے کی خبر ہی نہ صغرا کہیں پائے
ڈر ہے کہیں گھبرا کے دم اسکا نہ نکل جائے
باتیں کرو ایسی کہ وہ بیمار بہل جائے

سنکر یہ سخن بانوے ناشاد پکاری — میں لٹتی ہوں کیسا سفر اور کیسی سواری
غش ہو گئی ہے فاطمہ صغرا مری پیاری — یہ کس کے لیے کرتے ہیں سب گریہ و زاری
اب کس پہ میں اس صاحب آزار کو چھوڑوں
اس حال میں کس طرح سے بیمار کو چھوڑوں

ہاں ہوں میں کلیجہ نہیں سینہ میں سنبھلتا — صاحب کئے لکو ہر کوئی ہاتھوں سے ملتا
میں تو اسے لے چلتی پہ کچھ بس نہیں چلتا — رہ جاتیں جو بہنیں بھی تو دم اس کا بہلتا
دروازے پہ تیار سواری تو کھڑی ہے
پر اب تو مجھے جان کی صغرا کی پڑی ہے

چلاتی تھیں گھبرا کے بہن آنکھ تو کھولو — کہتی تھی سکینہ کہ ذرا منھ سے تو بولو!
ہم جاتے ہیں تم اٹھ کے بغلگیر تو ہو لو — چھاتی سے لگو باپ کی دل کھول کے رو لو
تم جن کی ہو شیدا وہ برادر نہ ملے گا
پھر گھر میں جو ڈھونڈھو گی تو اکبر نہ ملے گا

ہشیار ہو کیا صبح سے بیہوش ہو خواہر ۔ اصغر کو کرو پیار کلیجے سے لگا کر
چھاتی سے لگو اٹھ کے کھڑی روتی ہیں مادر ۔ ہم رٹتے ہیں دیکھو تو ذرا آنکھ اٹھا کر

افسوس اسی طور سے غفلت میں رہوگی
کیا آخری بابا کی زیارت نہ کروگی

سن کر یہ سخن شاہ کے آنسو نکل آئے ۔ بیمار کے نزدیک گئے سر کو جھکائے
منھ دیکھ کے بانو کا سخن لب پہ یہ لائے ۔ کیا ضعف و نقاہت ہے خدا اسکو بچائے

جس صاحب آزار کا یہ حال ہو گھر میں
دانستہ میں کیونکر اسے لیجاؤں سفر میں

کہکر یہ سخن بیٹھ گئے سید خوشخو ۔ اور سورۂ الحمد پڑھا تھام کے بازو
بیمار نے پائی گل زہرا کی جو خوشبو ۔ آنکھوں کو تو کھولا پہ ٹپکنے لگے آنسو

ماں سے کہا مجھ میں جو حواس آئے ہیں اماں
کیا میرے مسیحا مرے پاس آئے ہیں اماں

ماں نے کہا ہاں ہاں یہی آئے ہیں مری جاں ۔ جو کہنا ہے کہہ لو کہ یہاں اور ہے ساماں
دیکھو تو ادھر روتے ہیں بی بی شہ ذیشان ۔ صغرا نے کہا انکی محبت کے میں قربان

وہ کون ساماں ہے جو یوں روتے ہیں بابا
کھلکر کہو کیا مجھ سے جدا ہوتے ہیں بابا

یہ گھر کا سب اسباب گیا کس لیے باہر ۔ بستر ہے نہ ہے مسند فرزند پیمبر
دالان سے کیا ہو گیا گہوارۂ اصغر ۔ اجڑا ہوا لوگو نظر آتا ہے مجھے گھر

کیا منھ سے تو بولو مرا دم گھٹتا ہے اماں
کیا سبط پیمبر سے وطن چھٹتا ہے اماں

شبیر کا منھ تکنے لگی بانوے مغموم — صغرا کے لیے رونے لگیں زینب و کلثوم
بیٹی سے یہ فرمانے لگے سید مظلوم — پردہ رہا اب کیا تمھیں خود ہو گیا معلوم
تم چھٹتی ہو اس واسطے سب روتے ہیں صغرا
ہم آج سے آوارہ وطن ہوتے ہیں صغرا

اب شہر میں اک دم بھی ٹھہرنا مجھے دشوار — میں پا بہ رکاب اور ہو تم صاحب آزار
پھر آتا ہے وہ گھر میں سفر میں جو ہو بیمار — تکلیف تمھیں دوں یہ مناسب نہیں زنہار
غربت میں بشر کے لیے سو طرح کا ڈر ہے
میرا تو سفر رنج و مصیبت کا سفر ہے

لو چلتی ہے خاک اڑتی ہے گرمی کے ہیں ایام — جنگل میں نہ راحت نہ کہیں راہ میں آرام
بستی میں کہیں صبح تو جنگل میں کہیں شام — دریا کہیں حائل کہیں پانی کا نہیں نام
صحت میں گوارا ہے جو تکلیف گذر جائے
اس طرح کا بیمار نہ مرتا ہو تو مر جائے

صغرا نے کہا کھانے سے خود ہے مجھے انکار — پانی جو کہیں راہ میں مانگوں تو گنہگار
کچھ بھوک کا شکوہ نہیں کرنے کی یہ بیمار — ہر مد فقط آپ کا ہے شربت دیدار
گرمی میں بھی راحت سے گذر جائے گی بابا
آئے گا پسینہ تپ اتر جائے گی بابا

کیا تاب اگر منھ سے کہوں درد ہے سر میں — اُف تک نہ کروں بھڑکے اگر آگ جگر میں
بھولے سے بھی شب کو نہ کراہوں گی سفر میں — قربان گئی چھوڑ نہ جاؤ مجھے گھر میں
ہو جانا خفا راہ میں گر روئے گی صغرا
ہاں نیند کب آتی ہے جو اب سوئے گی صغرا

وہ بات نہ ہوگی کہ جو بےچین ہوں مادر　　ہر صبح میں پی لوں گی دوا آپ بنا کر
دن بھر مری گودی میں رہیں گے علی اصغر　　لونڈی ہوں سکینہ کی نہ سمجھو مجھے دختر
میں یہ نہیں کہتی کہ عماری میں بٹھا دو
بابا مجھے نضّہ کی سواری میں بٹھا دو

شہ بولے کہ واقف ہے مرے حال سے اللہ　　میں کہہ نہیں سکتا تجھے درپیش ہے جو راہ
کھل جائے گا یہ راز بھی گو تم نہیں آگاہ　　ایسا بھی کوئی ہے جسے بیٹی کی نہ ہو چاہ
ناچار یہ فرقت کا الم سہتا ہوں صغرا
بے مصلحت حق ہی جو کہتا ہوں صغرا

اے نور بصر آنکھوں پہ لیکر تجھے چلتا　　تو مجھ سے بہلتی مرا دل تجھ سے بہلتا
تپ ہے تجھے اور غم سے جگر ہے مرا جلتا　　یہ ضعف کہ دم تک نہیں سینے میں سنبھلتا
جز ہجر علاج اور کوئی ہو نہیں سکتا
دانستہ تمہیں ہاتھ سے میں کھو نہیں سکتا

منہ تکنے لگی ماں کا وہ بیمار بصد غم　　چتون سے عیاں تھا کہ چلیں آپ تو ہم بے
ماں کہتی تھی مختار ہیں بی بی شہ عالم　　میرے تو کلیجے پہ چھری چلتی ہے اس دم
وہ درد ہے جس درد سے چارا نہیں صغرا
تقدیر سے کچھ زور ہمارا نہیں صغرا

صغرا نے کہا کوئی کسی کا نہیں زنہار　　سب کی یہی مرضی ہے کہ مر جائے یہ بیمار
اللہ نہ وہ آنکھ کسی کی ہے نہ وہ پیار　　اک ہم ہیں کہ ہیں سب پہ فدا سب کے ہیں غمخوار
بیزار ہیں سب ایک بھی شفقت نہیں کرتا
سچ ہے کوئی مردے سے محبت نہیں کرتا

ہمشیر کے عاشق ہیں سلامت رہیں اکبر / اتنا نہ کہا مر گئی یا جیتی ہے خواہر
میں گھر میں تڑپتی ہوں وہ ہیں صبح سے باہر / وہ کیا کریں برگشتہ ہے اپنا ہی مقدر
پوچھا نہ کسی نے کہ وہ بیمار کدھر ہے
نہ بھائیوں کو دھیان نہ بہنوں کو خبر ہے

کیا اُن کو پڑی تھی جو وہ غم کھانے کو آتے / میں کون ہوں جو صورت مجھے دکھلانے کو آتے
ہوتی جو غرض چھاتی سے لپٹانے کو آتے / زلفیں جو اُلجھتیں تو سلجھانے کو آتے
کل تک تو مرے حال پریشاں پہ نظر تھی
تقدیر کے اس پیچ کی مجھ کو نہ خبر تھی

مانوس سکینہؑ سے ہیں عباسؑ دلاور / میں کون ہوں جو میری خبر پوچھتے آ کر
سرسبز رہے خلق میں نوبادۂ شبرؑ / شادی میں بلائیں مجھے یہ بھی نہیں باور
بے دولہا بنے منہ کو چھپاتے ہیں ابھی سے
میں جیتی ہوں اور آنکھ چُراتے ہیں ابھی سے

کس سے کہوں اس درد کو میں بیکس و مجبور / بہنیں بھی الگ مجھ سے ہیں بھائی بھی ہیں دور
اماں کا سخن یہ ہے کہ بیٹی میں ہوں مجبور / ہمراہی بیمار کسی کو نہیں منظور
دنیا سے سفر رنج و مصیبت میں لکھا تھا
تنہائی کا مرنا مری قسمت میں لکھا تھا

سب بیبیاں رونے لگیں سن سن کے یہ تقریر / چھاتی سے لگا کر اُسے کہنے لگے شبیرؑ
لو صبر کرو کوچ میں اب ہوتی ہے تاخیر / منہ دیکھ کے چپ ہو گئی وہ بیکس و دلگیر
نزدیک تھا دل جبر سے پہلو سے نکل آئے
اچھا تو کہا منہ سے پر آنسو نکل آئے

بانو کو اشارہ کیا حضرت نے کہ جاؤ
آئے علی اکبر تو کہا شاہ نے آؤ
اکبر کو بلاؤ علی اصغر کو بھی لاؤ
دکھیا ہے بہن تم سے گلے اس کو لگاؤ
چلتے ہوئے جی بھر کے ذرا پیار تو کر لو
لینے انھیں کب آؤ گے اقرار تو کر لو

پاس آن کے اکبر نے یہ کی پیار کی تقریر
چلانے لگی چھاتی پہ منہ رکھ کے وہ دلگیر
کیا مجھ سے خفا ہو گئیں صغرا مری تقصیر
محبوب برادر ترے قربان یہ ہمشیر
صدقے ترے سر پر سے اتارے تجھے کوئی
بل کھائی ہوئی زلفوں پہ ڈالے مجھے کوئی

رخساروں پہ سبزے کے نکلنے کے میں صدقے
افسوس سے ان ہاتھوں کے ملنے کے میں صدقے
تلوار لیے شان سے چلنے کے میں صدقے
کیوں روتے ہو اشک آنکھوں کے ڈھلنے کے میں صدقے
جلد آن کے ہنا کی خبر لیجیو بھائی
بے میرے کہیں بیاہ نہ کر لیجیو بھائی

پیارے مرے بھیا مرے مہ رو علی اکبر
یاد آئے گی یہ جسم کی خوشبو علی اکبر
چھپ جائیں گے آنکھوں سے یہ گیسو علی اکبر
ڈھونڈھیں گی یہ آنکھیں تمھیں ہر سو علی اکبر
دل سینے میں کیونکر تہ و بالا نہ رہے گا
جب چاند چھپے گا تو اجالا نہ رہے گا

کیا گذرے گی جب گھر سے چلے جاؤ گے بھائی
تشریف خدا جانے کب لاؤ گے بھائی
کیسے مجھے ہر بات میں یاد آؤ گے بھائی
کی دیر تو جیتا نہیں پاؤ گے بھائی
کیا دم کا بھروسہ ہے چراغ سحری ہیں
تم آج مسافر ہو تو ہم کل سفری ہیں

ہاں سچ ہے کہ بیمار کا بہتر نہیں جانا
بھیّا جواب آنا تو مری قبر پہ آنا
صحت سے جو زینبا نہیں کہاں میرا ٹھکانا
ہم گور کی منزل کی طرف ہونگے روانا
کیا لطف کسی کو نہیں گر چاہ ہماری
وہ راہ تمھاری ہے تو یہ راہ ہماری

ماں بولی یہ کیا کہتی ہے صغرا ترے قرباں
بے کس مری بچی تری اللہ نگہباں
گھبرا کے نہ اب تن سے نکلجا مری جاں
صحت ہو تجھے میری دعا ہی ہے ہر آں
کیا بھائی جدا بہنوں سے ہوتے نہیں بیٹا
کنبہ کے لیے جان کو کھوتے نہیں بیٹا

میں صدقے گئی بس کر مگر یہ و زاری
وہ کانپتے ہاتھوں کو اٹھا کر یہ پکاری
اصغر مرا روتا ہے صدا سن کے تمھاری
آ آ مرے بچے تجھے سے مسافر ترے واری
چھٹتی ہے یہ بیمار بہن جان گئے تم
اصغر مری آواز کو پہچان گئے تم

تم جانتے ہو ساتھ اور بہن جا نہیں سکتی
جو دل میں ہے لب پر وہ سخن لا نہیں سکتی
تب ہے تمھیں چھاتی سے میں لپٹا نہیں سکتی
رکھ لوں تمھیں اماں کو بھی سمجھا نہیں سکتی
بیکس ہوں مرا کوئی مددگار نہیں ہے
تم ہو سو تمھیں طاقت گفتار نہیں ہے

معصوم نے جس دم یہ سنی درد کی گفتار
لے لے کے بلائیں یہ لگی کہنے وہ بیمار
صغرا کی طرف ہاتھوں کو لٹکا دیا اک بار
جھک جھک کے دکھاتے ہو مجھے آخری دیدار
دنیا سے کوئی دن میں گذر جائیگی صغرا
تم بھی یہ سمجھتے ہو کہ مر جائے گی صغرا

مثال ۲ - انہی واقعات کو ایک اور موقع پر لکھا ہی، سه

باتین یہ ابھی تھین کہ شہ بحر و بر آئے — دیکھا رخ ہمشیر کو اور اشک بہائے
مان بیٹھی تھی صغرا کو جو چھاتی سے لگائے — روتے ہوئے تشریف شہ دین وہین لائے
بیٹی شہ ذی جاہ کی تعظیم کو اٹھی
بستر سے عصا تھام کے تسلیم کو اٹھی

جلد اُسکے قریب آکے یہ کہنے لگے حضرت — ٹھوکر ابھی اُٹھنے کی تم مین نہین طاقت
اک ضعف کی تصویر ہو ایسی ہی نقاہت — کیون رات کو کیسی رہی بی بی کی طبیعت
تپ مین جو کراہی تھین تو گھبرائے تھے صغرا
بیہوش تھین تم شب کو بھی ہم آئے تھے صغرا

صحت دے تمھین حق یہی بابا کی دعا ہی — اولاد کو راحت ہو تو جینے کا مزا ہے
اب بادیہ پیمائی ہی ایذا ہی بلا ہے — کیا جانیے شبیر کی تقدیر مین کیا ہی
دل جلتا ہی جب تپ مین تمھین پاتا ہون صغرا
اس رنج مین مین اور گھلا جاتا ہون صغرا

ایسا سفر صعب اور اس طرح کا بیمار — ڈر ہی کہ نہ بڑھ جائے کہین راہ مین آزار
کیا زور کسی آنکھون سے تو ہمت ہی نمودار — سب زرد ہی لرزان حرارت سے تن زار
چہرے پہ کسی روز بحالی نہین پاتا
شدت سے کبھی نبض کو خالی نہین پاتا

دم چڑھتا ہی بستر سے اٹھاتی ہو اگر سر — بی بی کہو محمل مین چڑھا جائے گا کیونکر
گھر مین تمھین پانی کی بھڑک رہتی ہی دن بھر — پھر کیا ہو کسی دن جو نہ پانی ہو میسر
تم جانے کے قابل نہین مین رہ نہین سکتا ہو
شب سے ہی وہ تشویش کہ کچھ کہ نہین سکتا

گھر میں تمھین چھوڑون یہ نہین دل کو گوارا — لیجاؤن تو بچنا نہین ممکن ہے تمھارا
بچون مین کوئی تم سے زیادہ نہین پیارا — مجبور ہون بے ہجر نہین اب کوئی چارا
فرقت مین سدا نالہ و فریاد کرون گا
اُترون گا جو منزل پہ تمھین یاد کرون گا

صغرا نے کہا آپ کی اُلفت کے مین قربان — پھر کس کو ہو گر آپ کو لونڈی کا ہو دھیان
صدقے گئی صحت کا بھی ہو جائیگا سامان — مولا کی توجہ ہی ہے اک درد کا درمان
جس پر نظرِ لطف مسیحِ دوسرا ہو
برسون کا ہو بیمار تو اک دم مین شفا ہو

قربان گئی اب تو بہت کم ہے نقاہت — تپ کی بھی ہے شدت مین کمی اور خفت
بستر سے مین خود اُٹھ کے ٹہلتی بھی ہون حضرت — پانی کی بھی خواہش ہے غذا کی بھی ہے رغبت
حضرت کی دُعا سے مجھے صحت کا یقین ہے
اب تو مرے مُنھ کا بھی مزا تلخ نہین ہے

کیون روتے ہو بابا یہ تردد کی نہین جا — سب سہل ہے کچھ مجھکو نہین ہونے کی ایذا
پہلے سے کہے دیتی ہون اے سیدِ والا — مین خانۂ ویران مین نہین رہنے کی تنہا
اب روح مرے جسم مین گھبراتی ہے بابا
ان باتون سے کچھ بوئے فراق آتی ہے بابا

مر جاؤن گی بچھڑی جو مسیحِ دوسرا سے — صحت مجھے ہو جائیگی حضرت کی دعا سے
کٹ جائے گا اندوہِ سفر فضلِ خدا سے — بیماری مین یان آئے گی خشکی کی ہوا سے
سب ساتھ ہین جب روؤن گی نہ غم کھاؤن گی بابا
بیٹھی ہوئی محمل مین چلی جاؤن گی بابا

شہ نے کہا تم حالی سے میرے نہیں آگاہ ۔ مجبور نکلتا ہوں میں اس شہر سے واللہ
آفت کا ہے بی بی یہ سفر خوف کی ہے راہ ۔ بیمار ہو کس طرح سے لیجاؤں تمھیں آہ
آزار رسیدہ ہوں گرفتار بلا ہوں
گھر چھوڑ کے جلادوں کی سرحد میں چلا ہوں

وہ صعب پہاڑوں کا سفر اور وہ کڑی کوس ۔ دن رات مسافر پہ کبھی دھوپ کبھی اوس
اک ایک قدم رنج والم حسرت و افسوس ۔ ہوتا نہیں جز خار کوئی آکے قدمبوس
آرام کہیں راہ میں جانی نہیں ملتا
جنگل ہیں وہ پرہول کہ پانی نہیں ملتا

تھوڑے ہی دنوں ہوئیگی کنبے سے جدائی ۔ پردیس سے آکر تمھیں لیجائیں گے بھائی
کی مجھ سے نہ گر کوفے کی خلقت نے برائی ۔ ممکن ہے کہ میں اور نہ کروں وعدہ وفائی
خوش ہونگا تم اب دل پہ اگر جبر کرو گی
مرجاؤں گا جب میں تو نہ کیا صبر کرو گی

ثابت ہوا صغرا یہ کہ اب ہم رہی گھر میں ۔ بس پھر گئی تنہائی کی تصویر نظر میں
اک جوش ہوا آنسوؤں کا دیدۂ تر میں ۔ صدمے سے کھٹک درد کی پیدا ہوئی سر میں
شکل اپنی شب ہجر جو دکھلا گئی اُس کو
کانپا یہ تن زار کہ تپ آگئی اُس کو

تھرائی ہوئی اٹھ کے گری شہ کے قدم پر ۔ کی عرض کہ مرجاؤں گی یا سبط پیمبر
تنہائی میں بابا مرا دل بہلے گا کیونکر ۔ سب بیٹیاں ہیں کیا میں نہیں آپکی دختر
بے آپ کے اس گھر میں نہ یاشاہ رہونگی
اچھا میں کنیزوں ہی کے ہمراہ رہونگی

سب رونے لگے سُن کے یہ بیمار کی تقریر — چلائی سکینہ کہ میں صدقے مری ہمشیر
گھبرا کے یہ فرمانے لگے حضرت شبیر — تم بیٹی کو سمجھا دو کہ ہے بانوے دلگیر
کمسن ہیں مسافر مجھے تشویش بڑی ہے
دن چڑھتا ہے اور آج کی منزل بھی کڑی ہے

یہ سُنتے ہی سب ماں کی تو چھاتی اُمنڈ آئی — چلائی وہ ناشاد کہے ہے مری جائی
زینب نے کہا گھر سے نکلتا ہے یہ بھائی — مر جانے سے کچھ کم نہیں صغرا کی جدائی
گھر لٹتا ہے کس طرح قیامت نہ بپا ہو
پہلا ہے یہ غم آگے خدا جانیے کیا ہو

آغاز سفر میں تو یہ ماتم ہے یہ کہرام — کیا دیکھیں دکھاتا ہے اس آغاز کا انجام
جنگل ہو کہ بستی ہو کہاں راحت و آرام — ماں روئے گی بیٹی سے بچھڑ کر سحر و شام
بستی بھی ہے جنگل جو یگانہ ہو بر میں
بھولے گی؟ وہ چھوڑینگے اکیلا جسے گھر میں

صغرا نے کہا آپ کی باتوں کے میں قرباں — تم جان بچا لو کہ میں بندی ہوں پھوپھی جاں
بیٹی ہو علیؑ کی مری مشکل کرو آساں — جیتی رہی تنہا تو نہ بھولے گی یہ احساں
کچھ بات بجز گریہ و زاری نہیں کرتیں
اماں تو سفارش بھی ہماری نہیں کرتیں

بیماری ہیں جو دو بیٹیاں وہ جائینگی ہمراہ — کیا انس کہ میں گور کنارے بھی تو ہوں آہ
بابا کو نہ اماں کو نہ بہنوں کو مری چاہ — سب جیتے رہیں خیر ہمارا بھی ہے اللہ
بھولے سے نہ اب خاطر ناشاد کریں گے
میں قبر میں جب ہوں گی تو سب یاد کریں گے

کیا خلق مین لوگو کوئی ہوتا نہین بیمار　　ہر کون سی تقصیر کہ سب ہو گئے بیزار
زندہ ہون یہ مرنے کی طرح ہو گئی دشوار　　کیون بھاگتے مین سب مجھے ہر کونسا آزار

حیرت مین ہون باعث مجھے کھلتا نہین اسکا
وہ آنکھ چرا لیتا ہر مُنھ تکتی ہون جس کا

تب کیا مجھے آئی کہ پیام اجل آیا　　ہر ہر مری راحت کی بنا مین خلل آیا
چھوڑا مجھے سب نے جو سفر کا محل آیا　　کیا خوب مرے نخل تمنا مین پھل آیا

دل سخت کیا ماں نے مجھے غم ہر اسی کا
سچ ہر کہ زمانہ مین نہین کوئی کسی کا

وہ چاہنے والا ہر مصیبت مین جو کام آئے　　مین سب کی ہوئی اور کوئی میرا نہوا ہائے
اس راہ مین ہمراہ کنیزین تو ہون ای وائے　　کہنے کی جو ہو چاہنے والی وہی رہجائے

بیماری فرقت مین دوا خوب ہوئی ہے
تجویز مرے واسطے کیا خوب ہوئی ہے

تنہائی مین رہنے سے اُتر جائیگی یہ تپ　　ہان درد بھی سر مین مرے ہوئیگا نہین اب
تڑپون گی تو جائیگی یہ اعضا شکنی سب　　بہتر یہی ترکیب ہے نسخہ یہی انسب

کم ہوگی حرارت الم و رنج و محن مین
غم کھانے سے آجائیگی طاقت مری تن مین

تنہائی مین شدت بھی نہو گی خفقان کی　　بیمار کا دل بہلے گا وحشت سے مکان کی
تڑپون گی نہ فرقت مین امام دو جہان کی　　شفقت نہ مجھے یاد آئیگی بہنون کی نہ ماں کی

فرقت مین مری طرح جگر کس سے سنبھلتا
مین گھر مین نہوتی تو یہ گھر کس سے سنبھلتا

سب چاہنے والے ہیں کریں کس کی شکایت
چھوٹا ہمیں بس دیکھ لی اماں کی محبت
بابا کی یہ تقریر ہے دلہن کی یہ نوبت
بولیں یہ پھوپھی جان بھی کچھ واہ ری قسمت
فرقت کا الم میرے کلیجہ کو چھری ہے
سب اچھے ہیں لوگو مری تقدیر بری ہے

عاشق مرے شوہر ہیں بھیا کے ہیں واری
قاسم کو غرض کیا جو سنیں گریہ و زاری
دو دن سے خبر بھی نہیں لی آ کے ہماری
میں کون؟ سکینہ ہے چچا جان کو پیاری
اللہ تو ہے گر کوئی غمخوار نہیں ہے
مٹی مری کچھ قبر کو دشوار نہیں ہے

اُس وقت محبت مری ہو جائیگی خالی
لو مر گئی کنبے کی جو تھی چاہنے والی
جب راہ میں خط پڑھ کے کہینگے شہ عالی
آباد جو حجرہ تھا وہ اب ہو گیا خالی
قسمت نے سنائی خبر مرگ سفر میں
وہ قبر میں سوئی جسے چھوڑ آئے تھے گھر میں

پھر ہم نہیں ملنے کے کوئی لاکھ ہو جویا
عالم سے وہ بیگانہ ہے جو قبر میں سویا
سب رو کے کہیں گے کہ اُسے ہاتھ سے کھویا
کیا نفع اُسے کوئی کڑھا یا کوئی رویا
پرسے کے لیے جمع ہوئے لوگ تو پھر کیا
پردیس میں کنبے نے رکھا سوگ تو پھر کیا

یاں ذکر یہ تھا آئے جو روتے ہوئے اکبر
چلائی بہن بھائی کی چھاتی سے لپٹ کر
سُرخ آنکھیں تھیں اور زرد تھا غم سے رخ انور
اِس سینے کے ان ہاتھوں کے قربان یہ خواہر
فریاد ہے بے موت بہن مرتی ہے بھائی
تقدیر ہمیں تم سے جدا کرتی ہے بھائی

بھیّا مری تنہائی پہ آنسو نہ بہاؤ — وہ دن ہو کہ پھر خیر سے اس شہر میں آؤ
ہر چند یہ مشکل ہے کہ جیتا ہمیں پاؤ — صدقے گئی پھر آنے کا وعدہ کیے جاؤ
عرصہ ہو تو خط لکھ کے طلب کیجیو بھائی
اب بیاہ میں مجھکو نہ بھلا دیجیو بھائی

رونے کا اُدھر غل تھا کہ فضہ یہ پکاری — تیار ہے ناموس محمدؐ کی سواری
دروازے کے نزدیک ہے زینبؑ کی عماری — کیا دیر ہے اب آئیے یداللہ کی پیاری
ہر بار زنانوں کے قریب آتے ہیں عباسؑ
اب جلد سواری ہو یہ فرماتے ہیں عباسؑ

شبیر نے رو کر کہا لو جاتے ہیں صغرا — جلد آتے ہیں یا خود تمھیں بلواتے ہیں صغرا
ہم سب تری تنہائی کا غم کھاتے ہیں صغرا — جان اپنی نہ کھو، تمھیں سمجھاتے ہیں صغرا
قربان پدر آب و غذا ترک نہ کیجو
بڑھ جائیگا آزار دوا ترک نہ کیجو

بیٹی سے یہ فرما کے چلے قبلۂ عالم — ناموس محمدؐ بھی چلے ساتھ بصد غم
صغرا بھی چلی جاتی تھی روتی ہوئی باہم — ہمسائیاں باندھے ہوئے تھیں حلقۂ ماتم
راحت تھی جو سب کو شہِ ذیجاہ کے دم سے
ایک بستی تھی ایک بستی [?] تھی قدم سے

غل تھا شہِ ابرار خدا حافظ و ناصر — رانڈوں کے مددگار خدا حافظ و ناصر
اے خلق کے سردار خدا حافظ و ناصر — محتاجوں کے غمخوار خدا حافظ و ناصر
دکھ فاقوں کی غربت کے الم کس سے کہینگے
مشکل کوئی اب ہوگی تو ہم کس سے کہینگے

صغرا کو نقاہت سے نہ تھی طاقت رفتار — اُٹھی کئی بار اور گری در پہ کئی بار
جس ناقے پہ تھی بانوئے ناشاد دل افگار — اُس ناقے کے پاس آکے یہ چلائی وہ بیمار
قربان گئی آخری دیدار دکھا دو
اماں مجھے اصغر کو پھر اک بار دکھا دو

مضطر ہوئی سُنکر یہ سخن بانوئے بے پر — پردے سے جگر بند کا مُنھ کر دیا باہر
بیٹی سے کہا دست پسر ماتھے پہ رکھ کر — لو آخری تسلیم بجا لاتے ہین اصغر
مُنھ زرد ہے رخساروں پہ آنسو بھی بہے ہین
یہ نرگسی آنکھوں سے تمھیں دیکھ رہے ہین

تھراتے ہوئے ہاتھ اُٹھا کر وہ پکاری — اِس ہاتھ کے اِس چاند سے ماتھے کے مین واری
آخر کوئی دن مین ہے بس اب موت ہماری — بھیا نہین جینے کی مین فرقت مین تمھاری
جب آکے پھر اِس جھولے کو آباد کروگے
تم بھی مری گودی کو بہت یاد کروگے

عباس سے شہ نے کہا اے ثانی حیدر — مر جائے گی اب فاطمہ صغرا مری دختر
حمالون سے کہدو کہ بڑھین اونٹون کو لیکر — اسوارون کے ساتھ رہین قاسم و اکبر
احباب جو روتے ہین تو غم کھاتے ہین ہم بھی
شبیر کے ناکے پہ تھمین آتے ہین ہم بھی

مثال ۳ - حضرت علی اکبر کی رخصت اور باپ ماں کی حالت سے

مومنو مرنے کو ہمشکل نبی جاتا ہے — دولت بانوئے بیکس پہ زوال آتا ہے
کیا الم ہے کہ جگر سینے مین تھراتا ہے — داغ بیٹے کا فلک باپ کو دکھلاتا ہے
ماں تڑپتی ہے شہ جن و بشر روتے ہین
کس جوان بیٹے سے ماں باپ جدا ہوتے ہین

بیٹا کیا جاتا ہے ہوتا ہے بھرا گھر برباد
کرتے ہیں اپنی جوانی علی اکبر برباد
ہوتی ہے دولت فرزند پیمبر برباد
جان کھوتا ہے پدر ہوتی ہے مادر برباد
داغ اولاد ہے ہاں صبر کا مقدور نہیں
پہلے فرزند سے مر جائیں تو کچھ دور نہیں

ایسا بیٹا جسے اٹھارہ برس پالا ہے
تفرقہ چرخ ستمگر نے عجب ڈالا ہے
گھر سے جاتا ہے وہی گھر کا جو اجیالا ہے
کیا کریں صبر کلیجہ بھی تہ و بالا ہے
دل کی بیتابی ہے اک آن سوا ہوتی ہے
روح ماں باپ کے قالب سے جدا ہوتی ہے

داغ اولاد نہیں آہ اٹھایا جاتا
درد وہ ہے کہ زبان پر نہیں لایا جاتا
ایسا بیٹا نہیں ہاتھوں سے گنوایا جاتا
زخم وہ ہے کہ جگر پر نہیں کھایا جاتا
داغ فرزند حسین ابن علی سے پوچھو
نوجوان بیٹے کا غم باپ کے جی سے پوچھو

سوچیں سب صاحب اولاد کہ کیا مشکل ہے
پہلے فرزند سے بابا کا جگر گھائل ہے
تا کجا صبر کہ ماں باپ کا آخر دل ہے
زخم اکبر نے نہیں کھائے پہ ماں بسمل ہے
بار جب سینے سے برچھی کی انی ہووے گی
کیا غضب ہووے گا کیا سینہ زنی ہووے گی

باندھتا ہے وہ کمر اور کمر شاہ ہے خم
شان سے شانے پہ رکھتا ہے کمان ضیغم
تیغ سجتا ہے پسر باپ کے دم میں نہیں دم
تیر غم لگتے ہیں مادر کے جگر پہ پیہم
تن پہ چار آئینہ سجنے کا وہاں ساماں ہے
چار پارہ سے جگر ماں کا پدر حیران ہے

واقعی دولتِ اولاد عجب دولت ہے
نوجوان بیٹے کا مرنا بھی بڑی آفت ہے
اُسکو راحت ہو تو ماں باپ کو بھی راحت ہے
زندگی تلخ ہے پھر جینے کی کیا لذت ہے

اُس کا دل دیکھو چھُٹے باپ سے جسکا بیٹا
اور بیٹا بھی تو ہمشکل نبی سا بیٹا

ہین مسین بھیگتی اٹھارہ برس کا ہے سن
رنج مین کاٹی ہین دُکھ درد کی راتین گن گن
منتین مانی ہین مادر نے مرادون کے ہین دن
پالنے والی کو چین آئیگا کیونکر اُس بن

ماں کو حسرت ہے دُلھن بیاہ کے گھر لائیگی
فکر یان ہین جوانی مین ہے مرجانے کی

ماں کو منظور ہو جائے نہ کہین نور نظر
باپ کو غم ہے کہ چھٹتا ہے برابر کا پسر
اور فرزند کو درپیش ہے دُنیا سے سفر
سیدھی ہو سکتی نہین خم ہوئی جاتی ہے کمر

بھائی کے واسطے قاسم کی دُلھن روتی ہے
پکڑے دامان قبا چھوٹی بہن روتی ہے

رن کو جانیکے لیے بانو کے جائے ہین کھڑے
ہاتھ جوڑے ہوے گردن کو جھکائے ہین کھڑے
شوق ہے جنگ کا ہتھیار لگائے ہین کھڑے
ماں سے مرنیکے لیے آنکھ چُرائے ہین کھڑے

شاہ خاموش ہین پر بول نہین سکتے ہین
کبھی بانو کا کبھی بیٹے کا مُنھ تکتے ہین

دل سے فرماتے ہین یہ دیکھیے اب ہوتا ہے کیا
صبر کی جا نہین ہوتا ہے پسر ماں سے جدا
بانو دیتی ہے کہ بیٹے کو نہین دیتی رضا
اب خدا خیر کرے ہے یہی مرجانے کی جا

جسم کانپے گا قلق ہوگا غش آجائے گا
حرف رخصت کا نہ بانو سے سنا جائے گا

بانو کہتی ہے کہ کیا کہتے ہیں اکبر یا شاہ
دیکھتی ہوں میں کہ حضرت کی بھی حالت ہے تباہ
ان کے جو دل میں ہے کچھ آپ ہیں اُس سے آگاہ
ماجرا کیا ہے یہ کچھ مجھ سے تو کہیے للّٰہ

مُنھ سے کچھ کہتے نہیں پاس ادب کرتے ہیں
کون سی چیز ہے جو ماں سے طلب کرتے ہیں

شاہ فرماتے ہیں بانو سے کہ اے نیک نہاد
پوچھو اکبر سے کہیں گے جو کچھ اُنکی ہے مراد
از دل اقویٰ ہے ماں بیٹے کی بابا سے زیاد
حق نہ ماں باپ کو دکھلائے فراق اولاد

تھا مقدر میں کہ سب ہو ویں جدا ہم دیکھیں
اب بھی اُٹھ جائیں جہاں سے تو نہ یہ غم دیکھیں

سُن کے یہ بانو نے فرزند سے پوچھا رو رو
ہاتھ کیوں جوڑے ہو ان ہاتھوں کے ماں صدقے ہو
کیا کہا چاہتے ہو ماں سے تو اے لال کہو
کہا اکبر نے رضا مرنے کی اماں ہمیں دو

صبر فرماؤ کہ اب تم سے جدا ہوں گے ہم
دودھ بخشو ہمیں بابا پہ فدا ہوں گے ہم

یہ سخن سنتے ہی فرزند سے ماں ہو گئی زرد
مُردنی چھا گئی چہرے پہ اُٹھا دل میں درد
وہ بیاں آیا کہ چلا ہائے پسر ہے سر نبرد
دیکھ مُنھ بیٹے کا کہنے لگی بھر کر دم سرد

تم سے بچھڑوں گی تو زاری میں کدھر جاؤنگی
پھر نہ رخصت کا سخن کہنا کہ مر جاؤنگی

کہا اکبر نے کہ بہتر ہے نہ دیجیے رخصت
میرے بابا سے ہوئے بھائی بھتیجے رخصت
جیتے مرنے کو نہ جاویں گے نہ کیجے رخصت
مجکو بھی دیں یہ بیاں یہ تھا آپ سے لیجے رخصت

ماں سے فرزند کو تکرار کا یارا کیا ہے
تابع حکم ہیں ہم زور ہمارا کیا ہے

مدعا طلبی

سب نے قربان کیے زہرا کے پسر پر فرزند
کٹ گئی تیغوں سے کس کس کے جگر کے پیوند
میں نے چاہا تھا کہ ہو آپ کا بھی نام بلند
پر تعجب ہے کہ آئی نہ مری عرض پسند
آپ کہتے ہیں بچاؤ تو بچا دیں گے ہم
اپنے ہمچشموں کو پھر منہ نہ دکھا دیں گے ہم

جائے گا سوئے پسر تو نہ جلے گا غلام
کام بابا کے نہ آئے تو وطن سے کیا کام
خیمے کے لوٹنے کو آئے گا جب لشکر شام
قید ہم ہوں گے کہ لڑنے کا یہی ہے ہنگام
آبرو پاتے جو سر تیغ سے کٹواتے ہم
طوق و زنجیر کی ایذا سے بھی چھٹ جاتے ہم

آج جو مرتے تو داخل شہدا میں ہوتے
پائنتی باپ کے آرام سے رن میں سوتے
لاش پر کہتے ملک ہائے علیؑ کے پوتے
حشر تک ہم کو عزادار جہاں میں روتے
جو ہے منظور ہمیں آپ کو منظور نہیں
اب بھی فرماؤ تو میدان وغا دور نہیں

بولی ماں ہو گئے آزردہ میں واری بیٹا
گلہ آمیز یہ باتیں ہیں تمہاری بیٹا
باپ پیارا ہے تمہیں ماں نہیں پیاری بیٹا
دھیان اپنا ہے نہیں فکر ہماری بیٹا
پہلو بابا کا تو آباد کیا چاہتے ہو
پالنے والی کو برباد کیا چاہتے ہو

علی اکبر مری محنت کی طرف دھیان کرو
اماں واری مری بستی کو نہ ویران کرو
چھوڑ کر ماں کو نہ تم کوچ کا سامان کرو
پھر فدا ہو جیو پہلے مجھے قربان کرو
میرے جیتے نہ قدم گھر سے نکالو بیٹا
اپنی مادر کا جنازہ تو اٹھا لو بیٹا

ماں کی تقریر سے مایوس ہوئے جب اکبر
اشک آنکھوں سے بہے چاند سے رخساروں پر
رکھدی تلوار لگے کھولنے ہاتھوں سے کمر
بانو گھبرا گئی ٹکڑے ہوا زینب کا جگر
لے کے بیٹے کی بلائیں کہا کیوں روٹھتے ہو
لو نہ روکوں گی میں کاہے کو خفا ہوتے ہو

رو کے کہنے لگے بیٹے سے امام خوشخو
ہاں تو دیتی ہیں رضا مرنے کی آزردہ ہو
پھر کہا بانو سے اب مرنے کی رخصت انہیں دو
تھا مقدر میں یہی صبر کرو شکر کرو
یہ دعا مانگو کہ تڑپے نہ کلیجہ میرا
آزماتا ہے مرے صبر کو مولا میرا

تم نے اٹھارہ برس کھینچے ہیں گو رنج و تعب
بانو پر خواہش تقدیر سے ناچار ہیں سب
اس کا میں کون ہوں تم کون ہو جو مرضی رب
زور کیا؟ جسکی امانت تھی وہ کرتا ہے طلب
اب نہیں جینے کی عمر اتنی ہی یہ لائے تھے
خلق میں داغ دکھانے کو ہمیں آئے تھے

شہ نے سمجھایا تو بانو نے کہا یہ رو کر
کیوں کمر کھولتے ہو غصہ سے صدقے مادر
ماں سے چلتے ہوئے آزردہ نہ جاؤ اکبر
خیر جو مرضی ہے اچھا کرو دنیا سے سفر
اب تو راضی ہوئے مادر سے میں واری بیٹا
آگے آؤ کہ بلائیں لوں تمہاری بیٹا

سن کے ماں سے یہ سخن قدموں پہ فرزند گرا
عرض کی آپ سے دکھوں مرا تقدیر ہے کیا
ماں نے چھاتی سے لگا کر کہا صدقے بیٹا
جاؤ رخصت بھی کیا دودھ بھی تم کو بخشا
تم نہ کھانا کہ یہ ماں رو رو کے مر جائیگی
ساتھ دو باپ کا ماں کی بھی گذر جائیگی

کھلکے یہ روئی جوان بیٹے کو چھاتی سے لگا
خاک پر سیدِ سجّاد نے سر دے ٹپکا
غل ہوا بانو نے دی مرنے کی اکبر کو رضا
رو کے چلّانے لگیں بہنیں کہ ہے ہے بھیّا

کچھ زبان سے علی اصغرؑ جو نہ کہہ سکتا تھا
جھولے سے رو رو کے بھائی کیطرف تکتا تھا

کہتی تھی پیٹ کے سر زینبؑ مضطر ہے ہے
بانو لوٹی گئی برباد ہوا گھر ہے ہے
نوجوان مرنے چلا بھائی کا دلبر ہے ہے
ہمسے پردیس میں چھوٹے علی اکبرؑ ہے ہے

پاس کوئی نہیں تنہا شہِ مظلوم ہوئے
ہائے نانا کی زیارت سے بھی محروم ہوئے

چھوڑ کر روتا انھیں خیمے سے اکبرؑ نکلے
پُر عجب حال سے ہمشکلِ پیمبر نکلے
پیچھے فرزند کے روتے ہوئے سرور نکلے
ڈر کے تکتے تھے کہ خیمے سے نہ مادر نکلے

ماں کے رونیکی جو کانوں میں صدا آتی تھی
ٹکڑے ہوتا تھا جگر چھاتی پھٹی جاتی تھی

در پہ موجود سواری کو جو تھا اسپِ عقاب
فدوی اسوار ہو لیجائیں جو تشریف جناب
جوڑ کر ہاتھ کہا شاہ سے باچشمِ پر آب
بولے شہ تم چڑھو گھوڑے پہ میں دونگا رکاب

باپ نے پاؤں کو گر ہاتھ لگایا تو کیا
کاندھے پر چڑھتے تھے گھوڑے پہ چڑھایا تو کیا

مثال ۸۔ حضرت امام زین العابدینؑ اپنے بھائی علی اکبرؑ کو رخصت کر رہے ہیں

فضّہ سے کہا کیا ہوا کیسی ہے یہ زاری
شبّیرؑ اکیلے ہیں غضب ہو گیا واری
سر پیٹ کے وہ خادمۂ خاص پکاری
اب جاتی ہے رن کو علی اکبرؑ کی سواری

ہاں خاک اُڑاتی ہیں پھوپھی غش میں پڑی ہیں
سب بیبیاں حلقہ کیے گرد اُنکے کھڑی ہیں

فرمایا عصا لاؤ کہ برادر سے مل آئیں
غازی سے مجاہد سے دلاور سے مل آئیں
دریائے شہادت کے شناور سے مل آئیں
شبیر کے پیارے علی اکبرؑ سے مل آئیں
بھائی کا نہیں کوچ یہ رخصت ہے نبیؐ کی
ہم آپ چلیں گے کہ زیارت ہے نبیؐ کی

فضہ نے عصا دے کے جو بازو کو سنبھالا
بستر سے اُٹھا کانپ کے وہ گیسوؤں والا
خم ہوگیا تھا درد کمر سے قد والا
تھرا کے پڑا پانوں کہیں اور کہیں ڈالا
اشک آنکھوں سے بہتے تھے گریبان قبا پر
ہر بار ٹھہر جاتے تھے سر رکھ کے عصا پر

آواز حزیں تھی کہ مری جان برادر
بیمار برادر ترے قربان برادر
ہم آتے ہیں ٹھہرے رہو اک آن برادر
ذی قدر برادر مرے ذی شان برادر
بھائی سے بغلگیر تو ہوتے ہوئے جاؤ
ہم روئیں تمہیں تم ہمیں روتے ہوئے جاؤ

عابدؑ کی طرف دیکھ کے دوڑے علی اکبرؑ
آنکھوں کو ملا ہاتھوں سے قدموں پہ رکھا سر
سجادؑ نے فرمایا کلیجے سے لگا کر
گردن میں مرے ڈال دو باہوں کو برادر
شانے کے قریں زلف معنبر رہے بھائی
چہرہ مرے چہرے کے برابر رہے بھائی

اے روشنی خانۂ زہرا ترے صدقے
اے باپ کے عاشق مرے شیدا ترے صدقے
اے تشنہ لب و بیکس و تنہا ترے صدقے
اے سرو فردوس معلیٰ ترے صدقے

گھر آج اجڑتا ہے لٹے جاتے ہیں بھائی ۱
ہم قافلہ والوں سے چھٹے جاتے ہیں بھائی

مثال ۵ حضرت امام حسینؑ بہن، بیٹی، اور بیوی سے رخصت ہوتے ہیں،

روتے ہوئے حرم میں گئے قبلۂ انام
رُخ زرد دل میں درد دہن سرو تشنہ کام
تر تھی لہو سے لخت جگر کی تمام
طاقت نہ قلب میں نہ بدن میں لہو کا نام

یہ درد تھا بکا میں کہ دل ٹکڑے ہوتے تھے
یہ حال تھا کہ رونے پہ دشمن بھی روتے تھے

پیارے نہ تھے حسین علیہ السلام کے
ٹھہرا رہے تھے پاؤں شہ تشنہ کام کے
لائی حرم سرا میں بہن ہاتھ تھام کے
سر دوش پر تھا زینبؑ عالی مقام کے

فرماتے تھے بہن علی اکبرؑ گذر گئے
ہم ایسے سخت جان تھے کہ اب تک نہ مر گئے

پرسا تمھیں شہید کا دینے کو آئے ہیں
بیٹھے ہیں خاک اڑائی ہو آنسو بہائے ہیں
کس کس کے داغ آج جگر پر اٹھائے ہیں
یہ ہم تمھارے لال کے خون میں نہائے ہیں

سر تھا حسینؑ بیکس و تنہا کی گود میں
بیٹے کی جان نکلی ہے بابا کی گود میں

سر بار دوش ہے ہمیں فرصت [illegible]
مُردے پڑے ہوئے ہیں عزیزان بے کفن
اب عنقریب خیمۂ عصمت میں تیغ زن
پامال ہوگا لاشۂ فرزند صف شکن

محجوب ہم ہیں قاسمؑ بے پر کی روح سے
شرمندگی ہو علی اکبرؑ کی روح سے

یہ سُن کے بی بیوں کے جگر پر چھری چلی
زینبؑ زمین پہ گر کے پکاری کہ یا علیؑ

سرِّ خفی[1] جو جان کے ہیں سب آپ پہ جلی — جاتا ہے سر کشوں میں یہ کونین کا ولی

بیکس کو آسرا ہے پسر کا نہ بھائی کا
آقا یہی تو وقت ہے مشکلکشائی کا

صدقے گئی پسر کے بچانے میں کد کرو — فرزند فاطمہ کی بلاؤں کو رد کرو
دریا کو چھین لو حق زہرا سند کرو — یا شیر حق مقام مدد ہے مدد کرو

پانی پہ جنگ آگ لگی ہے یہ دہر میں
حصّہ پسر کا کیا نہیں مادر کے مہر میں

یا مصطفےٰ بلا میں پھنسا ہے تمھارا لال — یا شیر ذو الجلال دکھاؤ انھیں جلال
یا فاطمہ میں لٹتی ہوں کھولو کے بال — یا رب الٹ دے آج یہ سب عرصۂ قتال

پھر کیا کسی سے کام ہے سب سے جدا رہوں
بھائی کو اپنے لے کے میں جنگل میں جا رہوں

فرمایا شہ نے صبر بہت چاہیے تمھیں — خالق کی یاد دختر علیؑ چاہیے تمھیں
لب پر رضا کا سخن چاہیے تمھیں — جو ماں کا تھا چلن وہ چلن چاہیے تمھیں

ہر چند پوچھتے تھے سبب آہ سرد کا
شکوہ کیا علیؑ سے نہ پہلو کے درد کا

یہ سچ کہ تم کو مجھ سے محبت ہے اے بہن — کیا کیجے ناگزیر یہ فرقت ہے اے بہن
پیارے تمھارے بھائی کی رخصت ہے اے بہن — دنیا مقام رنج و مصیبت ہے اے بہن

بھولے نہ یاد حق کبھی گو حال غیر ہو
اسکی ظفر ہے خاتمہ جسکا بخیر ہو

[1] یعنی پوشیدہ و ظاہر ۱۲

دیکھا یہ کہکے بالی سکینہ کو پاس سے
لپٹی وہ دوڑ کر شہ گردوں اساس سے
طاقت نہ تھی کلام کی ہر چند پیاس سے
بولی وہ تشنہ کام شہ حق شناس سے
کیا اِس بلا کے بَن سے تہیّہ سفر کا ہے
صدقے گئی بتاؤ ارادہ کدھر کا ہے

فرمایا شہ نے ہاں سفر ناگزیر ہے
آؤ گلے لگو کہ یہ صحبت اخیر ہے
اب آرزوے قرب خداے قدیر ہے
تنہا ہیں ہم سپاہِ مخالف کثیر ہے
طے ہو یہ مرحلہ جو اعانت خدا کرے
جسکا نہ کوئی دوست ہو بی بی وہ کیا کرے

سُن کر مصیبت پدر بیکس و حزیں
بولی بلائیں باپ کی لیکر وہ مہ جبیں
نکلو بلا کے بَن سے کہیں یا امام دیں
آقا سوا حضور کے میرا کوئی نہیں
صدقے گئی مدینے چلو یا نجف چلو
للّٰلہ ساتھ لے لو مجھے جس طرف چلو

شہ نے کہا کہ بند ہیں راہیں پدر نثار
پھیلی ہوئی ہے چار طرف فوج نابکار
پیدل نکلنے پاتا ہے کوئی نہ سوار
اِس دشت کیں میں قید ہے احمد کا یادگار
قاصد جو میرے نام کا خط لیکے آتے ہیں
سر کاٹ کر درختوں میں لٹکائے جاتے ہیں

عمو تمھارے چھوڑ گئے ہم کو جاں بلب
بی بی قدم پہ گر کے ہیں کون رہ گیا اب
تلواریں چل گئیں نہ قاسم رہے نہ سب
مرنا شباب میں علی اکبر کا ہے غضب
تھے جتنے زندگی کے حلاوت وہ چھٹ گئی
دو تین گھر بھرے ہوے اکدم میں لُٹ گئی

بی بی یہان لے اہل وطن ہین قریب تر　　پر میری بیکسی کی نہین ایک کو خبر
بھیجے ہین شیعیان مین نے بھی نامہ بر　　لیکن حسینؑ تک نہ ہوا ایک کا گذر

فریون سے بھی مدد کو جو نکلا وہ گھر گیا
لشکر بنی اسد کا قریب آکے پھر گیا

گھیرا ہے اس لیے مجھے اس بن مین بیگناہ　　بتلا مجھ تک آ سکے نہ کوئی میرا خیر خواہ
نہ دوست نہ عزیز نہ غمخوار نہ سپاہ　　ہمراہی سب علم مین وطن دو گھر تباہ

مجھ سا بھی کوئی بیکس بے پر نہ ہو
مر کر نہ دفن ہون تو کسی کو خبر نہ ہو

جانا ہے دور شب کو جو آنا نہو ادھر　　ضد کر کے رو ٹیو نہ ہمین چاہتی ہو گر
پہلے پہل ہے آج شب فرقت پدر　　سو رہیو مان کی چھاتی پہ غربت سے رکھ کے سر

راحت کے دن گذر گئے یہ فصل اور ہے
اب یون بسر کرو جو یتیمون کا طور ہے

ننھے سے ہاتھ جوڑ کے بولی وہ تشنہ کام　　بتلائیے مجھے کہ یتیمی ہے کس کا نام
آنکھون سے خون بہا کے یہ کہنے لگے امام　　کھل جائے گا یہ درد والم تم پہ تا بہ شام

بی بی نہ پوچھو کچھ یہ مصیبت عظیم ہے
مر جائے جس کا باپ وہ بچہ یتیم ہے

بندے اُتار طوق بڑھاؤ پدر نثار　　چھپنا کہین جو لوٹنے آئین ستم شعار
چلائیو نہ ابن ابی کہہ کے بار بار　　دشمن ہمارے نام کا ہے شمر نابکار

لو اب وداع جاتے ہین یہ قتل گاہ مین
سونپا تمھین خدا و نبیؐ کی پناہ مین

یہ کہہ کے پیاری بیٹی سے دیکھا اِدھر اُدھر
فضہ نے عرض کی کہ اُدھر پیٹتی ہیں سر
پوچھا کدھر ہیں بانوئے ناشاد نوحہ گر
رخصت کی بھی حضور کے اُن کو نہیں خبر

لب پر گھڑی گھڑی علی اکبرؑ کا نام ہے
چلیئے ذرا کہ کام اب اُن کا تمام ہے

رکھی تھی لا کے لاش پسر آپ نے جہاں
کرتی ہیں اُٹھ کے آہ تو ہلتا ہے آسماں
مُنھ اُس زمیں پہ ملتی ہیں اور ہے لبوں پہ جاں
نعرہ یہ ہے کہ ہائے علی اکبرؑ جواں

واری گئے نہ قبر میں اماں کو گاڑ کے
جنگل بسا دیا مری بستی اُجاڑ کے

روتے ہوئے وہاں جو گئے شاہِ خوش خصال
شبیرؑ بیٹھ کر یہ پکارے بصد ملال
دیکھا کہ غش میں خاک پہ بکھرے ہوئے ہیں بال
اے شہربانو ہوش میں آؤ یہ کیا ہے حال

سچ ہے فلک نے تم کو بڑے دُکھ دکھائے ہیں
صاحب اُٹھو ہم آخری رخصت کو آئے ہیں

سنکر صدا حسینؑ کی چونکی وہ نوحہ گر
تنہا حضور آئے ہیں باندھے ہوئے کمر
کی عرض سر جھکا کے قدم پر بچشم تر
صاحب کہاں ہے منتوں والا مرا پسر

ایسے نہیں وہ دُکھ میں جُدا ہوں جو باپ سے
اپنے مرادوں والے کو میں لوں گی آپ سے

اے جانِ فاطمہ مرا پیارا کہاں گیا
وہ تین دن کے پیاس کا مارا کہاں گیا
اماں کی زندگی کا سہارا کہاں گیا
سیدانیوں کی آنکھوں کا تارا کہاں گیا

مرتی ہوں اپنے سرو سہی قد کو دیکھ لوں
اِک بار پھر شبیہ محمدؐ کو دیکھ لوں

وہ گورا گورا چاند سا مکھڑا دکھائیں پھر — لے لوں میں گیسوؤں کی بلائیں تو جائیں پھر
مجکو تو خیریت سے غرض ہے نہ آئیں پھر — خوشبو میں تن کی سونگھ لوں جنگل بسائیں پھر
تڑپے گا دل تو لے کے اجازت حضور سے
میں دیکھ لوں گی در پہ کھڑی ہو کے دور سے

بیخودی میں جب آئے تھے میدان سے وہ ادھر — کیا دیکھتی مجھے تو کچھ آتا نہ تھا نظر
سنبھلا ذرا جو دل تو پھڑکنے لگا جگر — کب آئے کب گئے مجھے مطلق نہیں خبر
آئے تو چھپ کے آئے گئے بے ملے ہوئے
باتیں نہ پیار کی ہوئیں نہ کچھ گلے ہوئے

اگر ہیں خفا تو آئیں اٹھ کر نثار ہوں — ان کی خطا نہیں ہے میں تقصیر وار ہوں
داسی ہوں انکی آپ کی خدمتگزار ہوں — اب رحم کیجیے کہ بہت بیقرار ہوں
تکلیف گرچہ ہوگی شہ مشرقین کو
لے آئیے منا کے مرے نور عین کو

باتیں یہ سنکے کہنے لگے شاہ بحر و بر — یا رب جدا نہ ہو کسی ماں سے جواں پسر
بانو کے باؤں؟ کہاں ہے وہ سیمبر؟ — ہمشکل مصطفےٰ تو گئے فاطمہؑ کے گھر
ہر دکھ میں صبر کرتے ہیں جو حق شناس ہیں
جس نے تمہیں دیا تھا وہ اب اسکے پاس ہیں

جاگے ہوئے تھے رات کے نیند آگئی انھیں — ہے ہے منافقوں کی نظر کھا گئی انھیں
مخفی بہت کیا پہ اجل پا گئی انھیں — صحرائے کربلا کی فضا بھا گئی انھیں
زندہ نہ ہوگا لال اگر مر بھی جاؤ گی
اب تو کوئی گھڑی میں ہمیں بھی نہ پاؤ گی

جاتے ہین ہم وہین کہ جہان ہے نہ لالہ نام — دے دو جو اپنے لال کو دینا ہو کچھ پیام
سنکر یہ ذکر ہوش مین آئی وہ تشنہ کام — سمجھی کہ گھر تباہ ہوا اب چلے امام
خنجر سے حلق شاہ کے کٹنے کا طور ہے
بستی اجڑ کے تخت اُلٹنے کا طور ہے

دامن پکڑ کے شاہ کا بولی وہ دلفگار — اے ابن فاطمہ یہ کنیز آپ کے نثار
بعد آپ کے جو لوٹنے آئین ستم شعار — بیٹھے کہان یہ بیکس و غمخوار سوگوار
کچھ حق مین اس کنیز کے فرما کے جایئے
صاحب کسی جگہ مجھے بٹھلا کے جایئے

مین وہ ہون جو کہ قید مین آئی تھی یا امام — مشہور ہون کنیز امام فلک مقام
پاس آپ کے ہے نانا کا اے قبلۂ انام — گر قید ہو گئی تو کہین گے یہ خاص و عام
بندی چلی ہے شام کو آل رسولؐ کی
دیکھو یہی ہو مہر علی و بتول کی

فرمایا شہ نے حافظ و حامی ہے ذوالجلال — زہرا کی بیٹیون کی رہو تم شریک حال
زینب کو دیکھو سر پہ بٹھائی ہے دونو لال — صاحب تمھارے ساتھ ہے عابد سا خوشخصال
بے وارثون کا وارث و والی الٰہ ہے
دیکھو ڈگے نہ پاؤن کہ مشکل کی راہ ہے

لو الوداع لاش پہ اب آ سکے رو لیو — لیکن نہ خاک اڑا کے نہ چلا کے رو لیو
زانو پہ سر کو شرم سے نہوڑا کے رو لیو — قبر رسولؐ پاک پہ ہان جا کے رو لیو
لٹنے مین صبر و شکر تباہی مین چاہیئے
رونا بشر کو خوف الٰہی مین چاہیئے

مثال ۵، حضرت امام حسین علیہ السلام اپنے بھائی عباس کے قتل کی خبر سنکر رزمگاہ میں جاتے ہیں

دریا پہ سر برہنہ شہ بحر و بر چلے — صدمہ یہ تھا کہ ہاتھوں سے تھامے کمر چلے
اکبر سنبھالے باپ کو با چشم تر چلے — یہ بھی ادھر چلے شہ والا جدھر چلے
صدمہ ہے ضرب غم سے دل پاش پاش پر
رونے کو بھائی جاتا ہے بھائی کی لاش پر

صورت شاہ کی ہے کہ زلفوں پہ خاک ہے — آلودۂ غبار الم روئے پاک ہے
سوکھے لبوں پہ نالۂ روحی فداک ہے — اور تا کمر قبا کا گریبان چاک ہے
دست یسار بیٹے کے گردن میں ڈالے ہیں
شہ کو جھکے ہوئے علی اکبر سنبھالے ہیں

جب پاؤں کانپتے تھے تو کہتے تھے رکے شاہ — طاقت بدن کی لے گئے عباس آہ آہ
دریا نہ اتنا دور تھا اے میرے رشک ماہ — رستہ غلط کیا ہے کہ کچھ بڑھ گئی ہے راہ
ہے دور یاں سے یا مرا بھائی قریب ہے
کہتے ہیں وہ "حضور ترائی قریب ہے"

القصہ لائے باپ کو اکبر ترائی میں — زخمی ملا وہ شیر دلاور ترائی میں
پائی جو بوئے خون برادر ترائی میں — لاشے کے پاس گر پڑے سرور ترائی میں
گذری تھی عمر ہاتھ جسے جوڑتے ہوئے
دیکھا اسی کو خاک پہ دم توڑتے ہوئے

منہ رکھ کے منہ پہ بھائی کے بھائی نے دی صدا — اے شیر اے دلیر یہ بیکس ترے فدا
کیوں پتلیاں پھرا لیں ہو بھائی یہ کیا کیا — عباس میں حسین ہوں دیکھو مجھے ذرا

میرا بھی حلق خشک ہے خنجر کے واسطے
بھائی کو چھوڑے جاتے ہو دم بھر کے واسطے

ٹھہرو عنان توسنِ عُمرِ رواں نہ لو
کروٹ کراہ کر مرے آرام جاں نہ لو
ساتھی تھکا ہوا ہے رہ کارواں نہ لو
لگتی ہے چوٹ دل پہ مرے ہچکیاں نہ لو

مر جاؤں گا میں ساتھ اگر چھوٹ جائے گا
بھائی مرا تو رشتۂ جاں ٹوٹ جائے گا

بولے یہ آنکھ کھول کے عباس نامدار
یہ موت زندگی ہے زہے فخر و افتخار
آقا ہزار جان گرامی ترے نثار
نکلے جو گل کے سامنے بلبل کی جانِ زار

دیدار دیکھنے میں نہ آتا تو موت تھی
پروانہ شمع کو جو نہ پاتا تو موت تھی

زانوئے پاک نور خدا اور سر حقیر
ذرّے کو مہر کر دیا اے آسمان سریر
عالم کا بادشاہ کجا اور کجا فقیر
تکیہ کسی کو بھی یہ ملا ہے دم اخیر

پایا یہ اوج ماں کی نہ بابا کی گود میں
معراج مل گئی شہ والا کی گود میں

رحمت نے رُخ کیا مری جانب حضور آئے
روشن ہو کیوں نہ چشم جو خالق کا نور آئے
لیکر رسول جام شراب طہور آئے
ایسا نہو سرور جو بالیں پہ حور آئے

عُشاق مر بھی جاتے ہیں زخمی بھی ہوتے ہیں
میں اب تو تندرست ہوں کیوں آپ روتے ہیں

شہ نے کہا کہ مینہ کو آئے ہیں تم کو سب
سر خاک پر پٹک کے یہ بولا وہ جان بلب
شاباش چھوڑ جاؤ گے اب ہم کو ہے غضب
اے جان فاطمہ جگرِ سیدِ عرب

کس کس کو رد کیجے کہ یہ اعدا کے ریلے ہین
صدمہ بڑا یہی ہے کہ حضرت اکیلے ہین

راحت کی راہ ہے سفر گلشن ارم
اب تک تو کب کے مر گئے ہوتے تڑپ کے ہم
صدمہ مگر ہے روح پہ اے قبلۂ امم
الفت یہ آپ کی ہے کہ اٹکا ہوا ہے دم

دنیا سے کوچ کرنے کو جی چاہتا نہین
اے بھائی جان مرنے کو جی چاہتا نہین

یہ کہکے چپ ہوے تھے کہ اُٹھا جگر مین درد
لین کروٹین تو بھر گئی زخمون مین ان کی گرد
رخسار سرخ سرخ جو تھے ہو گئے وہ زرد
منھ رکھ کے شہ کے پاؤن پہ کھینچی اک آہ سرد

دنیا سے انتقال علمدار ہو گیا
سردار فوج بیکس و بے یار ہو گیا

بھائی کے آگے بھائی تڑپکر جو مر گیا
خنجر الم کا دل سے جگر تک اُتر گیا
صدمہ غضب کا سبط نبی پر گذر گیا
چلاتے تھے کہ شیر ہمارا کدھر گیا

لیتے تھے بوسے جھک کے تن پاش پاش کے
اٹھ اٹھ کے گرد پھرتے تھے بھائی کی لاش کے

جھک کر پکارتے تھے کہ بھیا صدا سناؤ
زینب تمھین بلاتی ہین خیمے کے در پہ جاؤ
سر رکھ لو میرے زانو پہ گردن ذرا اٹھاؤ
کب سے بلک رہی ہے سکینہ کو دیکھ آؤ

باتون مین پیار کی کہین ہم سے گلا نہو
دریا پہ ہو گئے ہو سکینہ خفا نہو

کیا ہے جو آنکھ بند کئے ہو حیا سے تم
اکثر ہمین بچاتے تھے لون مین جس سے تم
کیا کچھ خفا ہو سبط رسول خدا سے تم
ہم آگئے ہین گرد تو جھاڑو قبا سے تم

ہے دوپہر کا وقت برادر پہ دھوپ ہے
سایہ کرو علم کا مرے سر پہ دھوپ ہے

اکبر نے رو کے عرض یہ کی اے شہ زماں
رونے سے اب ملیں گے نہ حضرت کے بھائی جاں
لے چلیے گھر میں لاش علمدار نوجواں
ایسا نہ ہو نکل پڑیں خیمہ سے بی بیاں
دریا پہ ننگے سر کہیں بنت علیؑ نہ آئے
فضہ کو ساتھ لے کے سکینہ چلی نہ آئے

اکبر نے عرض کی کہ چلیں اے شہ زماں
رو کر امام دیں نے کہا جائیں اب کہاں
واں بھی مرے لیے وہی رونا ہے جو یہاں
اپنا بھی گھر ہے اب یہی بھائی ہے جہاں
اٹھتے نہ تھے حسین برادر کو چھوڑ کر
رکھا پسر نے پاؤں پہ سر ہاتھ جوڑ کر

فضہ کھڑی تھی خیمہ کے باہر جو بے خبر
حضرت کو اس نے دور سے دیکھا برہنہ سر
پردہ الٹ کے خیمہ کا بولی وہ نوحہ گر
سیدانیو اٹھو علم آتا ہے خون میں تر
اکبر علم لیے ہیں علیؑ کا نشاں نہیں
کوتل فرس تو آتا ہے وہ نوجواں نہیں

ناگاہ سب کو دور سے آیا نظر نشاں
تھا خاک سے بھرا ہوا وہ جلوہ گر نشاں
گویا کہ تھا شبیہ الم سر بسر نشاں
ڈوبا تھا خوں سے پنجۂ پرنور اور نشاں
چھپ جاتا تھا پھریری میں یوں کانپ کانپ کے
روتا ہے جس طرح کوئی منہ ڈھانپ ڈھانپ کے

سمجھے یہ سب کہ بازوئے عباس کٹ گئے
سیدانیوں کے غم سے لہو اور گھٹ گئے
بچوں کے ننھے ننھے جگر غم سے پھٹ گئے
رنگ اڑ گئے رخوں سے کلیجے الٹ گئے

ہر دل پہ برق رنج و غم و یاس گر پڑی
بچوں سمیت زوجۂ عباسؑ گر پڑی

اکبر علم کو خیمے کے اندر جھکا کے لائے
چلاتے تھے کہ بھائی کو بھائی کہاں سے لائے
سر اپنا پیٹتے ہوئے گھر میں حسین آئے
عاشق نے ساتھ چھوڑ دیا ہائے ہائے

چھینا اجل نے ہم کو ہمارے دلیر کو
لو بی بیو! ترائی میں رو آئے شیر کو

لپٹی تو تھی علم سے سکینہ جگر فگار
پرچم پہ یوں جھکتا تھا بہ سجدہ وہ بار بار
ہر ہر علی کے لعل کی اندوہ میں تھی پکار
سر پیٹے جس طرح کوئی مظلوم سوگوار

تصویر حسرت و الم و یاس بن گیا
رایت بھی نخل ماتم عباسؑ بن گیا

زیر علم تھا زوجۂ عباسؑ کا یہ حال
چلاتی تھی کہ اے اسد کبریا کے لال
[illegible] تھا خاک سر بکھرے ہوئے تھے بال
میں سر کو پیٹتی ہوں مجھے کچھ نہیں خیال

جاتا ہے یوں جہاں سے کوئی آنکھ موڑ کے
مسکن کیا ترائی میں لونڈی کو چھوڑ کے

پرخوں علم کے پاس تھے عباسؑ کے پسر
ماں نے جو طوق [illegible] سے تھرا دیکھا کے نظر
تکتے کبھی تھے گردوں کو تھراتے تھے جگر
سہما ہوا تھا ایک تو اک پیٹتا تھا سر

زلفوں پہ گرد تھی تو رخوں پر غبار تھا
چہروں سے درد بے پدری آشکار تھا

چھوٹا یہ شست کرتا تھا آنسو بہا بہا
آیا علم یہاں سے نہ آنے کی وجہ کیا
بابا ہمارے گھر میں کب آئیں گے اے چچا
چھوٹے سے رو کے تب بڑے بھائی نے کہا

اماں کی مانگ اُجڑ گئی صدمے گذر گئے
بھیا تمھیں خبر نہین بابا تو مر گئے

دوڑا یہ سُن کے نہر کی جانب وہ بے پدر — روکر پکارے شاہ کہ بیٹا چلے کدھر
ننھے سے ہاتھ جوڑ کے بولا وہ نوحہ گر — بابا کی لاش اُٹھانے کو جاتے ہین نہر پر
میّت نہ اُٹھ سکے گی تو خالی نہ آئین گے
دامن مین ہم کٹے ہوے ہاتھون کو لائینگے

مثال ۶، علی اکبرؑ نزع کی حالت مین ہین اور امام حسین علیہ السلام اُن کے پاس جاتے ہین ؎

جس دم سُنی حسینؑ نے یہ جانگزا صدا — صابر اگرچہ تھے پہ کلیجہ اُلٹ گیا
ہاتھون سے دل کو تھام کے دوڑے برہنہ پا — نعرہ کیا کہ اے علی اکبرؑ گردون مین گیا
رل کر غریب و بیکس و تنہا سے جائیو
آے ضعیف باپ تو دنیا سے جائیو

ہے ہے مرے شفیق پسر مہرباں پدر — خوشرو پسر سعید پسر قد رواں پسر
مادر کا چین باپ کا آرام جاں پسر — گم گو پسر شہید پسر نوجواں پسر
مقتل کدھر ہے کوئی بتاتا نہین مجھے
اے نورِ عین کچھ نظر آتا نہین مجھے

مجھ کو غریب دشت بلا کہہ کے پھر پکار — اک بار یا شہ دوسرا کہہ کے پھر پکار
اے شیر سید الشہدا کہہ کے پھر پکار — صدقے ہو باپ یا ابتا کہہ کے پھر پکار
میری بھی جان تن سے ترے ساتھ جائیگی
مرجاؤن گا مین جو نہ آواز آئے گی

کچھ ہوش دست و پا کا نہیں بے حواس ہوں
غمگین ہوں مردہ دل ہوں حزیں ہوں اداس ہوں
زخمی ہے قلب کشتۂ اندوہ و یاس ہوں
دم توڑ دو تم تو ہے غضب اور میں پاس ہوں
کیونکر قرار آئے دل ناصبور کو
لاؤں کہاں سے ڈھونڈھ کے آنکھوں کے نور کو

دوڑے یہ بات کہہ کے جو سلطان بحر و بر
اٹھا یہ دل میں درد کہ خم ہو گئی کمر
بیٹے کی لاش باپ نے دیکھی لہو میں تر
دیکھا جو زخم منہ کے قریب آ گیا جگر
تڑپے جو گر کے اور تڑپ کر ٹھہر گئے
غل پڑ گیا صفوں میں کہ شبیر مر گئے

ہوش آیا میں ساعت کامل کے بعد جب
آنسو بہا کے رکھ دیے بیٹے کے لب پہ لب
دیکھا کہ مٹ رہی ہے شبیہ رسول رب
چلاتے تھے کہ چھوڑ چلے ہم کو ہے غضب
دل سے گلے لپٹنے کی حسرت نکال دو
باہیں اٹھا کے باپ کی گردن میں ڈال دو

اکبر نے آنکھیں کھول کے دیکھا رخ پدر
فرمایا شہ نے زانو پہ رکھ کر سر پسر
گالوں پہ اشک آنکھوں سے ٹپکے ادھر ادھر
روتے ہو کس کے واسطے اے غیرت قمر
یاں سے اٹھا کے آل پیمبر میں لے چلیں
غم ہاں کا ہے تو آؤ تمہیں گھر میں لے چلیں

کی عرض مہلت اتنی کہاں اے شہ امم
دولت ملی کہ دیکھ لیے آپ کے قدم
اب کیجیے قبلہ رو کہ نکلتا ہے تن سے دم
غیر از غم فراق مجھے کچھ نہیں ہے غم
ساتھ آئے تھے جو چاہنے والے وہ دور ہیں
روتا ہوں اس لیے کہ اکیلے حضور ہیں

شہ نے کہا مرے لیے بیٹا نہ رو دو بس
دنیا کی آرزو ہے نہ جینے کی کچھ ہوس
ہوگا جوان بچے جانے میں تھوڑا سا پیش و پس
میرے لیے ہے اب دم خنجر ہر اک نفس
اکبرؑ ترے الم سے جگر چاک چاک ہے
جب تو نہ ہو تو باپ کے جینے پہ خاک ہے

یہ بات سُن کے لینے لگا ہچکیاں پسر
زردی اجل کی چھا گئی چہرے پہ سر بسر
سوکھی زبان دکھائی اُگلا سا خون جگر
دو بار لی کراہ کے کروٹ اِدھر اُدھر
دُنیا سے انتقال ہوا نور عین کا
ہنگام ظہر تھا کہ لُٹا گھر حسینؑ کا

نکلی اِدھر تو جسم سے اکبرؑ کی جان زار
فضہ پکاری ڈیوڑھی سے بڑھ کر یہ ایک بار
ہاں بیبیاں ہوئیں در خیمہ پہ بیقرار
اکبرؑ پہ کیا گذر گئی لے شاہ نامدار
چھُریاں غم و الم کی کلیجے پہ چلتی ہیں
جلد آئیے کہ حضرت زینبؑ نکلتی ہیں

گھبرا کے شاہ دین نے اُٹھائی پسر کی لاش
لائے قریب خیمہ جو اُس سیمبر کی لاش
لپٹائے تھے کلیجے سے لخت جگر کی لاش
غل پڑ گیا کہ آتی ہے رشک قمر کی لاش
زہرا کی بیٹیاں جو کھُلے سر نکل پڑیں
سب بیبیاں خیام سے باہر نکل پڑیں

سر ننگے شہ کے گرد تھیں سیدانیاں تمام
بانو پکارتی تھی کہ یا شاہ تشنہ کام
تھے بیچ میں شہید کا لاشہ لیے امام
جیتا رہا جہان سے گیا میرا لالہ فام
منہ کا ڈھلا ہے ہونٹوں پہ سوکھی زبان ہے
اے جان فاطمہؑ مرے بچے میں جان ہے

زینب تڑپ تڑپ کے یہ کہتی تھی بار بار ‌‌ ‌ یہ لاش میری گود میں دیجیے بہن نثار
طاقت نہیں ہے آپ میں یا شاہ نامدار ‌‌ ‌ صدقے گئی لرزتا ہے فاقوں سے جسم زار

شہ کہتے تھے یہ کام ہے مجھ خستہ جان کا
تجھ سے بہن اُٹھے گا نہ لاشہ جوان کا

لاشہ پسر کا خیمہ میں لائے امام پاک ‌‌ ‌ مسند رسول حق کی بچھائی پڑے خاک
شہ نے لٹا کے لاش جو کی آہ دردناک ‌‌ ‌ دل بیبیوں کے ہو گئے سینے میں چاک چاک

پہلے گمان تھا غش میں دغا کر کے آئے ہیں
آخر یقین سب کو ہوا مر کے آئے ہیں

لاشے کے پاس ہائے پسر کہکے ماں گری ‌‌ ‌ ہاتھوں سے دل پکڑ کے پھوپھی نیمجان گری
دل پر ہر اک کے برق غم نوجوان گری ‌‌ ‌ غش آ گئے یہاں گری کوئی اور کوئی واں گری

چھوٹی بہن جو لاشے سے آکر لپٹ گئی
اک حشر ہو گیا صف ماتم اُلٹ گئی

مثال ۷، حضرت علی اکبر نزع کی حالت میں امام حسین علیہ السلام کو بُلاتے ہیں اور وہ بدحواس قتل گاہ کیطرف جاتے ہیں اسوقت کی اضطرابی حرکات اور باپ بیٹے کی گفتگو ؎

سُنکر یہ استغاثہ فرزند خوشخصال ‌‌ ‌ سید نے آہ کی کہ ہلا عرش ذوالجلال
کھولے جناب فاطمہؑ کی بیٹیوں نے بال ‌‌ ‌ بانو پکاری خیر تو ہے اے علی کے لال

ہے ہے پسر سے کونسی بادر بچھڑ گئی
صاحب بتاؤ کیا مری بستی اجڑ گئی

نیزے سے کسکے لال کا ہے زخمی ہوا جگر ‌‌ ‌ کرتے ہیں کس کی لاش کو پامال اہل شر
کہتا ہے کون رن میں تڑپ کر پدر پدر ‌‌ ‌ اب گھر سے میں نکلتی ہوں ہے ہے مرا پسر

پردہ نہ مجھ سے کیجیے سب جانتی ہوں میں
آواز یہ اُسی کی ہے پہچانتی ہوں میں

بانو کو قسمیں دے کے چلے شاہِ نامدار
وہ پیاس اور وہ دھوپ کا صدمہ وہ اضطرار
دل تھا اُلٹ پُلٹ تو کلیجہ تھا بیقرار
اُٹھتے تھے اور زمین پہ گرتے تھے بار بار
چلّاتے تھے شبیہِ پیمبر ہم آتے ہیں
گھبراؤ نہ اے علی اکبرؑ ہم آتے ہیں

آؤ کدھر کو اے علی اکبرؑ جواب دو
چلّا رہی ہے ڈیوڑھی پہ مادر جواب دو
اکبرؑ برائے خالقِ اکبر جواب دو
بیٹا جواب دو مرے دلبر جواب دو
گرتے ہیں ہم تو آپ کا ہاتھوں سے کام لو
بیٹا ضعیف باپ کے بازو کو تھام لو

کچھ سوجھتا نہیں میں کدھر جاؤں کیا کروں
اے نورِ چشم تجھ کو کہاں پاؤں کیا کروں
مضطر ہے جان دل کو کسے سمجھاؤں کیا کروں
کیونکر پسر کو ڈھونڈ کے میں لاؤں کیا کروں
پایا تھا منتوں میں جسے خاک چھان کے
وہ لعل ہم نے کھو دیا جنگل میں آن کے

بس اب جگر حسینؑ کی لے جلد اے اجل
اے جسمِ زار زیست کا باقی نہیں محل
اے جانِ ناتوان دلِ مجروح سے نکل
ہاں اے نفس چھری کی طرح سے گلے پہ چل
چھوٹے نہ ساتھ اُس کا جو پیری کی آس ہو
لاشہ بھی لاشۂ علی اکبرؑ کے پاس ہو

جنگل سے بے حواس پھرے نہر پر گئے
واں بھی جو وہ گُہر نہ ملا سوئے بر گئے
دوڑے کسی طرف تو کسی جا ٹھہر گئے
تھالے ملے لہو کے برابر جدھر گئے

ٹپکا ہوا زمین پہ جگر کا لہو ملا
لیکن کہین نہ وہ پسرِ ماہرو ملا

جا کر صفون کے پاس پکارے باشکِ آہ
اے ظالمون یہ شب ہی کہ دن ہو گیا سیاہ
ہی کس طرف مرے علی اکبرؑ کی قتل گاہ
کس ابر مین چھُپا ہی مرا چودھوین کا ماہ
بتلاؤن جان ہی کہ نہین جسمِ زار مین
زخمی پڑا ہی شیر مرا کس کچھار مین

لاشِ پسر کو ڈھونڈھتے تھے شاہ بحر و بر
کہتا تھا شمر اے پسرِ سید البشر
سر پیٹنے کی جا ہی کہ ہنستے تھے اہلِ شر
کس کو حضور ڈھونڈتے ہین مر گیا پسر
خود ڈھونڈھ لیجیے جسدِ پاش پاش کو
بتلائین گے نہ ہم علی اکبرؑ کی لاش کو

یہ سُن کے کھینچ لی شہِ والا نے ذوالفقار
شہ کو نظر پڑا علی اکبرؑ کا راہوار
چمکی جو برقِ تیغ تو بھاگے ستم شعار
چلائے اے عقاب کدھر ہی ترا سوار
دکھلا دے مجکو لاش مرے نورِ عین کی
کس دشت مین پڑی ہی بضاعت حسینؑ کی

ملنے لگے ان رکابون کے حلقون سے چشمِ نم
بوسے تری رکاب کے لون اے اسیرِ غم
ہی ہی اسی مین تھے مرے فرزند کے قدم
اکبرؑ کے ہاتھ مین تھی یہی باگ ہی ستم
ہی ہی وہ ہاتھ پاؤن مرے آفتاب کے
قربان تری لگام کے صدقے رکاب کے

گھوڑے نے ہنہنا کے سوئے دشت کی نظر
جاتا ہی آگے آگے وہ تازی بچشمِ تر
یعنی کہ لاش آپکے پیارے کی ہے اِدھر
گھوڑے کے پیچھے پیچھے تھے سلطان بحر و بر

جنگل میں لاشۂ پسر نوجواں ملا
وہ مہ لقا ملا تو مگر بیجان ملا

دیکھی عجیب حالت فرزند نوجواں
تن پر جراحت تبر و خنجر و سناں
پیکاں گلے میں ہونٹوں پہ نکلی ہوئی زباں
گردن تھی کج پھری ہوئی آنکھوں میں پتلیاں
ٹاپوں سے مرکبوں کے جراحت پھٹے ہوئے
چہرہ سفید خاک میں گیسو اٹے ہوئے

ہچکی کے ساتھ کہتے ہیں وا کرکے چشم تر
اے موت بے وطن کی جوانی پہ رحم کر
اے جان جسم زار میں اور ایک دم ٹھہر
اے درد تھم ذرا کہ پھٹا جاتا ہے جگر
پھر ایک بار سیّد والا کو دیکھ لوں
مہلت بس اتنی دے کہ میں بابا کو دیکھ لوں

دشمن کو بھی نہ بیٹے کا لاشہ خدا دکھائے
زندہ رہے یہ پیر جواں یوں جہاں سے جائے
حضرت زمیں پہ گر کے پکارے کہ ہائے ہائے
اے لال تین روز کے فاقے میں زخم کھائے
شاید جگر کے زخم سے تم بیقرار ہو
زخمی تمھاری چھاتی پہ بابا نثار ہو

کیوں کھینچتے ہو پاؤں کو اے سرو گلعذار
آنکھیں تو کھول دو کہ مرا دل ہے بیقرار
کیوں ہاتھ اٹھا اٹھا کے پٹکتے ہو بار بار
بیٹا تمھاری ماں کو تمھارا ہے انتظار
بہنیں کھڑی ہیں در پہ بڑے اشتیاق میں
اکبر تمھاری ماں نہ جیے گی فراق میں

غش میں سنا جو ہیں علی اکبر نے ان کا نام
سوکھی زباں دکھا کے یہ بولا وہ تشنہ کام
کس یاس کی نگاہ سے دیکھا سوئے خیام
شدت یہ پیاس کی ہے کہ دشوار ہے کلام

اب اور کوئی دم کا پسر میہمان ہے
امداد یا حسینؑ کہ پانی میں جان ہے

فرمایا شہ نے اے علی اکبرؑ میں کیا کروں
پانی نہیں ہے مجکو میسر میں کیا کروں
گھیرے ہیں نہر کو یہ ستمگر میں کیا کروں
کچھ بس نہیں ہے مرا مرے دلبر میں کیا کروں
اعدا نہ دینگے بوند اگر لاکھ کد کریں
بیٹا تمھاری ساقی کوثر مدد کریں

حضرت یہ کہتے تھے کہ چلا خلق سے پسر
اتنی زبان ہلی کہ خدا حافظ اے پدر
ہچکی جو آئی تھام لیا ہاتھ سے جگر
انگڑائی لے کے رکھدیا شہ کے قدم پہ سر
آیا ادھر لٹا شہ والا کے سامنے
بیٹے کا دم نکل گیا باپ کے سامنے

لکھتا ہے ایک راوی غمگین و پر ملال
یعنی ادھر ہوا علی اکبرؑ کا انتقال
نکلی حرم سے ایک زن فاطمہ جمال
گویا جناب سیدؔ کھولے ہوئے تھیں بال
تھی اس طرح سے رخ پہ ضیا اس جناب کے
حلقہ ہو جیسے نور کا گرد آفتاب کے

چلاتی تھی اے مرا پیارا ہے کس طرف
اے آسمان وہ عرش کا تارا ہے کس طرف
اے ابر شام چاند ہمارا ہے کس طرف
اے ارض کربلا وہ سدھارا ہے کس طرف
ہے ہے سناں سے جان گئی میہمان کی
میت کدھر کو ہے مرے کڑیل جوان کی

اے میرے لمبے گیسوؤں والے کدھر ہے تو
ہے ہے مرے غریبی کے پالے کدھر ہے تو
واری کہاں لگے تجھے بھالے کدھر ہے تو
کیونکر پھوپھی جگر کو سنبھالے کدھر ہے تو

اٹھارواں برس تھا کہ موت آگئی تجھے
اے نورِ عین کس کی نظر کھا گئی تجھے

ہے ہے مرے سعید رشید و متین جواں — خوش رو جوان غریب جوان مہ جبین جواں
صفدر جوان شکیل جوان نازنین جواں — کس نے تجھے مروڑ لیا اے حسین جواں

آغاز تھیں سنین ابھی ایسے سن نہ تھے
بچے مرے ابھی ترے مرنے کے دن نہ تھے

یہ بین کرتی جاتی تھی وہ سوختہ جگر — سیدانیوں کا غول تھا پیچھے برہنہ سر
جاتی تھی ہیجو اس ادھر سے وہ نوحہ گر — آئے ادھر سے لاش لیے شاہ بحر و بر

دیکھا لہو رواں جو تن پاش پاش سے
سب بیبیاں لپٹ گئیں اکبر کی لاش سے

مناظر قدرت

عربی اور فارسی میں مناظر قدرت بہت کم لکھا گیا ہے، اور اُردو میں تو گویا سرے سے اُس کا وجود ہی نہ تھا، میر ضمیر نے سب سے پہلے اس پر طبع آزمائی کی لیکن وہ مضمون بندی اور استعارات کو کلام کا اصلی جوہر سمجھتے تھے اس لیے اصلی حالت نہ ادا کر سکے، میر انیس نے اس صنف پر اگرچہ صرف دو تین مرثیے لکھے ہیں، لیکن جو کچھ لکھا ہے، کمال کے درجہ پر پہونچا دیا ہے،

صبح کا سماں

طے کرچکا جو منزلِ شب کاروانِ صبح — ہونے لگا اُفق سے ہویدا نشانِ صبح
گردوں سے کوچ کرنے لگے اخترانِ صبح — ہر سو ہوئی بلند صدائے اذانِ صبح

پنہاں نظر سے روئے شبِ تار ہو گیا
عالم تمام مطلعِ انوار ہو گیا

خورشید نے جو رخ سے اٹھائی نقابِ شب	در کھل گیا سحر کا، ہوا بند بابِ شب
انجم کی فرد فرد سے لیکر حسابِ شب	دفتر کشائے صبح نے، الٹی کتابِ شب

گردون پہ رنگ چہرۂ مہتاب فق ہوا
سلطانِ غرب و شرق کا نظم و نسق ہوا

یون گلشنِ فلک سے ستارے ہوئے نہاں	چن لے چمن سے پھولون کو جس طرح باغباں
آئی بہار مین گلِ مہتاب پر خزاں	مرجھا کے رہ گئے ثمرِ شاخِ کہکشاں

دکھلائے طور، بادِ سحر نے سموم کے
پژمردہ ہو کے، رہ گئے غنچے نجوم کے

چھپنا وہ ماہتاب کا وہ صبح کا ظہور	یادِ خدا مین زمزمہ پردازیِ طیور
وہ رونق اور وہ سرد ہوا، وہ فضا وہ نور	خنکی ہو جس سے چشم کو، اور قلب کو سرور

انسان زمین پہ محو، ملک آسمان پر
جاری تھا، ذکرِ قدرتِ حق ہر زبان پر

وہ سرخی شفق کی ادھر چرخ پر بہار	وہ بارور درخت، وہ صحرا وہ سبزہ زار
شبنم کی وہ گلون پہ گہرہائے آبدار	پھولون سے سب بھرا ہوا دامانِ کوہسار

نافے کھلے ہوئے، وہ گلون کی شمیم کے
آتے تھے سرد سرد وہ جھونکے نسیم کے

تھی دشتِ کربلا کی زمین رشکِ آسماں	تھا دور دور تک شبِ مہتاب کا سماں
چھٹکے ہوئے ستارون کا ذرون پہ تھا گماں	نہرِ فرات بیچ مین تھی شکلِ کہکشاں

سرسبز جو درخت تھا وہ نخل طور تھا
صحرا کے ہر نہال کا سایہ بھی نور تھا

ایک اور موقع پر لکھتے ہین ؎

پھولا شفق سے چرخ پہ جب لالہ زار صبح
کرنے لگا فلک زرِ انجم نثار صبح
گذری شب خزان ہوا آئی بہار صبح
سرگرم ذکر حق ہوے طاعت گزار صبح

تھا چرخ اخضری پہ یہ رنگ آفتاب کا
کھلتا ہے جیسے پھول چمن مین گلاب کا

چلنا وہ باد صبح کے جھونکون کا دمبدم
وہ آب و تاب نہر وہ موجون کا پیچ و خم
مرغان باغ کی وہ خوش الحانیان بہم
سردی ہوا مین پر نہ زیادہ بہت نہ کم

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیون سے دامن صحرا بھرا ہوا

وہ صبح نور اور وہ صحرا وہ سبزہ زار
چلنا نسیم صبح کا رہ رہ کے بار بار
تھے طائرون کے غول درختون پہ بیشمار
کوکو وہ قمریون کی وہ طاؤس کی پکار

واں تھے دریچے باغ بہشت نعیم کے
ہر سو رواں تھے دشت مین جھونکے نسیم کے

آمد وہ آفتاب کی وہ صبح کا سماں
ذرون کی روشنی پہ ستارون کا تھا گماں
تھا جسکی ضو سے وجد مین طاؤس آسماں
نہر فرات بیچ مین تھی مثل کہکشاں

ہر نخل پر ضیائے سرِ کوہ طور تھی
گویا فلک سے بارش باران نور تھی

وہ پھولنا شفق کا وہ مینائے لاجورد
مخمل سی وہ گیاہ وہ گل سبز و سرخ و زرد

رکھتی تھی پھونک کر قدم اپنا ہوائے سرد ... یہ خوف تھا کہ دامنِ گل پر پڑے نہ گرد

دھوتا تھا دل کے داغ چمن لالہ زار کا
سردی جگر کو دیتا تھا سبزہ کچھار کا

ایک اور موقع پر بھی یہی سماں باندھتے ہیں ؎

وہ صبح اور وہ چھاؤں ستاروں کی اور وہ نور ... دیکھے تو غش کرے اَرِنی گوئے اوجِ طور
پیدا گلوں سے قدرتِ اللہ کا ظہور ... وہ جا بجا درختوں پہ تسبیح خوانِ طیور

گلشن خجل تھے، وادیِ مینو اساس سے
جنگل تھا سب بسا ہوا پھولوں کی باس سے

ٹھنڈی ہوا میں سبزۂ صحرا کی وہ لہک ... شرمائے جس سے اطلسِ زنگاریِ فلک
وہ جھومنا درختوں کا پھولوں کی وہ مہک ... ہر برگِ گل پہ قطرۂ شبنم کی وہ جھلک

ہیرے خجل تھے گوہرِ یکتا نثار تھے
پتے بھی ہر شجر کے جواہر نگار تھے

وہ نور اور وہ دشت سہانا سا، وہ فضا ... دُرّاج و کبک، و تیہو و طاؤس کی صدا
وہ جوشِ گل، وہ نالۂ مرغانِ خوش نوا ... سردی جگر کو بخشتی تھی صبح کی ہوا

پھولوں سے سبز سبز شجر سرخ پوش تھے
تھالے بھی نخل کے سبدِ گل فروش تھے

وہ دشت، وہ نسیم کے جھونکے، وہ سبزہ زار ... پھولوں پہ جا بجا وہ گہر ہائے آبدار
اُٹھنا وہ جھوم جھوم کے شاخوں کا بار بار ... بالائے نخل ایک جو بلبل تو گل ہزار

خواہاں تھے زیبِ گلشنِ زہرا جو آب کے
شبنم نے بھر دیے تھے کٹورے گلاب کے

وہ قمریون کا چار طرف سرو کے ہجوم / کوکو کا شور، نالۂ حق سرہ کی دھوم
سبحان ربنا کی صدا تھی علی العموم / جاری تھے وہ جو ان کی عبادت کی تھی رسوم

کچھ گل فقط نہ کرتے تھے رب علا کی مدح
ہر خار کو بھی نوک زبان تھی خدا کی مدح

چیونٹی بھی ہاتھ اٹھا کے یہ کہتی تھی بار بار / اے دانہ کش ضعیفون کے رازق ترے نثار
یا حی یا قدیر کی تھی ہر طرف پکار / تسبیح تھی کہین، کہین تہلیل کردگار

طائر ہوا مین مست، ہرن سبزہ زار مین
جنگل کے شیر گونج رہے تھے کچھار مین

گرمی کا سمان گرمی کا سمان شعرائے فارس نے باندھا ہی لیکن نہایت مبالغہ اور دور از کار خیالات سے کام لیا ہی۔ طالب آملی کا ایک قصیدہ ہی جس مین قصیدہ کی تشبیب، گرمی کے بیان سے شروع کی ہی ؎

چنان بخار زمین تیرہ ساخت آب زلال / کہ قطرہ بر لب جو می کند نیابت خال
ہوائے مہر ز تفسیدگی چنان گردید / کہ شعلہ از نفسش ہست بیم اضمحلال

مرزا صائب ایک قصیدہ مین گرمی کی شدت کا بیان کرتے ہوے لکھتے ہین ؎

نیست این فوارہ ہر سو جلوہ گر در حوض ہا / کردہ است از تشنگی بیرون زبان خویش آب

ایک اور شاعر نے نغز سی توجیہ خوب کی ہی ؎

گرد باد از پے آن مے جہد از جا کہ براہ / پاے می سوزدش از بسکہ زمین شد سوزان

میر انیس بھی، اگرچہ رواج عام کے اثر سے، نیچرل حالت سے جا بجا تجاوز کر گئے ہین تاہم ان کا اصلی جوہر بھی نمایان ہی ؎

وہ لون وہ آفتاب کی حدت وہ تاب و تب
کالا تھا رنگ دھوپ سے دن کا مثال شب
خود نہر علقمہ کے بھی سوکھے ہوئے تھے لب
خیمے جو تھے حبابون کے تپتے تھے سب کے سب
اُڑتی تھی خاک خشک تھا چشمہ حیات کا
کھولا ہوا تھا دھوپ سے پانی فرات کا

آب رواں سے مُنھ نہ اُٹھاتے تھے جانور
جنگل مین چھپتے پھرتے تھے طائر اِدھر اُدھر
مردم تھے سات پردون کے اندر عرق مین تر
خسخانۂ مژہ سے نکلتی نہ تھی نظر
گر آنکھ سے نکل کے ٹھہر جائے راہ مین
پڑ جائین لاکھ آبلے پائے نگاہ مین

کوسون کسی شجر مین نہ گل تھے نہ برگ و بار
ایک ایک نخل جل رہا تھا صورت چنار
ہنستا تھا کوئی گل، نہ لہکتا تھا سبزہ زار
کانٹا ہوئی تھی پھول کی ہر شاخ باردار
گرمی یہ تھی کہ زیست سے دل سب کے سرد تھے
پتے بھی مثل چہرۂ مدقوق زرد تھے

شیر اُٹھتے تھے نہ دھوپ کے مارے کچھار سے
آہو نہ مُنھ نکالتے تھے سبزہ زار سے
آئینہ مہر کا تھا مکدر غبار سے
گردون کو تپ چڑھی تھی زمین کے بخار سے
گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر
بھُن جاتا تھا، جو گرتا تھا دانہ زمین پر

گرداب پر تھا شعلۂ جوالہ کا گماں
انگارے تھے حباب تو پانی شرر فشاں
مُنھ سے نکل پڑی تھی ہر اک موج کی زباں
تہ مین تھے سب نہنگ مگر تھی لبون پہ جاں
پانی تھا آگ گرمی روزِ حساب تھی
ماہی جو سیخ موج تک آئی کباب تھی

آئینہ فلک کو نہ تھی تاب و تپ کی تاب | چھپنے کو برق چاہتا تھا دامن سحاب
سب سے سوا تھا گرم مزاجون کو اضطراب | کافور صبح ڈھونڈھتا پھرتا تھا آفتاب

بھڑکی تھی آگ گنبد چرخ اثیر تک
بادل چھپے تھے سب کرۂ زمہریر مین

جو لوگ کہتے ہین کہ میر انیس کے ہان خیال آفرینی اور مضمون بندی نہین ہو وہ ان اشعار مین سے اُن شعرون کو دیکھین، جہان نیچرل حالت سے ہٹ کر مبالغہ اور تکلف پیدا ہو گیا ہو۔

منظر

یعنی سین

کسی خاص واقعہ یا کسی خاص حالت کی تصویر کھینچنا جسکو انگریزی مین سین کہتے ہین، واقعہ نگاری کی ایک قسم ہو،

عام واقعہ نگاری اور سین مین یہ فرق ہو کہ واقعہ نگاری مین ہر واقعہ انفرادی حیثیت رکھتا ہو بخلاف اسکے سین اس کیفیت کا نام ہو جو متعدد واقعات یا واقعہ کے متعدد جزئیات کے مجموعہ سے پیدا ہوتی ہو، مثلاً اس شعر مین ؎

لو ن چلتی ہو خاک اُڑتی ہو ہو ظہر کا ہنگام | تنہا یہ چلی آتی ہو امنڈی سیہ شام

لو ن کا چلنا۔ خاک کا اُڑنا۔ ظہر کا وقت ہونا۔ فوجون کا اُمنڈنا۔ ہر چیز کو الگ الگ لیا جائے تو واقعہ ہو، اور ان سب کو مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو سین ہو۔

میر انیس نے شاعری کے اس صنف کو جس کمال تک پہونچا یا اردو کیا فارسی مین بھی اسکی بہت کم مثالین ملتی ہین، ہم چند مثالین ذیل مین درج کرتے ہین۔

مثال ا۔ حُر نزع کی حالت میں ہے، امام حسین علیہ السلام اُسکے سرہانے موجود ہیں

نزع کی حالت	اُسوقت کی حالت اور گفتگو سے

قبلہ رو بہ کیجیے لاشہ مرا اے قبلۂ دیں
کوچ نزدیک ہے اے بادشہِ عرش نشیں
پڑھیے یٰسین کہ اب ہے یہ دمِ بازپسیں
لیجیے تن سے نکلتی ہے مری جانِ حزیں
بات بھی اب تو زباں سے نہیں کیجاتی ہے
کچھ اُڑھا دیجیے مولا مجھے نیند آتی ہے

کہہ کے یہ گود میں شبیرؑ کے لی انگڑائی
شہ نے فرمایا ہمیں چھوڑ چلے اے بھائی
آیا ماتھے پہ عرق چہرہ پہ زردی چھائی
جل بسے حُر جری پھر نہ کچھ آواز آئی
طائرِ روح نے پرواز کی طوبا کی طرف
پتلیاں رہ گئیں پھر کر شہِ والا کی طرف

مثال ۲۔

گرمی کی شدت میں لوگوں کی حالت

وہ گرمیوں کے دن وہ پہاڑوں کی آنچ سخت
ڈوبے ہوئے پسینوں میں بناروں کے رخت
پانی نہ منزلوں، نہ کہیں سایۂ درخت
سنولا گئے ہیں رنگ جوانانِ نیک بخت
راکب عبا میں چاند سے چہروں پہ ڈالے ہیں
لو سے ہوئے تند زبانیں نکالے ہیں

وہ دن ہیں جن دنوں کوئی کرتا نہیں سفر
رنجِ مسافرت میں ہیں سلطانِ بحر و بر
صحرا کے جانور بھی نہیں چھوڑتے ہیں گھر
لب برگِ گل سے خشک ہیں چہرے عرق میں تر
آتی ہے خاک اُڑ کے ہمیں دلسار سے
گیسوئے مشکبار اَٹے ہیں غبار سے

اہلِ حرم ہیں ہودج و محمل میں بے قرار
معصوم پانی مانگتے ہیں رو کے بار بار
بانو پکارتی ہے کہ اے شاہِ نامدار
گرمی سے جان بلب ہے مرا طفلِ شیرخوار
کیونکر یہ دکھ اُٹھے چھ مہینہ کی جان سے
گرمی ہے یا برستی ہے آگ آسمان سے

چلاتی ہے سکینہ کہ اچھے مرے چچا
محمل میں گھٹ گئی مجھے گودی میں لو ذرا
بابا سے کہدو اب کہیں خیمہ کریں بپا
ٹھنڈی ہوا میں لے کے چلو تم پہ میں فدا
سایہ کسی جگہ ہے نہ چشمہ نہ آب ہے
تم تو ہوا میں ہو مری حالت خراب ہے

مثال ۳،

صغیر السن بچہ تشنگی کی حالت میں

راوی نے یہ لکھا ہے کہ اس دم بحالِ زار
لائے حسین ہاتھوں پہ اک طفلِ شیرخوار
دن کو ہوا قرانِ مہ و مہر آشکار
مُرجھا گیا تھا پیاس سے لیکن وہ گلعذار
تھا فرطِ غش سے ننھا سا منہ کا ڈھلا ہوا
باندھے ہوئے تھا مٹھیاں اور منھ کھلا ہوا

چھوٹا سا ایک سبز عمامہ تھا دوش پر
ماتھا جھنڈولے بالوں میں ہالے میں جوں قمر
جٹی بھویں وہ جن پہ تصدق دلِ پدر
آنکھیں تو نرگسی پہ نقاہت زیادہ تر
سایہ میں دامنِ خلفِ بوتراب کے
رُخسار تھے کہ پھول کھلے تھے گلاب کے

پھیلا ہوا وہ آنکھوں میں کاجل ادھر اُدھر
خشکیدہ ہونٹھ ہوئے مژہ آنسوؤں سی تر
باچھوں سے تھا نمود جسے دودھ کا اثر
ہاتھوں میں نیلے ڈورے تھے ہیکل تھی سینہ پر

تھے سے دل کو ماں کے بچھڑنے کا درد تھا
رن کی ہوائے گرم سے جسم اُس کا سرد تھا

کرتا بدن میں آتا تھا اِس رنگ سے نظر
پڑتی ہے اوس پھولوں پہ جیسے دمِ سحر
سینہ تھا صاف صورتِ آئینہ جلوہ گر
گرمی سے ہوگیا تھا شلوکہ عرق میں تر

چھاتی میں دمبدم جو دم اُس کا اٹکتا تھا
گھبرا کے ننھے ہاتھوں کو دے دے پٹکتا تھا

مثال ۴-

فوجوں کی آمد و جنگ کی تیاری

ہے شور آمدِ فوجِ ناوک سریر
فوجوں کی ہر طرف سے چلی آتی ہے بھیر
دعوت کے واسطے ہیں سنانیں لیے شریر
حضرت کی پیشکش کو کمانیں ہیں اور تیر

پانی پہ جو کبان ستم آرا بٹھائے ہیں
دریا کے گھاٹ برچھیوں سے رد کے جاتے ہیں

شقے گئے ہیں شام کے حاکم کے جابجا
ہر پرگنہ سے ہے طلب لشکر جفا
آکر اُمڈتی جاتی ہیں فوجیں جدا جدا
لیتا ہے جائزہ عمر سعد بے حیا

غل ہے کریں گے قتل جو زہرا کے ماہ کو
انعام میں ملے گا دو ماہہ سپاہ کو

تیغیں سلاح خانے سے نکلی ہیں بے بہا
ہے جابجا درستی اسباب کارزار
ہوتے ہیں لیس تیروں کے ترکش کئی ہزار
خنجر ہوئے ہیں زہر کو پیاسوں کے آبدار

نوکیں نکالی جاتی ہیں تیروں کی سان پر
پھل برچھیوں پہ چڑھتے ہیں پرچم نشان پر

نقارۂ وغا پہ لگی چوب یک بیک — اُٹھا غریو کوس کہ ہلنے لگے فلک
شہپور کی صدا سے ہراسان ہوئی ملک — قرنا پھنکی کہ گونج اُٹھا دشت یک بیک
شورِ دہل سے حشر بپا تھا افلاک کے تلے
مُردے بھی ڈر کے چونک پڑے خاک کے تلے

حد سے فزون تھی کثرتِ افواجِ نابکار — نیزہ پہ نیزہ تیغ پہ تھی تیغ آبدار
ہر سمت تھی سنان پہ سنان مثل خارزار — ہر صف مین تھی سپر پہ سپر مثل لالہ زار
پیکان بہم تھے جیسے ہون گل بے کھلے ہوے
گوشون سے تھے کمانون کے چلّے ملے ہوے

اُمڈی ہوئی تھی فوج پہ فوج اور دل پہ دل — تھے برچھیون کی صورتِ مقراض کھل پہ کھل
خنجر وہ جن کی آب مین ہر تھی اجل — وہ گرز جن کے ڈر سے گرے دیو سر کے بل
دو دو تبر تھے پاس ہر اِک خود پسند کے
حلقون پہ تھے بچھے ہوے حلقے کمند کے

مثال ۵

سفر کی تیاری

آراستہ ہین بہرِ سفر سروِ قبا پوش — عمامے سرون پر ہین عبائین ہین بر دوش
یاران وطن ہوتے ہین آپس مین ہم آغوش — حیران کوئی تصویر کی صورت کوئی خاموش
منھ ملتا ہے رو رو کے کوئی سرور کے قدم پر
گر پڑتا ہے کوئی علی اکبرؑ کے قدم پر

عباسؑ کا منھ دیکھ کے کہتا ہے کوئی آہ — اب آنکھون سے چھپ جائیگی تصویر ید اللہ
کہتے ہین گلے مل کے یہ قاسمؑ کے ہوا خواہ — واللہ دلون پر ہے عجب صدمہ جانکاہ

ہمسفرون کی وداعی ملاقات

ہم لوگوں سے شیریں سخنی کون کرے گا
یہ انس یہ خلقِ حسنی کون کرے گا

روتے ہیں وہ جو عونؑ و محمدؑ کے ہیں ہمسن
کہتے ہیں کہ مکتب میں نہ جی بہلے گا تم بن
اس داغ سے چین آئے ہمیں یہ نہیں ممکن
گرمی کا مہینہ ہے، سفر کے یہ نہیں دن
تم حضرت شبیرؑ کے سایہ میں پلے ہو
کیوں دھوپ کی تکلیف اٹھانے کو چلے ہو

ہمجولیوں سے کہتے ہیں وہ دونوں برادر
ہاں بھائیو تم بھی ہمیں یاد آؤ گے اکثر
پالا ہے ہمیں شاہ نے ہم جائیں نہ کیونکر
ماموں ہیں جنگل میں تو اپنا ہے وہی گھر
وہ دن ہو کہ ہم حق غلامی سے ادا ہوں
تم بھی یہ دعا مانگو کہ ہم شہ پہ فدا ہوں

رخصت کے لیے لوگ چلے آتے ہیں پیہم
ہر قلب حزیں ہے تو ہر اک چشم ہے پرنم
ایسا نہیں گھر کوئی کہ جس میں نہیں ماتم
غل ہے کہ چلا دلبرِ مخدومۂ عالم
خدام کھڑے پیٹتے ہیں قبر نبیؐ کے
روضہ پہ اداسی ہے رسول عربیؐ کے

سفر کی تیاری اور سواری کی تقسیم

تدبیر سفر میں ہیں ادھر سبط پیمبرؐ
گھر میں کبھی آتے ہیں کبھی جاتے ہیں باہر
اسباب نکلواتے ہیں عباسؑ دلاور
تقسیم سواری کے تردد میں ہیں اکبرؑ
شہ کو جنھیں لیجانا ہے وہ پاتے ہیں گھوڑے
خالی ہوا اصطبل چلے آتے ہیں گھوڑے

حاضر درِ دولت پہ ہیں سب یاور و انصار
کوئی تو کمر باندھتا ہے اور کوئی ہتیار
ہودج بھی کسے جاتے ہیں محمل بھی ہیں تیار
چلاتے ہیں دربان کوئی آئے نہ خبردار

سر محمل و ہودج پہ گھٹا ٹوپ پڑے ہین
پردے کی قناتین لیے فراش کھڑے ہین

عورتین کیونکر رخصت ہوتی ہین

عورات محلہ چلی آتی ہین بصد غم
کہتی ہین یہ دن رحلت زہراؑ سے نہین کم
پرسے کی طرح رونے کا غل ہوتا ہے ہر دم
فرش اُٹھتا ہے کیا بچھتی ہے گویا صف ماتم
غل ہوتا ہے ہر سمت جدا ہوتی ہے زینبؑ
ہر اک کے گلے ملتی ہے اور روتی ہے زینبؑ

عورتون کا سمجھانا کہ یہ سفر کے دن نہین

لے لے کے بلائین یہی سب کرتی ہین تقریر
اس گرمی کے موسم مین کہان جاتے ہین شبیرؑ
سمجھاتی نہین بھائی کو اے شاہ کی ہمشیر
مسلمؑ کا خط آلے تو کرین کوچ کی تدبیر
للہ ابھی قبر پیمبرؐ کو نہ چھوڑین
گھر فاطمہ زہراؑ کا ہے اس گھر کو نہ چھوڑین

اُجڑے گا مدینہ جو یہ گھر ہوئے گا خالی
بربادی یثرب کی بنا چرخ نے ڈالی
کیا جانین کہ پھر آئین نہ آئین شہ عالی
حضرت کے سوا کون ہے اس شہر کا والی
زہراؑ ہین نہ حیدرؑ نہ پیمبرؐ نہ حسنؑ ہین
اب اُن کی جگہ آپ ہین یا شاہ زمن ہین

گرمی کے یہ دن اور پہاڑون کا سفر آہ
ان چھوٹے سے بچون کا نگہبان ہے اللہ
رستے کی مشقت سے کہان ہین کبھی آگاہ
ان کو تو نہ لیجائین سفر مین شہ ذیجاہ
قطرہ بھی دم تشنہ دہانی نہین ملتا
کوسون تلک اس راہ مین پانی نہین ملتا

منھ دیکھ کے اصغرؑ کا چلا آتا ہے رونا
آرام سے مادر کی کہان گود مین سونا
جھولا یہ کہان اور کہان نرم بچھونا
لکھا تھا اسی سن مین مسافر انھین ہونا

کیا ہوگا جو میدان میں ہوا گرم چلے گی
یہ پھول سے کمھلائیں گے ماں ہاتھ ملے گی

اُن بی بیوں سے کہتی تھی یہ شاہ کی ہمشیر
اِس شہر میں رہنا نہیں ملتا کسی تدبیر
بھنوں ہمیں خیر سے لے جاتی ہے تقدیر
یہ خط یہ خط آئے ہیں کہ مجبور ہیں شبیرؑ

مجکو بھی ہے رنج ایسا کہ کچھ کہہ نہیں سکتی
بھائی سے جدا ہو کے مگر رہ نہیں سکتی

مثال ۶

گرمی اور گرمی کی شدت میں زن و مرد اور بچوں کی حالت

گرمی کی شدت

تھی تھے سے شدت گرما سے شجر میں
نہ بحر میں راحت تھی کسی دل کو نہ بر میں
جلتی تھی یہ لون آگ بھڑکتی تھی جگر میں
جھیلوں میں نہ پانی تھا نہ پتے تھے شجر میں

پایاب تھے گرمی سے وہ دریا جو بڑے تھے
سوتیں بھی نہ آتی تھیں کنوئیں خشک پڑے تھے

پتھر کی چٹانوں سے نکلتے تھے شرارے
ڈوبے تھے عرق میں اسد اللہ کے پیارے
ناری تھی ہوا، سبز شجر زرد تھے سارے
دھڑکا تھا کہ یہ لون کسی بچے کو نہ مارے

ہوش آتا نہ تھا اصغر معصوم کو غش سے
اوڑے تھے لب لعل سگینہ کے عطش سے

گرمی کی شدت سے ایک بزرگ شخص کی حالت

تھا گرمی کی حدت سے یہ حال شہ ابرار
تحمید میں جنبان تھے لب لعل گہر بار
ماتھے سے ٹپکتا تھا عرق سُرخ تھے رُخسار
بھر کر نفس سرد یہ فرماتے تھے ہر بار

اک پھول بھی زہرا کے چمن میں نہ ملیگا
کیا ہوگا جو پانی کسی بن میں نہ ملیگا

گرمی سے یہ تھا حضرت عباسؑ کا عالم
منھ سرخ تھا اور ہانپتے تھے صورت ضیغم
چہرہ بھی عرق ناک تھا، اور طبع بھی برہم
فرماتے تھے اشک آنکھوں میں بھر کر شہ عالم
تم شیر ہو راحت تمھیں بھائی نہ ملے گی
جب تک کسی دریا کی ترائی نہ ملے گی

یوں اکبرؑ مہرو تھے پسینہ میں نہائے
جیسے تپ محرق میں جوان کو عرق آئے
جب پھکنے لگا دل تو سخن لب پہ یہ لائے
رب دو جہان حشر کی گرمی سے بچائے
گھٹے گا ہر اک دم تپش دل سے قلق میں
سب تا بہ کمر ڈوبے ہوئے ہونگے عرق میں

حضرت کو سکینہؑ یہ صدا دیتی تھی پیہم
محمل میں گھٹا جاتا ہے، گرمی سے مرا دم
سب ڈوب گئی ہوں یہ پسینے کا ہے عالم
برسے گی یوں ہی آگ تو جینے کے نہیں ہم
ہیں ابر کرم آپ کرم کیجیے بابا
سایہ کہیں مل جائے تو دم لیجیے بابا

سنکر یہ بھتیجی کی صدا حضرت عباسؑ
کہتے تھے چچا صدقے ہو، رد ہو بلا [illegible]
لو پانی پیو تم کو لگی ہو جو بہت پیاس
دم گھٹتا ہے محمل میں تو آجاؤ مرے پاس
تکلیف تمھاری ہمیں منظور نہیں ہے
دن ڈھلتا ہے منزل بھی بس اب دور نہیں ہے

مشکیں لیے سقے جو سواری کے تھے ہمراہ
چھڑکاتے تھے پانی پئے فوج شہ ذیجاہ
جس طرح کہ پیاسوں کا ہو مجمع بہ سر راہ
پانی پہ گرے پڑتے تھے یوں تشنہ ہوا خواہ
جنگل میں عطش کا جو تھا صدمہ کہ و مہ پر
چہرے پہ چھڑکتا تھا کوئی کوئی زرہ پر

گرمی سے بچّے کی بے‌چینی

بھرتا تھا دمِ سرد، پریشان کوئی ہو کے — دامن سے ہوا دیتا تھا مُنھ کو کوئی دھو کے
بچتا تھا کوئی لون سے ردا چہرے پہ رکھ کے — رکھ لیتا تھا سر پر کوئی رومال بھگو کے
پڑتی تھیں جو چھینٹیں تو مزہ دیتا تھا پانی
جھک کر کوئی چُلّو ہی سے پی لیتا تھا پانی

کہتے تھے فرزندون کے آ کر شہِ ابرار — حاضر ہے جو پانی کسی بی بی کو ہو درکار
آندھی ہے گھٹا ٹوپ اُڑے جاتے ہیں ہر بار — اے بنتِ یداللہ سکینہؑ سے خبردار
رستا یہ پہاڑون کا ہے منزل یہ کڑی ہے
بچّون کو چھپائے رہو لون آج بڑی ہے

محمل سے نظر کر کے یداللہ کی جائی — کہتی تھی کہ اللہ نے یہ شکل دکھائی
جس دن سے چھٹا گھر کہیں راحت نہیں پائی — فریاد بہن دھوپ میں سنولا گئے بھائی
کیا بن گئی جنگل میں امامِ دوسرا پر
سایہ بھی درختون کا نہیں ظلِ ہما پر

صدقے گئی جنگل کی نہ اب دھوپ میں چلیے — دن کاٹیے سایہ میں کہیں رات کو چلیے
منھ دھو لیے دم لیجیے پوشاک بدلیے — لون چلتی ہے آفت کی پہاڑون سے نکلیے
ناشاد بہن آپ کی غربت پہ فدا ہو
بچّہ کوئی گر تونس کے مر جائے تو کیا ہو

مثال ۷۔

لڑائی کی تیاری

طبلِ جنگ بجنے پر شجاعوں کی حالت ہوتی ہے

یہ ذکر تھا کہ بجنے لگا طبل اس طرف — مشکل کشا کی فوج نے باندھی ادھر بھی صف
تیرون نے رُخ کیا سوئے ابنِ شہِ نجف — سینون کو غازیون نے ادھر کر دیا ہدف

تھا بسکہ شوق جنگ ہر اک رشک ماہ کو
جوش آگیا وغا کا حسینی سپاہ کو

غصے سے آفتاب ہوئے مہوشون کے رنگ
فوجون پہ جا پڑین یہ دلون کو ہوئی امنگ
تن تن کے برچھیان جو سنبھالین برائے جنگ
بے چین ہو گئے فرس ابلق دُمرنگ
پاس ادب سے شاہ کی صف بڑھ کے تھم گئی
ایڑی ہر اک سوار کی گھوڑے پہ جم گئی

تنتا ہوا بڑھا کوئی قبضہ کو چوم کے
بھالا کسی نے رکھ لیا کاندھے پہ جھوم کے
بولا کوئی یہ غول ہین کیا شام و روم کے
ٹکڑے اڑائین گے عمر و شمر شوم کے
نامرد جو ہین آنکھ چُراتے ہین مرد سے
دونون کو پیار کرکے پھرینگے نبرد سے

دولہا سے نظر کسی غازی کی لڑ گئی
بل کھا کے زلف رخ پہ کسی کے اکڑ گئی
چتون کسی کی شور دل سے بگڑ گئی
منھ سرخ ہو گیا شکن ابرو پہ پڑ گئی
نکلا کوئی سمند کو رانون مین داب کے
غصے سے رہ گیا کوئی ہونٹون کو چاب کے

بڑھ کر کسی نے تیر ملایا کمان سے
نیزہ کوئی ہلانے لگا آن بان سے
نعرہ کسی کا پار ہوا آسمان سے
تلوار کھینچ لی کسی صفدر نے میان سے
اک شور تھا کہ تلخ کیا ہے حیات کو
لاشون سے چل کے پاٹ دو نہر فرات کو

سنتے ہی یہ کلام جوانان نامور
لڑنے لگے الگ کھڑے ہوئے غول اپنا باندھ کر
کہتے تھے نیچے لیے وہ غیرت قمر
یارب شکست فوجون کو دے اور ہمین ظفر

سر کے نہ جبر دغا میں جو بڑھ کے قدم گڑے
جا کر در یزید پہ اپنا علم گڑے

مثال ۸

بیکسی اور تنہائی

حضرت پہ ادھر ہوتی ہے اعدا کی چڑھائی
سیدانیاں دیتی ہیں محمد کی دہائی
تنہا ہیں نہ بیٹا نہ بھتیجا ہے نہ بھائی
اعدا میں یہ غل ہے کہ کرو ختم لڑائی

ڈوبے ہوئے خوں میں شہدا گرد پڑے ہیں
گھوڑے پہ اکیلے شہ ابرار کھڑے ہیں

ہے تابشِ خورسے عرق افشاں رخِ گلفام
یوں جلتی ہے خاک اڑتی ہے ہے ظہر کا ہنگام
لب خشک ہیں پانی کا میسر نہیں اک جام
تنہا پہ چلی آتی ہے امنڈی سپہ شام

یہ شوقِ شہادت ہے شہنشاہ زمن کو
بوچھار سے تیروں کے بچاتے نہیں تن کو

ہیں آگ میں تیغوں کے کھڑے پر نہیں کچھ غم
ہیں گردِ بیابان میں اٹے گیسوئے پرخم
امت پہ نہ آنچ آئے دعا ہے یہی ہر دم
نیلے ہیں لبِ لعل یہ ہے پیاس کا عالم

بو آتی ہے دریا سے برادر کے لہو کی
چھینٹیں ہیں قبا پر علی اکبرؑ کے لہو کی

ذکرِ غمِ عباسؑ بھی اصلا نہیں کرتے
خونِ علی اکبرؑ کا بھی دعوا نہیں کرتے
غیرت سے نظر جانب دریا نہیں کرتے
امت کے یہ ہیں ظلم پہ شکوا نہیں کرتے

پانی کے بھی طالب نہیں گو تشنہ دہن ہیں
لکھے ہیں نصیحت کے محبت کے سخن ہیں

مثال ۹

فوج کا داخلہ اور تیاری جنگ

خیمہ میں اُترے یان تو شہ عرش بارگاہ
آ آکے اُس طرف بھی اُترنے لگی سپاہ
کوسون علم کھُلے تھے جدھر کیجیے نگاہ
یان تک کہ بند ہوگئی چارون طرف سے راہ
فوجون سے تا بہ صبح زمین رن کی بھر گئی
اِک رات مین چڑھی ہوئی ندی اُتر گئی

اِس کثرتِ سپاہ پہ ناگہ ہوئی یہ دھوم
آ پہونچا شام سے پسر سعد نحس و شوم
جسکی جلو مین لاکھ سوارون کا ہے ہجوم
لشکر مین ہیں یہ تازجوانانِ شام و روم
بس کھُل گیا نہ طورِ صفائی کا ہوئے گا
اب کل سے بند و بست لڑائی کا ہوئے گا

یہ ذکر تھا کہ دوسرے ظاہر ہوئے نشاں
اُمڈا زمین پہ ظلم کا دریاے بیکراں
موجون کی طرح سب تھین صفین پیش و پس رواں
لہراتے تھے ہوا سے علم مثل بادباں
بلتا تھا دشت گیبن دہل اسطرح بجتے تھے
باجون کا شور یہ تھا کہ بادل گرجتے تھے

جنگی وہ رومیون سے بری شامیوں کے دل
خوفِ خدا نہ جن کو نہ اندیشۂ اجل
مکار و اہل نار و دغا باز و بد عمل
شکلین مہیب دیو سے قد ابر فتن پہ بل
بدخواہِ خاندانِ رسالت پناہ تھے
ایسے جلے ہوئے تھے کہ چہرے سیاہ تھے

تلوارین کھینچے چڑھ کے جمے ہر طرف سوار
غل ہوگیا سلامی کے باجون کا ایک بار
ڈنکے کی دمبدم تھی صدا آسمان کے پار
آگے بڑھے جلو میں نقیبون کی تھی پکار

گھوڑون کے گرد پیش رئیسان شام تھے
زرّین کمر جلو مین کئی سو غلام تھے

مثال ۱۰۔ حضرت عباسؑ نہر سے مشک بھر چکے ہین اور واپس آنا چاہتے ہین دشمن یہ دیکھ کر ہر طرف سے ٹوٹ پڑتے ہین حضرت عباسؑ اس کشمکش مین ہین کہ آپ کو بچائین یا مشک کو سنبھالین اُس وقت کے مضطربانہ حرکات کی تصویر ہے

اک تشنہ کام لاکھون مین کس کس کو دے جواب
شل ہو گیا تھا بازوے فرزند بوتراب
کہتا تھا ہاتھ اُٹھنے کی مجھ مین نہین ہے تاب
لڑنے مین فکر تھی کہ نہ ضائع ہو مشک آب

پڑتا تھی جو بازوؤن پہ تیر کھاتے تھے
لیکن سپر سے مشک سکینہ بچاتے تھے

برچھی سے چھد گیا کبھی دل اور جگر کبھی
اک تیر سے اِدھر کبھی چھیدے اُدھر کبھی
چھاتی تلے تھی مشک کبھی دوش پر کبھی
سینہ کبھی تھا مشک کے اوپر سپر کبھی

رہوار پر سنبھلتے تھے جب جھوم جھوم کے
روتے تھے بازوؤن کو علیؑ چوم چوم کے

تکتے تھے مُسکرا کے سوے آسمان کبھی
ہونٹون پہ پھیر لیتے تھے سوکھی زبان کبھی
لگتا تھا تن پہ تیر کبھی اور سنان کبھی
جُھکتے تھے خود فرس سے کبھی اور نشان کبھی

گھوڑے کو جب بڑھاتے تھے رانون مین داب کے
قدمون سے نکلے جاتے تھے حلقے رکاب کے

چھینٹین لہو کی اُڑ کے جو پڑتی تھین مشک پر
دامن سے پونچھتے تھے علمدار نامور
یہ پاس تھا کہ تنون سے ٹکڑے ہو سراسر
شقہ مگر علم کا لہو سے نہ ہووے تر

اقبال بادشاہ زمین و زمان رہے
دُنیا مین جب تلک ہو شہِ مومن یہ نشان ہے

گر کر کبھی اُٹھے، کبھی رکھا زمیں پہ سر
اُبلا کبھی لہو، تو سنبھالا کبھی جگر
حسرت سے کی اُخیام کی جانب کبھی نظر
کروٹ کبھی تڑپ کے اِدھر لی، کبھی اُدھر
اُٹھ بیٹھے جب، تو زخموں سے برچھی کے پھل گرے
تیر اور تن میں گڑ گئے، جب مُنھ کے بل گرے

مثال ۱۱

پردہ کا اہتمام

بیت الشرف خاص سے نکلے شہ ابرار
روتے ہوئے ڈیوڑھی پہ گئے عترت اطہار
فراشوں کو عباسؑ پکارے یہ بتکرار
پردے کی قناتوں سے خبردار خبردار
باہر حرم آتے ہیں رسول دوسرا کے
شقہ کوئی جھک جائے نہ جھونکے سے ہوا کے

لڑکا بھی جو کوٹھے پہ چڑھا ہو وہ اُتر جائے
آتا ہو ادھر جو وہ اُسی جا پہ ٹھہر جائے
نلقے پہ بھی کوئی نہ برابر سے گذر جائے
دیتے رہو آواز جہاں تک کہ نظر جائے
مریمؑ سے سوا حق نے شرف اُن کو دیے ہیں
افلاک پہ آنکھوں کو ملک بند کیے ہیں

آ پہنچی جو ناقے کے قریں دُختر حیدرؑ
خود ہاتھ پکڑنے کو بڑھا سبط پیمبرؐ
فضّہ تو سنبھالے ہوئے تھی گوشۂ چادر
تھے پردۂ محمل کو اُٹھائے علی اکبرؑ
فرزند کمر بستہ چپ و راست کھڑے تھے
نعلین اُٹھا لینے کو عباسؑ کھڑے تھے

مثال ۱۲

مستورات کا محمل سے اُترنا

جمازۂ زینبؑ جو قریب ڈیوڑھی کے پہونچا
کرسی سے اٹھے آپ شہِ یثرب و بطحا
گرد آکے کیا قاسمؑ و عباسؑ نے پردا
محمل سے اترنے جو لگی دخترِ زہراؑ
اک ہاتھ علی اکبرؑ ذی جاہ نے تھاما
اک ہاتھ جگر بندِ ید اللہ نے تھاما

چھاتی سے سکینہ کو لگائے ہوئے اتریں
آنسو رخِ انور پہ بہائے ہوئے اتریں
شہزادی کو چادر میں چھپائے ہوئے اتریں
پردا تھا مگر سر کو جھکائے ہوئے اتریں

مثال ۱۳- عون و محمد میدانِ جنگ میں لڑ رہے ہیں، سیدانیاں دروازہ پر بدحواس کھڑی ہیں، حضرت زینبؑ فضہ سے پوچھتی ہیں کہ میرے بچے کیا کر رہے ہیں، وہ جواب دیتی ہیں ؎

سیدانیاں دروازہ پہ تھیں کھولے ہوئے سر
اصغر کو لیے کانپتی تھی بانوے بے پر
فضہ تھی پریشان کیے مو خیمے کے اندر
پردہ سے لگی کہتی تھی یہ شاہ کی دختر
بتلا تجھے، بچے مرے کیا کرتے ہیں دونوں
وہ کہتی تھی لاکھوں سے وغا کرتے ہیں دونوں

وہ رخ پہ نظر آتے ہیں، اڑتے ہوئے گیسو
وہ تیغے بجلی کی طرح گرتے ہیں ہر سو
ڈھالیں لیے وہ بھاگتے پھرتے ہیں جفاجو
وہ ابر میں چھپ چھپ کے نکل آتے ہیں ہر سو
بہتا ہے لہو چھاتیوں سے، چور ہیں دونوں
کس طرح پکاروں کہ بہت دور ہیں دونوں

مثال ۱۴- حضرت عباسؑ نہر کے کنارے پہونچے ہیں، گھوڑا کئی دن کا پیاسا تھا، پانی دیکھ کر بیتاب ہو گیا ہے، لیکن چونکہ تمام قافلہ پیاسا ہے حضرت عباسؑ اس کو پانی پینے سے روکتے ہیں۔ اس وقت گھوڑے کی حالت ؎

دو دن سے بے زباں پہ جو تھا آب و دانہ بند
ہر بار کانپتا تھا سمٹتا تھا بند بند
دریا کو ہنہنا کے لگا دیکھنے سمند
چمکا رہے تھے حضرت عباسؑ ارجمند
تڑپاتا تھا جگر کو جو شور آبشار کا
گردن پھرا کے دیکھتا تھا منہ سوار کا

مثال ۱۵۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کا میدان کربلا میں داخلہ رفقا سے خطاب اور نوجوانوں کی سیر و تفریح سے

اُترا یہ کہہ کے کشتیِ اُمت کا ناخدا
حضرت نے مسکرا کے یہ ہر ایک سے کہا
جتنے سوار تھے وہ ہوئے سب پیادہ پا
دیکھو تو کیا ترائی ہے؟ کیا نہر ہے؟ کیا فضا؟
اکبرؑ شگفتہ ہو گئے صحرا کو دیکھ کر
عباسؑ جھومنے لگے دریا کو دیکھ کر

بولے یہ اشک بھر کے شہنشاہ سربلند
کی مسکرا کے عرض کہ اے شاہ ارجمند
کیوں یہ مقام ہے تمہیں شاید بہت پسند
بس یاں تو خود بخود ہوئی جاتی ہے آنکھ بند
شیر اب یہیں رہیں گے عنایت جو رب کی ہے
میں کیا کہوں حضور ترائی غضب کی ہے

روتے ہوئے وہاں سے بڑھے آپ چند گام
انجم کی طرح گرد تھے حیدرؑ کے لالہ فام
گویا زمیں کی سیر کو اُترا مہِ تمام
شکلیں وہ نور کی وہ تجمل وہ احتشام
زلفیں ہوا میں اُڑتی تھیں ہاتھوں میں ہاتھ تھے
لڑکے بھی بند کھولے ہوئے ساتھ ساتھ تھے

مثال ۱۶

تمام رفقا کی شہادت کے بعد، حضرت امام حسینؑ کی بیکسی اور دشمنوں کا نرغہ۔

سو سو خانۂ زہراؑ پہ تباہی ہے آج — گھر پہ سادات کے پانی کی منا ہی ہے آج
تن تنہا خلفِ شیرِ الٰہی ہے آج — خلق سے سبطِ نبیؐ خلد کو راہی ہے آج
قتل کی بیکس و مظلوم کی تدبیریں ہیں
اک نبیؐ زادہ ہے اور سیکڑوں شمشیریں ہیں

نیزے تانے ہوئے اُمڈے چلے آتے ہیں سوار — ہیں کماندار پرا باندھے ہوئے تیس ہزار
تیغیں کھینچے ہوئے گرد کھڑے ہیں جو سوار — غل ہے مہلت نہ ملے سبطِ نبیؐ کو زنہار
برق شمشیر ہر اک جا پہ چمک جاتی ہے
جس طرف دیکھتے ہیں موت نظر آتی ہے

نہ ہے غمخوار نہ ہمدرد نہ یاور کوئی — نہ بھتیجا ہے نہ بیٹا نہ برادر کوئی
نہیں اتنا ہے خبر پوچھے جو آ کر کوئی — ایک اللہ تو ہے اور نہیں سر پر کوئی
تھے جو غمخوار وہ ریتی پہ پڑے سوتے ہیں
اپنی تنہائی پہ شاہِ دوجہاں روتے ہیں

جسم پر تیغ لگاتا ہے کوئی اور کوئی تیر — خون میں سر تا بقدم تر ہیں جنابِ شبیرؑ
رو کے فرماتے ہیں اعدا سے کہ اے قوم شریر — کیا گنہ ہے مجھے کیوں مارتے ہو بے تقصیر
یوں ستاؤ نہ کہ میں مرگ پہ آمادہ ہوں
تم کو لازم ہے کہ شیدا ہو نبیؐ زادہ ہوں

کوئی سنتا نہیں فریادِ امامِ عالی — برچھیاں چلتی ہیں ہوتے ہیں ترکش خالی
ماہِ زہراؑ پہ فلک نے یہ مصیبت ڈالی — خون میں غرق ہیں ہیں نانا پریشاں حالی
زخم تلواروں کے خاموش کھڑے کھاتے ہیں
غش میں جھکتے ہیں کبھی گاہ سنبھل جاتے ہیں

لاشۂ اکبرؑ و عباسؑ جو آتا ہے نظر
رو کے فرماتے ہیں بیٹے سے کہ اے جانِ پدر
تھام لیتے ہیں کلیجہ کبھی اور گاہ جگر
ایسے غافل سوتے ہو لیتے نہیں بابا کی خبر
مرے پیارے مرے جانی مرے دلبر اُٹھو
ہم پہ تنہائی ہے اُٹھو علی اکبرؑ اُٹھو

لاش عباسؑ سے کرتے ہیں بصد یاس ملال
وقت امداد و اعانت ہے برادر قرباں
اے مرے یار وفادار مرے شیر جواں
چھوڑ کر ہم کو لعینوں میں سدھارے ہو کہاں
لاکھ ملعونوں نے میدان میں ہمیں گھیرا ہے
تم نے بھائی اسے عجب وقت میں منہ پھیرا ہے

کہتے تھے اہلِ ستم حال سناتے ہو کسے
کون ہے بیکس و مظلوم دکھاتے ہو کسے
مر گئے اکبرؑ و عباسؑ بلاتے ہو کسے
چونکتے ہیں کہیں مُردے بھی جگاتے ہو کسے
حلق پر خنجرِ خونخوار پھرا دیتے ہیں
اب تمہیں بھی اسی مقتل میں گرا دیتے ہیں

رو کے فرماتے ہیں یہ فوجِ ستمگار سے شاہ
غم میں اپنوں کے میں کیونکر نہ کروں نالہ و آہ
ذبح ہونے کی مجھے عید ہے خالق ہے گواہ
اُن کو رو دوں گا میں جب تک کہ جیوں گا واللہ
بھولتا ہے کوئی اس طرح کے غمخواروں کو
یاد کرتے ہیں وفادار وفاداروں کو

دشت میں جلتی ہے لُو دھوپ کی شدت ہے کمال
سرخ ہے خون سے قبا دھوپ سے رخسار ہے لال
جیٹھ بیساکھ کے ایام ہیں اور وقتِ زوال
نکلی آتی ہے زباں منہ سے یہ ہے پیاس کا حال
تن جلا جاتا ہے جب گرم ہوا آتی ہے
ریت اُڑ اُڑ کے ہر اک زخم میں بھر جاتی ہے

تیر بیٹھا ہے جو اس چاند سی پیشانی پر
خون کی چادر سی ہے اک چہرۂ نورانی پر
ہے عجب بیکسی اُس فاطمہؑ کے جانی پر
کبھی اعدا پہ نظر ہے تو کبھی پانی پر
تیغین کھا کھا کے لب خشک جو کھلاتے ہین
تیر اُدھر سے عوض جرعۂ آب آتے ہین

جون کمان کٹ کے لٹک آئے ہین ابرو خمدار
ہین لہو رونے سے وہ نرگسی آنکھین گلنار
بوسے جن ہونٹون کے لیتے تھے رسول مختار
پیاس سے سوکھ گئے ہین وہ لب گوہر بار
چاند شرمندہ تھا جن پھول سے رخسارون سے
چاک ہین شکل کتان ظلم کی تلوارون سے

زخمی ہین ابن یداللہ کے دونون بازو
ہاتھ ہیہات کہ یکدست ہین اب بے قابو
تیغ شانے پہ کبھی لگتی ہے ساعد پہ کبھو
انگلیان ایسی ہین زخمی کہ ٹپکتا ہے لہو
پر یہ ہے امت محبوب خدا کی خاطر
زخمی ہاتھون کو اُٹھائے ہین دعا کی خاطر

سخت آفت مین ہے وہ پشت و پناہ عالم
کمر اک سے ہے بار غم عباسؑ سے خم
علی اکبرؑ کی جوانی کا ہے جانکاہ الم
زانو پر مارتے ہین دست تاسف ہر دم
وار سے تیغون کے اعضا کے بدن کٹتے ہین
کھیت سے پر کہین شیرون کے قدم ہٹتے ہین

ساتھ اسوار کے زخمی ہے سراپا رہوار
کئی سو تیر ہین گردن سے بھی پہلو سے بھی پار
بال سے خون کی بوندین ہین ٹپکتی ہر بار
نہ ٹھہرے رہنے کی طاقت ہے نہ تاب رفتار
تیر جب لگتا ہے کچھ کہہ تو نہین سکتا ہے
پھیر کر مُنھ شہ والا کی طرف تکتا ہے

شاہ فرماتے ہیں اے میرے رفیق و ہمدم
ہے مجھے اپنے عزیزوں کے برابر ترا غم
بس کہ تو چھٹتا ہے اب تجھ سے جدا ہوتے ہیں ہم
مر کے بھی تجھکو نہ بھولونگا میں خالق کی قسم
خلق سے سوئے عدم کوچ کی تیاری ہے
آخری اب ترے آقا کی یہ اسواری ہے

دیکھ لے تیری طرح میں بھی ہوں زخمی واللہ
فاقہ مجھ پر بھی ہے اور تو بھی ہے بے دانہ و کاہ
ہے اگر تشنہ دہانی سے ترا حال تباہ
تین دن گذرے ہیں پانی سے نہیں ہوں آگاہ
تو زبان خشک جو منھ پھیر کے دکھلاتا ہے
بس کہ ساقی کوثر کو حجاب آتا ہے

مثال ۷۱۔ اس سین کو ایک دوسرے موقع پر دکھایا ہے

آج شبیر پہ کیا عالم تنہائی ہے
ظلم کی چاند پہ زہرا کے گھٹا چھائی ہے
اس طرف لشکر اعدا میں صف آرائی ہے
یاں نہ بیٹا نہ بھتیجا نہ کوئی بھائی ہے
برچھیاں کھاتے چلے جاتے ہیں تلواروں میں
مار لو پیاسے کو ہے شور ستمگاروں میں

زخمی بازو میں کمر خم ہے بدن میں نہیں تاب
ڈگمگاتے ہیں نکل جاتی ہے قدموں سے رکاب
پیاس کا غلبہ ہے لب خشک ہیں آنکھیں ہیں پُرآب
تیغ سے دیتے ہیں ہر وار کا اعدا کو جواب
شدت ضعف میں جس جا پہ ٹھہر جاتے ہیں
سیکڑوں تیر ستم تن سے گذر جاتے ہیں

گیسو آلودہ خوں لپٹے ہیں رخساروں سے
شانے کٹ کٹ کے لٹک آئے ہیں تلواروں سے
تیر پیوست ہیں خوں بہتا ہے سوفاروں سے
لاکھ آفت میں ہے اک جان دل افگاروں سے
نوک ہے سجدۂ معبود میں سر دینے کی
وار سے تیغوں کے فرصت نہیں دم لینے کی

خون میں تر پیچ عمامے کے ہیں سر زخمی ہو
سینہ سب برچھیوں سے تا بہ کمر زخمی ہو
ہے جبین چاند سی پرنور مگر زخمی ہے
تیر بیداد سے دل زخمی جگر زخمی ہے
ضرب شمشیر سے بیکار ہیں بازو دونوں
کھل گئے تیروں سے مجروح ہیں پہلو دونوں

برچھی آ کر کوئی پہلو پہ لگا جاتا ہے
بڑھتے ہیں زخم بدن زور گھٹا جاتا ہے
مارتا ہے کوئی نیزہ تو غش آجاتا ہے
بند آنکھیں ہیں سر پاک جھکا جاتا ہے
گرد زہراؑ و علیؑ گریہ کناں پھرتے ہیں
غل ہے گھوڑے سے امام دو جہاں گرتے ہیں

گرتے ہیں قطرۂ خون زخم جبین سے پیہم
فکر ہے بخشش امت کی کچھ اپنا نہیں غم
دست مجروح سے کچھ سکتے نہیں تیر ستم
کرتے ہیں حمد خدا خشک لبان سے ہر دم
ہے عبا تیروں سے غربال قبا گلگوں ہے
ہونٹ یاقوت سے زخمی ہیں دہن پر خوں ہے

زین سے ہوتا ہے جدا دوش محمدؐ کا مکیں
برچھیاں گرد ہیں اور تیغ میں ہے سر در زیں
چمن فاطمہؑ کا سرو ہے مائل بہ زمیں
ہے یہ نزدیک گرے مہر نبوت کا نگیں
پاؤں ہر بار رکابوں سے نکل جاتے ہیں
یا علیؑ کہتی ہے زینبؑ تو سنبھل جاتے ہیں

لاکھ شمشیریں ہیں اور ایک تن اطہر ہے
سیکڑوں خنجر فولاد ہیں اور اک سر ہے
ایک مظلوم ہے اور ظالموں کا لشکر ہے
نہ کوئی یار نہ ہمدم نہ کوئی یاور ہے
باگ گھوڑے کی لٹکتی ہے اٹھا سکتے نہیں
سامنے اہل حرم روتے ہیں جا سکتے نہیں

کوئی سید کا نہیں آہ بچانے والا
حربے لاکھوں ہیں اور اک زخم اٹھانے والا

پیاس میں کوئی نہیں پانی پلانے والا — سنبھلے کس طرح بھلا برچھیاں کھانے والا

چرخ سے آگ برستی ہے زمیں جلتی ہے
مارے گرمی کے زباں خشک ہے لو چلتی ہے

کہیں دم لینے کو سایہ نہیں ہے وقت زوال — اینٹھی جاتی ہے زباں پیاس کی شدت سے کمال
کبھی زینب کا ہے غم گاہ سکینہ کا خیال — دن جو ڈھلتا ہے تو حضرت ہوئے جاتے ہیں نڈھال

مثل خورشید بدن ضعف سے تھراتا ہے
نیر برج امامت پہ زوال آتا ہے

کہتے ہیں ظالموں سے خشک زباں دکھلا کر — ہے حق پانی کا اک جام پلا دو لا کر
اہل کیں کہتے ہیں یہ تیغ ستم چمکا کر — آب شمشیر پیو برچھیوں کے پھل کھا کر

یہ سخن سن کے بھی غصہ نہیں فرماتے تھے
یاس سے سوئے فلک دیکھ کے رہ جاتے تھے

عرض کرتے ہیں یہ خالق سے کہ اے رب غفور — تو ہے عالم کہ نہیں کچھ ترے بندے کا قصور
کرتے ہیں یہ مجھے بے جرم و خطا تیغوں سے چور — ہاتھ امت پہ اٹھانا نہیں مجھکو منظور

جانتے ہیں کہ محمد کا نواسا ہوں میں
پانی دیتے نہیں دو روز کا پیاسا ہوں میں

واقعہ نگاری

اُردو زبان کا ایک مشہور انشا پرداز لکھتا ہی:-

فارسی مین بیدھا نظم و نثر کی کتابین ہین جن کے خیالات، باریکی اور تاریکی عبارات مین جگنو سے اُڑتے نظر آتے ہین لیکن کیا حاصل ؟ اس انداز مین اصلی اجزا ادا کرنا چاہو تو ممکن نہین ایسی ماں کا دودھ پی کر اُردو نے پرورش پائی تو اُس کا کیا حال ہوگا

فارسی کے متعلق تو یہ الزام تسلیم نہین کیا جاسکتا۔ لیکن کچھ شبہ نہین کہ اُردو مین جس چیز کی بڑی کمی ہو وہ یہی واقعہ نگاری ہو، شاعری کی جو صفتین اُردو مین آئین، وہ قصیدہ اور غزل تھی، ان دونون کو واقعہ طرازی سے کوئی نسبت نہ تھی، مثنویان جو لکھی گئین وہ مورخانہ نہین بلکہ عاشقانہ تھین، اس لیے اصلی واقعات کے اظہار کی چندان ضرورت پیش نہین آئی، اُردو زبان کی نسبت جو کم مائگی کی شکایت ہو وہ زیادہ تر اسی لحاظ سے ہو کہ وہ ہر قسم کے واقعات، معاملات، کاروبار، معاشرت، کے جزئیات کے ادا کرنے پر قادر نہین، اسی بنا پر، اگر اُردو نظم مین، کوئی تاریخ کی کتاب لکھنا چاہین تو نہین لکھ سکتے،

واقعہ نگاری کی دو قسمین ہین،

(۱) واقعہ نگار کسی تاریخی واقعہ کو بے کم و کاست نظم کردے، اس کے لیے صرف زبان پر قدرت درکار ہو، شاعری کی چندان ضرورت نہین۔

(۲) واقعہ اجمالاً معلوم ہو، لیکن واقعہ نگار، واقعہ کے تمام جزئیات اور حالات، اپنی طبیعت سے پیدا کرتا ہو، وہ واقعہ کی نوعیت کو دیکھتا ہو اور خیال کرتا ہو کہ اس قسم کے موقع پر فطرت کا اقتضا کیا ہو، ان تمام چیزون کو وہ موجود فرض کرلیتا ہو اور اُن کو ادا کرتا ہو۔

اِس قسم کی واقعہ نگاری کا کمال یہ ہے کہ جو کچھ بیان کیا جائے بالکل بیان واقعی ہو، اور تمام واقعات میں اِس قسم کا تناسب، ربط اور موزونی ہو کہ کسی واقعہ کی نسبت، شک کا احتمال بھی نہ آنے پائے۔ اِس قسم کی واقعہ نگاری کے لیے صرف قدرتِ زبان کافی نہیں، بلکہ فطرت کا بڑا نکتہ دان ہونا درکار ہے؛

مثلاً شاعر، احباب کی جُدائی کا واقعہ لکھنا چاہتا ہے تو اس کو ان تمام جزئی کیفیتوں پر نظر ہونی چاہیے۔ جو اِس حالت میں پیش آتی ہیں مثلاً یہ کہ اِس حالت میں ایک دوسرے کو کس حسرت آمیز نگاہ سے دیکھتا ہے؟ کس قسم کی باتیں کرتا ہے؟ کن باتوں سے دل کو تسلی دیتا ہے؟ رخصت کے وقت بے اختیار کیا حرکات صادر ہوتے ہیں آغاز کی کیفیت کس طرح بہ تدریج ترقی کرتی جاتی ہے؟ حاضرین پر ان سے کیا اثر پڑتا ہے پھر جُدائی جُدائی میں بھی فرق ہے، باپ بیٹے کی جُدائی، بھائی بھائی کی جُدائی زن و شو کی جُدائی۔ احباب کی جُدائی، ان میں سے ہر ایک کی الگ الگ خصوصیات ہیں، ان مختلف اور کثیر الانواع خصوصیات کا احاطہ کرنا، اور ان کو مؤثر پیرایہ میں ادا کرنا شاعرانہ واقعہ نگاری ہے؛

اِسی طرح لشکر کشی، معرکہ آرائی، فتح و شکست، سفر و حضر، بیماری و موت، قید و بند دشت نوردی و بادیہ پیمائی، سیکڑوں ہزاروں واقعات ہیں اور ہر واقعہ کے سیکڑوں جزئیات ہیں، ان تمام کا احاطہ کرنا اور اُن کو ہو بہو ادا کر سکنا، کمالِ شاعری ہے؛

اُردو زبان میں چونکہ ایک مدت تک بیہودہ مبالغہ اور خیال بندی کی گرم بازاری رہی، اِس لیے واقعات کے ادا کرنے کے لیے جو الفاظ، ترکیبیں، اصطلاحات مقرر ہیں، استعمال میں نہیں آئیں اِس لیے آج نئے سرے سے ان کو استعمال کیا جائے تو ابتذال یعنی عامیانہ پن یا غرابت یعنی روکھا پن پیدا ہو جاتا ہے، نظیر اکبرآبادی کے کلام میں جو سوقیانہ پن ہے؛ اُس کا یہی راز ہے، میر حسن نے اپنی مثنوی میں

اکثر واقعات کا سماں دکھانا چاہا ہو اور یہ اُن کی صحیح المذاقی کا نتیجہ ہو لیکن اکثر جگہہ ابتذال پیدا ہو گیا ہو، ع کرلے کو جھڑے سے بجاتی چلی، اگر واقعہ نگاری ہو تو شعرا اچھا کیا کہ واقعہ نگاری سے الگ رہے!

واقعہ نگاری جب کمال کے درجہ تک پہونچ جاتی ہو تو اُس کو مرقع نگاری کہتے ہیں جس کو آج کل کی زبان میں کسی چیز کا سماں دکھانا، یا سین دکھانا کہتے ہیں،

میر انیس نے واقعہ نگاری کو جس کمال کے درجہ تک پہونچایا ہو، اُردو کیا فارسی میں بھی اُسکی نظیر بمشکل سے مل سکتی ہیں، اُنکے کمال کی خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

(۱) ہر قسم کے واقعات و معاملات و حالات اِس کثرت سے نظم کیے ہیں کہ واقعہ نگاری کی کوئی صنف باقی نہیں رہی جو اُن کے کلام میں نہ پائی جاتی ہو،

(۲) کوئی واقعہ جب سامنے آتا ہو تو عام نگاہیں صرف نمایاں باتوں پر پڑتی ہیں اور اسلیے جب لوگ اُن کو بیان کرنا چاہتے ہیں تو انہی نمایاں باتوں کو بیان کرتے ہیں لیکن ایک دقیق النظر اُن تمام جزئیات پر بھی نظر ڈالتا ہو، اور ان کو ظاہر کرتا ہے یہ جزئیات جب ادا کیے جاتے ہیں تو سامعین پر اِس طرح کا اثر پڑتا ہو گویا کوئی بھولی ہوئی بات یاد آگئی، اِسکے علاوہ واقعہ کی پوری پوری تصویر کھینچنے سے دل پر ایک خاص اثر پڑتا ہو، یہ جزئیات اکثر شعرا نظر انداز کر جاتے ہیں جسکی وجہ اکثر تو یہ ہوتی ہو کہ اُن پر عام نگاہیں پڑ نہیں سکتیں اور زیادہ تر یہ کہ ہر شخص اُن کے ادا کرنے پر قادر نہیں ہوتا، لیکن میر انیس چونکہ فطرت اور معاشرت انسانی کے بہت بڑے رازداں ہیں، اِس لیے دقیق سے دقیق، اور چھوٹے سے چھوٹا نکتہ بھی اُن کی نظر سے بچ نہیں سکتا، اِس کے ساتھ زبان پر یہ قدرت ہو کہ کہیں اُن کو دقت پیش نہیں آتی،

مثلاً ایک موقع پر گھوڑے کی تیز روی کو لکھا ہو، قاعدہ ہو کہ گھوڑا جب

حد سے زیادہ تیز دوڑتا ہی تو اکثر اُس کی دونون کنوتیان کھڑی ہو کر ملجاتی ہین، اُس کو بعینہٖ اِس طرح ادا کیا ہی،

ع دونون کنوتیان بھی کھڑی ہو کے مل گئیں۔

حضرت عباسؑ جب نہر کے پاس پہونچے ہین، تو گھوڑا جو کئی دن کا پیاسا تھا پانی دیکھ کر بیتاب ہو گیا ہی لیکن حضرت عباسؑ اُسکو پانی پینے سے روکتے ہین، اِس موقع پر واقعہ کی اصلی صورت کھینچنے کے لیے یہ ضرور ہے کہ اِس کشمکش کے موقع پر جو اضطرابی حالت پیش آسکتی تھی وہ دکھائی جائے چنانچہ میر انیس کہتے ہین ؎

دو دن سے بے زبان پہ جو تھا آب و دانہ بند
ہر بار کانپتا تھا سمٹتا تھا بند بند

دریا کو منھ اٹھا کے لگا دیکھنے سمند
چمکارتے تھے حضرتِ عباسؑ ارجمند

تڑپاتا تھا جگر کو جو شور آبشار کا
گردن پھرا کے دیکھتا تھا منھ سوار کا

یا مثلاً حضرت امام حسینؑ کے سامنے اُن کے ترسانے کو جب عمر و بن سعد نے پانی منگوا کر پیا ہے، اِس موقع پر کہتے ہین ع ظالم نے ڈگڈگا کے پیا سامنے جو آب +

ڈگڈگا کے پانی پینا، ایک معمولی اور غیر مہتم بالشان واقعہ ہی لیکن ایک تشنہ لب کے ترسانے کے مضمون مین اس کا اظہار حُسن بلاغت کا ایک بڑا ضروری نکتہ ہی۔

یا مثلاً ایک موقع پر گھوڑے پر سوار ہونے کی حالت کو لکھا ہی، ع وہ ہاتھ ہٹ کے آپ نے رکھا ایال پر، گھوڑے سے ذرا ہٹ کر ایال پر ہاتھ رکھنا، اور سوار ہونا، سواری کی مخصوص حالت ہی، اس لیے واقعہ کی تصویر کھینچنے کے لیے اس حالت کا دکھانا ضرور تھا۔

یا مثلاً حضرت شہ بانو جب اپنی بیٹی صُغرٰاؑ سے رخصت ہونے لگی ہین، تو صغراؑ

کی طرف سے جو صرف چھ مہینے کے تھے رخصت کے سوالات ادا کرائے ہیں اس موقع پر اکثر مستورات کا دستور ہے کہ بچے کا ہاتھ اُس کی پیشانی پر رکھ کر کہتی ہیں کہ دیکھو یہ تمھیں سلام کرتے ہیں اس حالت کو بعینہ ادا کیا ہے ؎

بانو نے کہا دست پسر ماتھے پہ رکھکر	لو آخری تسلیم بجالاتے ہیں اصغرؑ

یا مثلاً جوانان اہل بیت کی سیر و خوش خرامی کے موقع پر لکھتے ہیں ؎

زلفیں ہوا میں اُڑتی تھیں ہاتھوں میں ہاتھ تھے	اڑکے بھی بند کھولے ہوئے ساتھ ساتھ تھے

یا مثلاً جب رفقائے امام علیہ السلام صف نماز سے لڑائی کے لیے اُٹھے ہیں اس موقع پر لکھتے ہیں ؎

تیار جان دینے پہ چھوٹے بڑے ہوئے	تلواریں ٹیک ٹیک کے سب اُٹھ کھڑے ہوئے

یا مثلاً حضرت عباسؑ جب گھوڑا اڑاتے ہوئے نہر کی طرف گئے ہیں تو دریا کے نگہبانوں سے جو نشیب میں تھے اُس وقت آنکھ چار ہو جاتی تھی جب گھوڑا زیادہ اونچا اڑ جاتا تھا، اس حالت کو اس طرح ادا کیا ہے ؎

برچھیوں اُڑتا تھا دب کے فرسرانوں سے	آنکھ لڑ جاتی تھی دریا کے نگہبانوں سے

یا مثلاً سکینہؑ جب قید خانہ میں دربانوں سے اپنا حال کہنے گئی ہیں وہاں لکھا ہے ؎

بولا نہ جب کوئی تو ہوا غم زیادہ تر بیٹ کو ہلا کے پکاری وہ نوحہ گر	دیوار پکڑے پکڑے، گئی وہ قریب در دربانوں جاگتے ہو کہ سوتے ہو بے خبر

بیکس ہوں تشنہ لب ہوں فلک کی ستائی ہوں
کچھ تم سے اپنا حال میں کہنے کو آئی ہوں

دو حریفوں کی معرکہ آرائی کو جہاں مرزا دبیر وغیرہ لکھتے ہیں صرف عام طور پر ادھر کی اودھر کی باتیں لکھ دیتے ہیں یہ مطلق پتہ نہیں چلتا کہ دونوں نے

فن جنگ کے کیا کیا ہنر دکھائے ہین، لیکن میر انیس اکثر جگہ اُن خصوصیات کو تفصیل سے بیان کرتے ہین، اور یہ اُن کی قدرت زبان کی سب سے بڑی دلیل ہی، مثالین رزمیہ کے عنوان مین آئین گی، اب ہم ہر قسم کی واقعہ نگاری کی چند مثالین درج کرتے ہین،

حضرت امام حسینؑ کا کربلا مین داخلہ، دشمنون کی روک ٹوک رفقاے امام کی برہمی، امام علیہ السلام کی صلح پسندی، اور درگذر وغیرہ وغیرہ سے

اُترا یہ کہ کے کشتی امت کا ناخدا
جتنے سوار تھے وہ ہوے سب پیادہ پا
حضرت نے مسکرا کے یہ عباسؑ سے کہا
دیکھو تو کیا ترائی ہے کیا نہر کیا فضا

اکبرؑ شگفتہ ہو گئے صحرا کو دیکھکر
عباسؑ جھومنے لگے دریا کو دیکھکر

بولے یہ اشک بھر کے شہنشاہ سر بلند
کیون یہ مقام ہر تمھین شاید بہت پسند
کی مسکرا کے عرض کہ یا شاہ ارجمند
بس ہان تو خودبخود ہوئی جاتی ہر آنکھ بند

سیراب یہین رہین گے عنایت جو رب کی ہر
بس کیا کہون حضور ترائی غضب کی ہے

روتے ہو وہان سے بڑھے آپ چند گام
گویا زمین کی سیر کو اترا مہِ تمام
انجم کی طرح گرد تھے حیدرؑ کے لالہ فام
شکلین نہ نور کی وہ تجمل وہ احتشام

زلفین ہوا مین اُڑتی تھین ہاتھون مین ہاتھ تھے
ٹرکے بھی بند کھولے ہوے ساتھ ساتھ تھے

تکنے لگے پہاڑون کو مسلمؑ کے دونون لال
پھولون سے کھیلنے لگے زینبؑ کے نونہال
سبزہ سے ان کے ابن حسنؑ خوش ہوے کمال
کی عرض اس زمین کا ہر اک گل ہے بے مثال

اے خسرو زمین یہ جگہ ہے جلوس کی
خوشبو ہے یاں کی خاک میں عطرِ عروس کی

صحرا سے آئے نہر سوئے دریا شہِ امم
اُچھلیں درود پڑھتی ہوئی مچھلیاں بہم
الیاس شاد ہوئے کہ آئے بصد حشم
بولے حباب آنکھوں پہ شاہا ترے قدم

پانی میں روشنی ہوئی حُسنِ حضور سے
لے لیں بلائیں پنجۂ مرجان نے دور سے

ٹھہرے کنارِ نہر جوانانِ ماہرو
گھوڑے جو آئے پیاس بجھانے کنارِ جو
دھویا کسی نے رخ کسی نے کیا وضو
بھر لائے اشک آنکھوں میں شبیرِ نیک خو

کھینچی اک آہِ سرد ترائی کو دیکھ کر
ہاتھوں سے دل پکڑ لیا بھائی کو دیکھ کر

بولے یہ ہاتھ جوڑ کے عباسِ نامور
ایذا ہے محملوں میں بہت اہلِ بیت پر
خیمہ کہاں بپا کریں یا شاہِ بحر و بر
بچے ہیں نازکی میں گلوں سے زیادہ تر

کب سے عماریوں کے ہیں پردے چھٹے ہوئے
گرمی کے مارے دم ہیں سبھوں کے رکے ہوئے

کچھ سوچ کر امامِ دو عالم نے یہ کہا
پوچھو بہن سے یہ سنتے ہی عباسِ باوفا
زینب جہاں کہیں وہیں خیمہ کرو بپا
جا کر قریبِ محملِ زینب یہ دی صدا

حاضر ہے جاں نثار امامِ غیور کا
برپا کہاں ہو خیمۂ اقدس حضور کا

بولی یہ سن کے دخترِ خاتونِ روزگار
خشکی ہو یا ترائی چمن ہو کہ سبزہ زار
اس امر میں بھلا مجھے کیا دخل ہے نثار
ہر جا مسافروں کا نگہبان ہے کردگار

مختار کائنات کے تم نورِ عین ہو
اترو وہاں جہاں مرے بھائی کو چین ہو

آرام کو ترس گئے جب سے چھٹا ہے گھر
کن آفتوں میں پانچ مہینے ہوئے بسر
یہ آندھیاں یہ گرمی کے ایام یہ سفر
دن بھر چلے ہیں دھوپ میں جاگے ہیں رات بھر
گرمی سے کھیت خشک تھے جنگل اُجاڑ تھا
اِک ایک کوس راہِ جبل میں پہاڑ تھا

آج اس زمین پر ہمیں لایا ہے آسماں
اب دیکھیے دکھاتی ہے تقدیر کیا یہاں
آقا کی خیریت کی دعا مانگو بھائی جاں
یارب مسافروں کو مبارک ہو یہ مکاں
دشمن بہت ہیں بادشہِ خوشخصال کے
بھائی بہن نثار ذرا دیکھ بھال کے

بھائی سے اس زمین کی سُنی ہے بہت صفت
ہے وہ امام واقفِ اسرارِ شش جہت
جو جو سن ہیں اُن سے بھی لازم ہے مصلحت
صدقے گئی جناب سے بھی کر لو مشورت
ساحل پہ دشمنوں میں کسی کا عمل نہ ہو
بھیّا مجھے یہ ڈر ہے کہ ردّ و بدل نہ ہو

دستِ ادب کو جوڑ کے اُس شیر نے کہا
تشویش کچھ نہ کیجیے اے بنتِ مرتضیٰ
ہر چند مصلحت مری کیا اور عقل کیا
لیکن ترائی سے کوئی بہتر نہیں ہے جا
جو مہر فاطمہؑ میں ہے یہ وہ فرات ہے
گرمی میں قربِ نہر کا آبِ حیات ہے

حضرت کے حکم کا متر صد ہے جاں نثار
ارشاد یہ ہوا کہ دیا تم کو اختیار
آیا حضورِ سبطِ پیمبر وہ ذی وقار
کی عرض خیمہ نہر پہ کرتا ہے خاکسار

اُترین یہین یہ مرضی آل رسول ہے
بولا وہ بحرِ فیض کہ اچھا قبول ہے

یہ سُن کے خادمون کو پکارا وہ مہ جبیں
حاضر ہون آب پاش محل دیر کا نہیں
فرّاش آکے جلد مصفا کرین زمیں
یان ہوگا خیمۂ حرم بادشاہ دیں

جلد اُن کو بھیجو لوگ ہین جو کاروبار کے
لے آئے اشترون سے قناتین اُتار کے

بولے زہیر قین کہ حاضر ہین سب غلام
کُرسی منگا کے بیٹھ گئے اک طرف امام
بڑھ کر حبیب بھی ہوئے مصروف اہتمام
رُتبے مین ہوگئی وہ زمین عرش احتشام

پرتو فگن تھا نور رسالت مآب کا
سر پر لگا تھا چتر زری آفتاب کا

تھا فکر مین خموش دو عالم کا تاجدار
ناگہ اُٹھا شمال کی جانب سے اک غبار
لکھوا رہے تھے خیمون کو عباسؑ ذی وقار
رایت سیاہ و سُرخ نظر آئے تین چار

مڑ کر کہا حبیب نے کچھ رنگ اور ہے
بولا کوئی یہ شام کے لشکر کا طور ہے

یہ ذکر تھا کہ بن مین سیاہی سی چھا گئی
گھوڑون کے دوڑنے سے زمین تھرتھرا گئی
ڈنکے کی دھشت ظلم سے کوسون صدا گئی
جنگی سپاہ گھاٹ کے نزدیک آگئی

اک ایک پیل زور تہمتن شکوہ تھا
ابن رکاب سبز قدم سرگروہ تھا

بولے ملازمون سے یہ عباسؑ باوفا
آتے ہی سرکشی یہ طریقہ ہے کون سا؟
دریافت تو کرو کہ ارادہ ہے اُنکا کیا؟
کہدو کہ اہلبیت کے خیمہ کی ہے یہ جا

لازم رسول زادیون کا احترام ہے
اُترین الگ کہین یہ ادب کا مقام ہے

کرسی نشین ہے تخت دل سیدالبشر
آئین خسروی سے یہ واقف نہین مگر
آتی ہے اُڑ کے گھوڑون کی ٹاپون سے گرد ادھر
کیا ہے جو رو گئے نہین باگین یہ خیرہ سر

بھولے ہوئے ہین اس پہ کہ ہم خاکسار ہین
شاید ہوا کے گھوڑون پہ ظالم سوار ہین

اُس فوج کے رئیس نے بڑھ کر کیا کلام
حکمِ امیر ہے یہین اُترے سپاہِ شام
چھوڑینگے ہم اُسے کہ جو راحت کا ہے مقام
دریا سے ہٹ کے آپ بپا کیجیے خیام

لشکر کشی ہے بادشہِ کائنات پر
کل مورچے سپاہ کے ہونگے فرات پر

کوفے سے کل جوان اِدھر آئے ہین بیس ہزار
رستے مین شام کی بھی فوجین ہین بیشمار
خالی ہین منزلین نہ بیابان نہ کوہسار
شہرون سے پرگنون سے چلے آتے ہین سوار

لاکھون ہین کوئی قبل کوئی بعد آئے گا
گیتی ہلے گی جب پسرِ سعد آئے گا

فوجون کا جائزہ تھا وہان ہم چلے تھے جب
گرجے ہین طبل کوس کے لشکر پڑا تھا سب
دستون کی روم و شام کے آمد ہے روز و شب
اِس ارض پہ نہ ہو جو سمائی تو کیا عجب

لیجیے مقام گر کوئی گوشہ جدا ملے
ممکن نہین کہ نہر پہ خیمے کی جا ملے

ہم گھاٹ روکنے کے لیے آئے ہین اِدھر
ہے آج شب کو داخلہ شمر کی خبر
سُنتے ہی یہ ترائی مین گونجا وہ شیرِ نر
تیوری چڑھا کے تیغ کے قبضہ پہ کی نظر

کم تھا نہ ہمہمہ اسد کردگار سے
نکلا ڈکارتا ہوا ضیغم کچھار سے

غصے میں رکھ کے دوش پہ شمشیر برق دم
گر فوج قاہرہ کی ہے آمد تو کیا ہے غم
نعرہ کیا اسد نے کہ تم سے ہٹینگے ہم
گرتا ہے کٹ کے سر میں جس جا جمے قدم

پھریں جو شیر سامنے آتا نہیں کوئی
یہ آنکھ وہ ہے جس میں سماتا نہیں کوئی

تم کون ہو حسینؑ ہیں مختار خشک و تر
دیکھو فساد ہوگا بڑھو گے اگر ادھر
ان کے سوا ہے کون شہنشاہ بحر و بر
شیروں کا یاں عمل ہے تمھیں کیا نہیں خبر

سبقت کسی پہ ہم نہیں کرتے لڑائی میں
بس کہدیا کہ پانوں نہ رکھنا ترائی میں

ظالم بگڑ بگڑ کے بڑھے ایک بار سب
نیزے علم کیے ہوئے تھے نیزہ دار سب
بلوہ جو ہو گیا سمٹ آئے سوار سب
باندھے تھے ایک غول ضلالت شعار سب

لیکن ملا نہ سکتے تھے آنکھ اس دلیر سے
اک شور تھا کہ چھین لو دریا کو شیر سے

بگڑے ابو ثمامہ و سعد فلک سریر
جوڑا کمان میں ابن مظاہر نے ایک تیر
تولی زہیر قین نے شمشیر بے نظیر
بولے اسد کہ زجر کے قابل ہیں یہ شریر

عابس کو غیظ لشکر بد خو پہ آگیا
غصے سے بل جلال کے ابرو پہ آگیا

الٹی جناب قاسم ذیشان نے آستیں
بولے بگڑ کے بیٹے زینبؑ کے مہ جبیں
قبضے پہ ہاتھ رکھ کے بڑھے اکبر حسیں
شیروں سے کیا ترائی کو چھینیں گے یہ لعیں

کہیے تو نیزہ بازون کو ہم دیکھ بھال لیں
تیوری کوئی چڑھائے تو آنکھیں نکال لیں

آگے تھے سب کے حضرتِ عباسؑ ذی حشم　　بڑھ بڑھ کے روکتے تھے دلیروں کو دمبدم
تیغیں جو تولتے تھے ادھر بانیِ ستم　　کہتے تھے سر نہ ہوگا بڑھایا اگر قدم

لرزہ تھا رعبِ حق سے ہر اک نابکار کو
روکے تھا ایک شیرِ جری دس ہزار کو

بڑھتا تھا جھومتا ہوا جس دم وہ شیرِ نر　　گرتا تھا کوئی ڈر کے ادھر اور کوئی ادھر
تیغیں جو کھنچ گئیں تو ہوا اور شور و شر　　گھبرائے اہلبیت شہنشاہِ بحر و بر

آغوش میں پھوپھی کے سکینہ دہل گئی
غل پڑ گیا کہ گھاٹ پہ تلوار چل گئی

چلائی رو کے زینبؑ ناشاد و نامراد　　ہے بے خبر تو اور کہ یہ کس سے ہوا فساد
غربت زدوں سے کیا سبب کینہ و عناد　　دیکھے کوئی کدھر ہیں شہنشاہ خوش نہاد

ہمشیر کو نثار امامِ امم کرو
لوگو دعائیں اکبرؑ مہرو پہ دم کرو

محمل سے منہ نکال کے فضہ نے یہ کہا　　بلوہ کناں ہے نہر پہ اے بنتِ مرتضیٰ
نیزے بڑھا بڑھا کے ہٹاتے ہیں اشقیا　　قبضہ پہ ہاتھ رکھے ہیں عباسِ باوفا

کیا جانئے کس نے ٹوک دیا ہے دلیر کو
سب دشت گونجتا ہے یہ غصہ ہے شیر کو

زینبؑ پکاریں پیٹ کے زانو بصد ملال　　ہے ہے غضب ہوا اگر آیا انھیں جلال
کہدے کوئی کہ اے اسدِ کبریا کے لال　　غربت پہ ابنِ فاطمہؑ کی تم کرو خیال

قربان ہو گئی نہ لڑائی کا نام لو
میں ہاتھ جوڑتی ہوں کہ غصہ کو تھام لو

یہ بات کہہ کے رونے لگی خواہر امام
کرسی سے جلد اُٹھ کے پکارے شہِ انام
عباسؑ اُدھر غضب میں بڑھے سوے فوج شام
بھیا ہمارے سر کی قسم روک لو حسام
یکساں ہے بر و بحر ہماری نگاہ میں
غیظ و غضب کو دخل نہ دو حق کی راہ میں

آؤ تمہیں قسم ہے جنابِ امیرؑ کی
ہمراہ بیٹیاں ہیں شہِ قلعہ گیرؑ کی
بگڑو نہ سرکشی پہ سپاہِ شریر کی
سب سے جدا ہی چاہیے منزل فقیر کی
کیا دشت کم ہے صابر و شاکر کے واسطے
یہ اہتمام ایک مسافر کے واسطے

آقا نے دی جو اپنے سرِ پاک کی قسم
بر تھی شکن جبین پہ نہ تھا غیظ کم
بس تھرتھرا کے رہ گیا وہ صاحبِ کرم
چُپ ہو گئے قریب جب آئے شہِ اُمم
گردن جھکا دی تا نہ ادب میں خلل پڑے
قطرے لہو کے آنکھوں سے لیکن نکل پڑے

تیغ و سپر کو پھینک کے بولا وہ نامور
حکم خدا ہے حکم شہنشاہِ بحر و بر
کہہ دیتے اِن سے کاٹ کے لیجائیں میرا سر
اب کچھ کہوں زبان سے کیا تاب کیا جگر
میں ہوں غلام آپ کے ادنیٰ غلام کا
آقا مجھے خیال تھا بابا کے نام کا

گردن میں ہاتھ ڈال کے حضرت نے یہ کہا
لو اب اٹھا لو تیغ و سپر تم پہ میں فدا
کیوں کانپتے ہو غیظ سے بھائی یہ کیا کیا
دریا کو تم تو لے چکے اے میرے مہ لقا

وہ شیر ہو کہ دھاک ہی ساری خدائی میں
دیکھو کوئی ٹھہائے سوا ہے ترائی میں

۲۔ حضرت عباسؑ جب میدان جنگ میں گئے ہیں تو شمر نے یہ ترغیب دی کہ ناحق آپ اپنی جان کیوں گنوتے ہیں اُدھر سے ٹوٹ کر ہماری طرف آ جائیے تو منصب جاگیر اور کیا کچھ نہ ملیگا حضرت عباسؑ نے نہایت برہم ہو کر اُسکی درخواست کو رد کیا۔ یہ سوال و جواب ہو رہے تھے کہ دشمنوں نے یہ خبر اُڑا دی کہ عباسؑ ہماری طرف آ گئے اہلبیت اور خاص کر حضرت عباسؑ کی بیوی پر اسوقت جو اثر ہوا اور جو باتیں ہوئیں اُن کو کس خوبی سے ادا کیا ہے

وان شمر و علمدار میں ہوتی تھی یہ تقریر
خیمے کے قریب آن کے اک ظالم بے پیر
وان خیمے کی ڈیوڑھی پہ کھڑے تھے جو دلگیر
چلایا کہ لو ٹوٹ گئے بازوے شبیر

اس فوج میں فرزند امیر نجف آیا
عباسؑ علمدار ہماری طرف آیا

اکبر نے کہا سے یہ بولا پسر مخبر صادق
یہ بات نہیں رتبۂ عباسؑ کے لائق
کاذب ہیں جفاکار ہیں مفسد ہیں یہ فاسق
وہ ہے مرا شیدا مرا یاور مرا عاشق

بھائی سے کنارا کبھی بھائی نہ کرے گا
عباسؑ علی مجھ سے بُرائی نہ کرے گا

ناموس نبی میں بھی یہ چرچا ہوا اک بار
کہنے لگی تب زوجۂ عباسؑ علمدار
زینبؑ نے کہا یہ تو نہ مانوں گی میں زنہار
کیا ماجرا ہے بی بی مجھ سے کرو اظہار

ہر دم یہ ہے اک شور بپا لشکر کیں میں
وارث مرا کیا قید ہوا لشکر کیں میں

سلہ یہان عجیب بلاغت کا اظہار کیا ہے حضرت عباسؑ کی بیوی اگرچہ اس واقعہ کو تحقیق کرنا چاہتی ہین لیکن یہ انکے زبان سے نہین نکل سکتا کہ درحقیقت عباسؑ دشمنون سے مل گئے ہین اسیلئے تھوڑے سے پیرایہ مین خلل کیا کہ کیا دشمنون نے انکو قید کر لیا ہے اگر وہ دشمنون کے مجمع مین چلے بھی گئے تو قید ہوکر گئے ہونگے ورنہ یہ امر بالکل ناممکن ہے کہ وہ دشمنون سے جا کر مل جائین ۱۲ منہ

بولی یہ سکینہؑ؎ کہ چچی تم سے کہوں کیا
روتے ہیں کمر پکڑے ہوئے ہاتھوں سے بابا
اور کہتے ہیں آپس میں خوشی ہو کے یہ اعدا
عباسؑ ملا ہم سے شہِ دین ہوئے تنہا
اس صدمے سے ننھا سا کلیجہ مرا شق ہے
میں پیاس بھی بھولی ہوں یہ عمّو کا قلق ہے

بچی سے سکینہؑ نے کہا جب یہ بصد یاس
غرقِ عرقِ شرم ہوئی زوجۂ عبّاسؑ
گھبرائی ہوئی خیمے کی ڈیوڑھی کے گئی پاس
پھر سوچ کے کہتی تھی کہ بیجا ہے یہ وسواس
قوّت شہِ والا کی انھیں سے تو فقط ہے
عبّاسؑ پھرے شہ سے یہ مانوں گی غلط ہے

بھائی کو وہ پیارے ہیں انھیں بھائی ہے پیارا
عاشق کہیں معشوق سے کرتے ہیں کنارا
یہ ننگ علمدار کو ہوگا نہ گوارا
قسمت ہی الٹ جائے تو اس کا نہیں چارا
لیکن فلک اس طرح سے گرتے نہیں دیکھا
بھائی کو کبھی بھائی سے پھرتے نہیں دیکھا

اس سوچ میں پھرتی تھی سراسیمہ و مضطر
اس کا بھی نہ تھا ہوش کہ کب گر گئی چادر
رخ زرد تھا دل کانپتا تھا سینہ کے اندر
دھڑکا تھا کہ اب کیا کہیں گے آن کے سرور
یارب نہ سنوں میں کہ جدا ہو گئے عباسؑ
یہ غل ہو کہ بھائی پہ فدا ہو گئے عباسؑ

آخر کہا بیٹے سے کہ واری ادھر آؤ
باندھو کمر اور جنگ کے ہتھیار لگاؤ
تم شیر کے فرزند ہو میدان میں جاؤ
بیتاب ہوں اے لال خبر باپ کی لاؤ

؎ اس بلاغت کو دیکھو کہ اہلِ حرم سے کسی نے اس جھوٹی خبر کا زبان پر لانا بھی نہ چاہا۔ سکینہؑ بالکل بچی تھیں اس لیے انھوں نے جو سنا تھا بیان کر دیا۔

تھے پانی کو دریا کے کنارے گئے عباسؑ
دیکھ آؤ کہ لڑتے ہیں کہ مارے گئے عباسؑ

غیرت سے موئی جاتی ہوں میں بیکس و ناچار
صدقے گئی کہیو مری جانب سے بتکرار
کہتے ہیں عدو پھر گیا بھائی سے علمدار
کیا قہر ہے تم غم سے کیوں کرتے ہو گفتار

وہ لعنتی انداز ہے مردودِ خدا ہے
شبیرؑ کے دشمن سب سے علاقہ نہیں کیا ہے

۱۰۳- ابن سعد کربلا میں داخل ہوتا ہے، اور خولی سے حالات دریافت کرتا ہے خولی ایک ایک چیز کی تفصیل بیان کرتا ہے

یہ ذکر تھا کہ دور سے ظاہر ہوئے نشاں
موجوں کی طرح سب تھیں جنبش میں بیش داں
اُٹھا زمیں پہ ظلم کا دریائے بیکراں
لہراتے تھے ہوا سے علم مثل بادباں

ہلتا تھا دشت کیں دہل اس طرح بجتے تھے
باجوں کا تھا یہ شور کہ بادل گرجتے تھے

جنگی وہ رومیوں کے پسے شامیوں کے دل
مکار و اہل نار و دغاباز پُر دغل
خوفِ خدا نہ جن کو نہ اندیشۂ اجل
سنگیں مہیب دیو سے قد بردوں پہ بل

بدخواہ خاندانِ رسالت پناہ تھے
ایسے جلے ہوئے تھے کہ چہرے سیاہ تھے

تلواریں کھینچے بڑھ گئے جب دو طرف سوار
ڈنکے کی دمبدم تھی صدا آسمان کے پار
غل ہو گیا سلامی کے باجوں کا ایک بار
آگے بڑھے چلو یہ نقیبوں کی تھی پکار

گھوڑوں پہ گرد بیش رئیسانِ شام تھے
زریں کمر جلو میں کئی سو غلام تھے

اُترا قریب خیمہ فرس سے وہ خیرہ سر
سر پر لگا یا دوڑ کے خادم نے چتر زر
بیٹھے تو اپنی فوج پہ ظالم نے کی نظر
بولا کسی سے پھر وہ سوئے نہر دیکھکر
خیمہ ہے کس طرف کو شہ خوش خصال کا
دریا پہ تو عمل نہیں زہراؑ کے لال کا

خولی نے تب کہا کہ ہماری طرف ہے نہر
آئے تھے یاں اُترنے کی خاطر امام دہر
فرماتے تھے یہ نہر تو ہے میری ماں کا مہر
ہم نے اُٹھا دیا اُنھیں لیکن بجبر و قہر
عباسؑ مستعد تھے سبھوں سے لڑائی کو
شبیرؑ پھیر لے گئے سمجھا کے بھائی کو

وہ دھوپ میں ہے خیمۂ زنگاری حسینؑ
راحت نہ رات کو ہے کوئی دم نہ دن کو چین
بہرزن علیؑ کی بیٹیاں روتی ہیں کرکے بین
آفت میں مبتلا ہے محمدؐ کا نور عین
بچوں کی مارے پیاس کے حالت عجیب ہے
خیمہ نہ سایہ میں ہے نہ دریا قریب ہے

بولا شقی کہ کتنی ہے فوج شہ امم
سنتے تھے واں سپاہ حسینی کی دھوم ہم
اُس نے کہا حسینؑ کے یاور بہت ہیں کم
فاقوں کے مارے دم میں کسی کے نہیں ہے دم
ایسی نہ فوج کچھ ہے نہ ایسے نشان ہیں
میں نے تو خود گنا ہے اکاسی جوان ہیں

ہے اک علم یہ قلت لشکر کا ہے نشاں
یہ حال ہے اُٹھا ہوا جیسے ہو کارواں
اُردو میں جنس غم کے سوا جنس ہے گراں
غلّہ کی یہ کمی ہے کہ ہے قحط آب و ناں
اسوار بھی قلیل پیادے بھی تھوڑے ہیں
کل ستّرہ تو اونٹ ہیں اور بیس گھوڑے ہیں

سطح ہے سرد آگ کا اُس میں نہیں ہے نام
شیشے ہوائے گرم سے بیتاب ہیں تمام
خاک آبدار خانے میں اُڑتی ہے صبح و شام
کیونکر رہیں گے بیکس و مظلوم و تشنہ کام
ہاں سیکڑوں کمانیں ہیں فوجِ شریر میں
ذو ذو گریں گے خاک پہ ایک ایک تیر میں

یہ سب غلط سُنا تھا کہ ہے لشکرِ کثیر
کچھ نوجوان ہیں طفل ہیں کچھ اور کچھ ہیں پیر
ہیں اُن میں سات آٹھ تو لڑکے کئی صغیر
پس جائینگے وہ ٹاپوں سے ہنگامِ دار و گیر
کیا چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کی طاقت دکھائینگے
ان سے تو تیغے بھی سنبھالے نہ جائینگے

کیا جانے دل میں سمجھے تھے کیا شاہِ کربلا
مقتل میں کھینچکر انھیں لے آئی ہے قضا
لشکر تو یہ قلیل اور اس فوج سے وغا
عمریں ہیں چھوٹی چھوٹی بھلا وہ لڑینگے کیا
کچھ آزمودہ کار نہیں کچھ مسن نہیں
ان کے ابھی تو گھر سے نکلنے کے دن نہیں

ہمشکل مصطفےٰ کو تو اٹھارواں ہے سال
تیرہ برس کا ہے ابھی شبّر کا نونہال
نو دس برس کے ہوئینگے زینب کے دونوں لال
ہاں اک جوان ہیں حضرت عباسؑ خوشخصال
چھوٹے ہیں اور سب کوئی ان میں جوان نہیں
خط اک طرف مسیں بھی کسی کی عیاں نہیں

سنتا ہوں میں ہیں دو پسر شاہِ نامدار
بیمار اُن میں ایک ہے اور ایک شیرخوار
زینبؑ کے دو ہیں اور حسنؑ کے ہیں گلعذار
دس ہیں عقیلؑ و مسلمؑ و حیدرؑ کے یادگار
زہراؑ کے جان و دل ہیں محمدؐ کے پیارے ہیں
یہ سترہ تو چاند ہیں باقی ستارے ہیں

بتیس سب سوار شہِ دین کے پاس ہیں
آفت میں مبتلا ہیں مگر با حواس ہیں
اب رہ گئے پیادے سو دو کم پچاس ہیں
غازی ہیں سرفروش ہیں اور حق شناس ہیں
کھانے کا ہے خیال نہ پانی کی فکر ہے
سجدے ہیں اور دعا میں ہیں اور حق کا ذکر ہے

بولا وہ تب کہ ہونگے جوان پانچ کے ہزار
ہیں تین چار کوس کے گھیرے میں سب سوار
خولی نے کی یہ عرض کہ ممکن نہیں شمار
اک اک جوان ہے رستمِ میدانِ کارزار
کیا کوئی لڑ سکے گا قیامت کی فوج ہے
لشکر کی ہیں صفیں کہ سمندر کی موج ہے

پیدل ہیں اک طرف تو رسالے ہیں اک طرف
جانباز تختہ جنوں پہ ڈٹے ہیں اک طرف
خنجر ہیں ایک سمت تو بھالے ہیں اک طرف
اور دس ہزار برچھیوں والے ہیں اک طرف
اب لوگ فکرِ قتلِ شہنشاہِ دین میں ہیں
کھینچے ہوئے کمانوں کو سرکش کمین میں ہیں

ہاتھوں میں پہلوانوں کے ہیں گرزِ گاؤسر
ہر جا کھچی ہوئی ہیں کمندیں اِدھر اُدھر
ضربت سے جن کے ٹوٹتی ہے کوہ کی کمر
کالی گھٹا سی چھائی ہے ڈھالوں کی نہر پر
سب لوگ جا بجا پئے قتل و ستیز ہیں
تیغیں کھنچی ہیں اُنی ہوئی خنجر بھی تیز ہیں

بھالا ہلا کے کوئی یہ کہتا ہے بار بار
کہتا ہے کس غرور سے اک شام کا سوار
نوک اِسکی سینۂ علی اکبرؑ کے ہوگی پار
آئے تو رن میں حضرتِ شبیرؑ کا یادگار
اب کوئی دم میں گھر کے حسنؑ کی صفائی ہے
تلوار آج زہر میں میں نے بجھائی ہے

۴۔ فوج آراستہ ہو رہی ہے، اور علم لا کر رکھا گیا ہے عون و محمد جو امام علیہ السلام کے بھانجے اور حضرت زینبؑ کے صاحبزادے ہیں، علم کے استحقاق کے دعویدار ہیں اور چاہتے ہیں کہ امام علیہ السلام سے اس منصب کی درخواست کریں، اسوقت کی گفتگو، حضرت زینبؑ کی آزردگی، اور فہمائش اور دیگر واقعات،

زینبؑ کے پسر مشورہ کرتے تھے یہ باہم — کیوں بھائی علم لینے کو ماموں سے کہیں ہم
تائید خدا چاہیے گو عمر میں ہیں کم — عہدہ تو ہمارا ہے یہ آگاہ ہے عالم
واقف ہیں سبھی حیدرؑ و جعفرؑ کے شرف سے
حق پوچھو تو حقدار ہیں ہم دونوں طرف سے

دادا بھی علمدار ہے نانا بھی علمدار — ہم اپنے بزرگوں کے ہیں منصب کے طلبگار
کہتا تھا بڑا عرض کا موقع نہیں زنہار — ہیں بادشہ کون و مکان مالک و مختار
عہدہ تو بڑا یہ ہے کہ ماموں پہ فدا ہوں
چپکے رہو اماں نہ کہیں سن کے خفا ہوں

مطلب نہ علم سے نہ حشم سے ہمیں کچھ کام — مٹ جائیں نشاں بس یہی عہدہ ہے یہی نام
یہ سر ہوں نثار قدم شاہ خوش انجام — عزت رہے بھائی یہ دعا ہے سحر و شام
آقا جسے چاہیں علم فوج خدا دیں
مشتاق اجل ہیں ہمیں مرنے کی رضا دیں

رو دی تھی جو پردے کے قریں زینبؑ دلگیر — سب اس نے مفصل سنی بیٹوں کی تقریر
غصے سے یہ کہنے لگی وہ صاحب توقیر — دونوں کو اشارے سے بلا لے کسی تدبیر
کچھ کہنا ہے سن لیں اُسے فرصت نہیں گر ہو
عباسؑ نہ دیکھیں نہ شہ دیں کو خبر ہو

یہ کہتی تھی زینبؑ کہ خود آئے وہ نکوکار
چھوٹے سے یہ فرمانے لگیں زینبؑ ناچار
کیا باتین ابھی بھائی سے تھین اے مری دلدار
اس وقت مین ہو کون سے منصب کے طلبگار
سمجھے نہ کہ مادر عقب پردہ کھڑی ہے
گھر لٹتا ہے میرا تمھین منصب کی پڑی ہے

اللہ بڑا عزم کیا باندھ کے تلوار
تجکو تھین ایسا نہ سمجھتی تھی مین زنہار
دیکھو ابھی تم دونون سے ہوجاؤن گی بیزار
کچھ کہیو نہ مامون سے خبردار خبردار
کیا دخل تمھین امر مین سلطان امم کے
دیکھون گی نہ پھر منھ جو گئے پاس علم کے

کچھ اور ہی تیور ہین علم نکلا ہے جب سے
تم کون ہو جو آگے بڑھے جاتے ہو سب سے
استادہ ہو جا کر عقب شاہ ادب سے
عہدہ ہے یہ جسکا مجھے معلوم ہے شب سے
اس امر مین خاطر نہ کرین اور کسیکی
مین خوش ہون بجالائین وہ خدمت کو غلامؑ کی

مانا کہ پہنچتا ہے تمھین منصب جعفرؑ
آقا کی غلامی سے ہے عہدہ کوئی بڑھکر
چھوٹا مرا بھائی بھی ہے بیٹون کے برابر
عاشق کا تو عاشق ہے برادر کا برادر
بگڑون گی گلہ گر کسی اسلوب کرو گے
عباسؑ سے کیا تم مجھے محجوب کرو گے

زینبؑ نے عتابانہ جو کی اُن سے یہ گفتار
یون کہنے لگے جوڑ کے ہاتھون کو وہ دلدار
شاہون سے غلامون نے بھی کی ہے کبھی تکرار
مالک ہین جسے چاہین علم دین شہ ابرار
رخصت کے لیے تیغ و سپر باندھے ہوئے ہین
ہم صبح سے مرنے پہ کمر باندھے ہوئے ہین

زینبؑ نے کہا لیکے بلائیں کہ سدھارو
بس اب مرا دل شاد ہوا اے مرے پیارو
ماں صدقے گئی سر قدم شاہ پہ وارو
ہو عید مجھے گر عمرو و شمر کو مارو
یہ وقت ہے امداد امام ازلی کا
دے چھوٹے سے ہاتھوں میں صدرِ علی کا

۵ حضرت علی اکبرؑ میدان جنگ میں جانے کے لیے پھوپھی اور اماں سے اجازت طلب کرتے ہیں، اُن دونوں کا اضطراب۔ اور سوال وجواب ۵

خیمے میں آئے روتے ہوئے اکبرؑ حزیں
چھاتی لگایا ماں نے پھوپھی نے بلائیں لیں
اک آہ سرد بھر کے یہ بولا وہ مہ جبیں
نرغے میں ظالموں کے اکیلے ہیں شاہ دیں
روتے ہیں غیر سیّد والا کے حال پر
اماں مقام رحم ہے بابا کے حال پر

اعدا کا ظلم بھائی کا غم تین دن کی پیاس
بازو شکستہ ضعف بصارت ہجوم یاس
اب میں ہوں اور کوئی نہیں شاہ دیں کے پاس
اس پر بھی اضطراب نہیں بجھ رہے حواس
گھیرے ہیں سب امام غریب الدیار کو
تنہا کھڑے ہیں تولے ہوئے ذوالفقار کو

تنہا کہاں امام کہاں وہ ہجوم عام
ہیں یاں ہوں اب تو اور بڑھی ہوگی فوج شام
فریاد پر کوئی نہیں آتا ہمارے کام
مٹتا ہے صفحۂ دو جہاں سے پدر کا نام
مظلوم باپ آنکھوں کے آگے ہلاک ہو
بیٹا جوان ہم سا نہ پیوند خاک ہو

تقدیر نے کیا نہ شہادت سے بہرہ یاب
اچھا رہیں گے بعد شہ آسماں جناب
ہم بھی نہیں اگر نہیں فرزند بوتراب
ذرہ کہاں غروب ہوا جبکہ آفتاب

دنیا کا نور نیّرِ اعظم کے ساتھ ہے
اپنی تو زندگی شہِ عالم کے ساتھ ہے

مجکو تو آرزو ہے کہ سر کو فدا کروں / راہ خدا میں فوج سے تنہا دغا کروں
سر سے حقوق والد ماجد ادا کروں / مالک مرے اگر نہ رضا دیں تو کیا کروں

وان اقتلوا الحسینؑ کا اعدا میں شور ہے
برچھی ہمارا پالنے والوں سے زور ہے

تم دونوں صاحبوں سے مری اب ہیں دو سوال / اوّل تو یہ کہ دیجے مجھے رخصتِ جدال
رکھ لیجے آبروے پسر ہر ذو الجلال / آگے مرے شہید نہ ہو فاطمہؑ کا لال

للہ ہاتھ اٹھائیے اب نور عین سے
اماں ہمیں عزیز نہ کیجے حسینؑ سے

ہے دوسری یہ عرض کہ جو رخصت نہیں قبول / جلدی ہو کربلا سے روانہ بدل ملول
یثرب کیا علاقہ ہے بطحا سے کیا حصول / نہ جائیں گے نجف نہ سوئے روضۂ رسولؐ

جنگل کی راہ لیں گے گریباں کو پھاڑ کے
کاٹیں گے منہ چھپانے کو دامن پہاڑ کے

پوچھیں جو دوستان مدینہ مری خبر / کہدیجیے نہ آئیں گے اب وہ کبھی ادھر
صدقے امام دین پہ ہوئے سارے ناموَر / کچھ ان سے ہو سکی نہ مددگاری پدر

بستی بسا کے رن میں شہِ کربلا رہے
کنبہ سے منہ چھپا کے وہ جنگل میں جا رہے

رونے لگا یہ کہہ کے جو وہ چودھویں کا ماہ / بنتِ علیؑ کی آنکھوں میں دنیا ہوئی سیاہ
بھاوج کے منہ پہ یاس سے زینبؑ کی نگاہ / گردن ہلا کے ماں نے بھری ایک سرد آہ

بنتِ علیؑ تو خاک پہ تھرا کے گر پڑی
بانوؑ پسر کے پاؤن پہ غش کھا کے گر پڑی

ماں کو اٹھا کے خاک سے رونے لگا پسر
بیٹے کے گرد پھر کے یہ بولی وہ نوحہ گر
مجکو بھی لے لو ساتھ جو منظور ہے ظفر
زینبؑ پکارین چھوڑ کے ہمکو چلے کدھر
اچھا رضا حسینؑ سے لے لو تو جائیو
کاندھا مرے جنازے کو دے لو تو جائیو

اک دن وہ تھا کہ سوتے تھے چھاتی پہ رات بھر
کرتہ وہ پہنے دوڑتے پھرنا ادھر ادھر
یاد آتی ہین وہ ہنسلیان وہ کان کے گہر
آج تیغ ہاتھ مین ہے دوش پر سپر
غازی ہو صف شکن ہو سعادت نشان ہو
کیا کام ہے نام خدا اب جوان ہو

دادا کا مرتبہ تمھین دے ربِ ذوالجلال
قائم تمھارے سر پہ رہے فاطمہؑ کا لال
قابل ہے رحم کرنے کے واری ہمارا حال
بچپن کی دائیون کا بھی رکھیے ذرا خیال
کس سے ہو پھر امید اگر تم سے یاس ہو
اب تو تمھین ہمارے بڑھاپے کی آس ہو

قوت تمھین ہو دل کی تمھین پارۂ جگر
یہ بھی خبر نہین مجھے کب مر گئے پسر
لاشین بھی گھر مین آئین تو بیٹا نہ پیٹی سر
مین کہتی تھی بچے یہ مرا غیرتِ قمر
اکبرؑ تو ہین اگر مرے پیارے نہین نہین
روشن ہے گھر مین چاند ستارے نہین نہین

باتین یہ کر کے منھ پہ لیا گوشۂ ردا
سر چوب سے پٹک کے کہا وا محمدا
بس گر پڑا پھوپھی کے قدم پر وہ مہ لقا
کی عرض رو کے اے پھوپھی اماں کرو نہ بین

میں بیوفا نہیں ہوں یہ روشن ہے آپ پر
نرغہ ہے فوج کا مرے مظلوم باپ پر

منھ سے ہٹائیے تو ردا بہر کردگار
اچھا نہ جائیں گے سوے میدان کارزار
چادر ہٹا کے منھ سے یہ بولی وہ دلفگار
میں کون ہوں صدقے جاؤں تمھیں کو ہے اختیار
اصغر ہوا کہ تم ہو مجھے سب کا پاس ہے
رخصت گلا کٹانے کی لو ماں تو پاس ہے

اکبرؑ نے ماں کے چہرۂ اقدس پہ کی نظر
ماں نے کیا اشارہ کہ اے غیرت قمر
تم سے پھوپھی خفا ہیں جھکا دو قدم پہ سر
قربان جاؤں عذر کرو ہاتھ باندھ کر
سر کی نہ کچھ خبر ہے نہ چادر کا ہوش ہے
واری یہ پالنے کی محبت کا جوش ہے

جلدی سے ہاتھ جوڑ کے بولا وہ لالہ فام
تقصیر عفو کیجیے اے خواہر امام
بس اب زبان سے کچھ نہیں کہنے کا یہ غلام
میری تو ماں ہیں آپ مجھے کیا کسی سے کام
بندے پہ کی ہے ماں نے یہ شفقت نہ باپ نے
راتوں کو جاگ کر مجھے پالا ہے آپ نے

اکبرؑ نے یہ کلام کیے جب بصد ادب
الفت کا جوش آگیا بنت علیؑ کو تب
لیکر بلائیں چہرے کی بولی وہ تشنہ لب
کڑھتے ہو کس لیے میں تمھیں روکتی ہوں کب
سچ ہے جہاں میں تم سا کوئی باوفا نہیں
واری تمھارے سر کی قسم میں خفا نہیں

کیوں کانپتے ہو اشک ہیں آنکھوں سے کیوں رواں
تم راست گو ہو سچ ہے تمھارا یہ سب بیاں
لو میں نے دی رضا تمھیں اے میرے نوجواں
تم جاؤ آگے صدقے گئی اور تمھاری ماں

یون تو تمام گھر کو محبت ہے آپ سے
کچھ ماں کا حق بھی کم نہیں ہوتا ہے باپ سے

آنکھیں بچھائیں ماں نے جو تم گھٹنیوں چلے
تلوؤں سے اُس کے دیدۂ حق بین سدا ملے
نازوں سے منتوں سے مرادوں سے تم پلے
صدقے ہوئی کبھی تو لگایا کبھی گلے
مادر نے اپنی عمر مصیبت مین کھوئی ہے
برسون یہ بی بی ایک ہی کروٹ سے سوئی ہے

بانو نے ہاتھ جوڑ کے زینبؑ سے یہ کہا
صدقے گئی کنیز کی خدمت کا ذکر کیا
اِس قافلہ مین آپ ہین اب فاطمہؑ کی جا
مین نے بھی دی جو آپ نے بیٹے کو دی رضا
صدقے ہے یہ بھی صورتِ پروانہ آپ پر
پر کیا کرے کہ آج مصیبت ہے باپ پر

یہ ذکر تھا کہ آئے شہنشاہِ بحر و بر
لے لین بلائین بھائی کی زینبؑ نے دوڑ کر
بانو بھی روئی شہ کے قدم پر جھکا کے سر
بولی لپٹ کے بالی سکینہؑ کہ اے پدر
سنتی تھی مین کہ رن سے علمدار آتے ہین
لو اب تو گھر سے نہر پہ بھیا بھی جاتے ہین

بانوؑ کے مُنھ کو دیکھ کے حضرت نے یہ کہا
کیون سچ ہے تم نے بیٹے کو مرنے کی دی رضا
وہ چُپ ہوئی تو بولے بہن سے شہِ ہُدا
کیسے پھوپھی بھتیجون مین کیا فیصلہ ہوا
راہین سب اُن کے روکنے کی بند ہو گئین
سُنتا ہون مین کہ تم بھی رضامند ہو گئین

ہاتھون کو جوڑ کر علی اکبرؑ نے عرض کی
اماں نے بھی رضا ہمین دی اور پھوپھی نے بھی
زہراؑ کی وہ بہو ہین تو یہ دخترِ علیؑ
آقا سوال رد نہین کرتے کبھی سخی

روبا جو میں تو ماں نے گلے سے لگا لیا
مرنے کا اذن دے کے پھوپھی نے جلا لیا

ماں نے کہا پسر کی فصاحت تو دیکھیے
زینبؑ یہ بولیں ذہن کی جودت تو دیکھیے
نام خدا زبان کی طلاقت تو دیکھیے
ہر بات میں ثبوت اجازت تو دیکھیے

کیا بات بھائی اُن کی بھلا بول چال کی
گویا زباں ہے مصحف ناطق کے لال کی

رومال رکھ کے آنکھوں پہ بولے امامِ دیں
سچ ہے ازل سے کچھ کسی انسان کے بس نہیں
تم دو گی رخصت اُن کو مجھے یہ تھا یقیں
آیا تھا اتنی عمر ہی لیکر یہ مہ جبیں

بیچ ہیں ہم وہی جو یہ طالب رضا کے ہیں
اے بنت فاطمہؑ یہ کرشمے قضا کے ہیں

۷۔ عونؑ اور محمدؑ زخمی ہو کر ریگ زار میں گرتے ہیں حضرت علی اکبرؑ ان کی لاش اُٹھانے کے لیے جانا چاہتے ہیں حضرت زینبؑ (عونؑ و محمدؑ کی ماں) اُن کو روکتی ہیں، لاشیں گھر میں آتی ہیں حضرت زینبؑ لوگوں کو رونے سے منع کرتی ہیں، لیکن آخر ضبط نہیں ہو سکتا اور خود بین کرتی ہیں ؎

گھبرا کے در خیمہ سے زینبؑ یہ پکاری
اولاد مجھے تم سے زیادہ نہیں پیاری
سر ننگے میں نکلوں گی جو تم جاؤ گے واری
بتلاؤ تو میں اُنکی ہوں عاشق کہ تمھاری

میدان کی طرف قاسمؑ بے پر بھی نہ جائیں
خوار دان میں عباسؑ دلاور بھی نہ جائیں

بیٹوں سے ہوئی گر تو ہوئی آج جدائی
اک دولت اولاد لٹائی تو لٹائی
سر پر مرے دنیا میں سلامت ہیں بھائی
کیا لٹ گیا وہ کون سی ایسی تھی کمائی

کیوں روؤں میں دنیا میں جو دلبند نہیں ہیں
کیا اکبرؑ و اصغرؑ مرے فرزند نہیں ہیں

یہ ذکر ابھی تھا کہ ستمگار پکارے
لو شاہ کی ہمشیر کے بیٹے گئے مارے
ٹکڑے کیا معصوموں کو تلواروں کے مارے
وہ لوٹتے ہیں خاک پہ دو عرش کے تارے

پامالی کو ان دونوں کے اسوار بڑھیں گے
بچوں کے سر اب کٹ کے نشانوں پہ چڑھیں گے

یہ سنتے ہی تھرانے لگی حضرت عباسؑ
گھبرا کے اٹھے خاک سے شبیرؑ بصد یاس
گھبرا کے ہوئی بیبیاں ڈیوڑھی کے جو تھیں پاس
سب نے کہا لو شہ کی بہن ہو گئی بے آس

ٹوٹا ہے فلک بنتِ شہنشاہ نجف پر
زینبؑ کو چلو لے کے سب اب ماتمی صف پر

ہے ہے کا جو اک شور ہوا اندروں میں برپا
زینبؑ بھی ہٹی چھوڑ کے دروازے کا پردا
چلائی ارے چپکے رہو غل ہے یہ کیسا
بھائی ہیں سلامت مجھے کیوں دیتی ہو پرسا

ہے ہے نہ کرو صاحبو گھبرائیں گے شبیرؑ
پھر کون ہے زینبؑ کا جو مر جائیں گے شبیرؑ

باتیں یہ کہیں سب سے پہ سنبھلا نہ دلِ زار
تڑپا یہ کلیجہ کہ گری خاک پہ اک بار
واں لاشوں پہ روتے ہوئے پہونچے شہِ ابرار
مہمان کوئی ساعت کے ملے دو جگر افگار

کس عمر میں ہستی کا چمن چھوڑ رہے تھے
گودی کے پلے خاک پہ دم توڑ رہے تھے

رخ زرد تھے اور خاک میں آلودہ تھے گیسو
جھک آئے تھے کٹ کٹ کے منہ پیسی وہ ابرو
تلواروں سے ٹکڑے تھے وہ بلور سے بازو
مہتاب سی وہ چھاتیاں اور شیر سے پہلو

پھٹتا تھا جگر آنکھ نہ کھل سکتی تھی غش سے
ہونٹوں پہ زبانیں نکل آئی تھیں عطش سے

ٹکڑے ہوا سینہ میں دلِ سبطِ پیمبر
چھوٹے سے بڑے نے یہ کہا ہوش میں آکر
ہے ہے کہا اور لاشوں سے لپٹے شہِ صفدر
بالیں پہ حضور آئے ہیں چونکو تو برادر
مشتاق تھے تم سیدِ ذیجاہ کو دیکھو
مرتے ہوئے دیدار شہنشاہ کو دیکھو

سنکر یہ صدا غش سے جو چونکا دلِ افگار
اکبرؑ سے یہ کی عرض کہ اے شاہ کے دلدار
دونوں نے رکھا سر قدمِ شاہ پہ اک بار
دشمن ہیں بہت قبلۂ عالم سے خبردار
ہم دونوں غلاموں کا نہ غم کیجیو بھائی
سر پیٹیں جو ماں انھیں سمجھائیو بھائی

حضرت کے جو رونے کی صدا خیمے میں آئی
زینبؑ نے کہا ہائے غضب لٹتے ہیں بھائی
رانڈوں نے اُدھر ماتمی صف گھر میں بچھائی
فضہ یہ پکاری کہ دوہائی ہے دوہائی
لو چاک گریبان کیے آتے ہیں شبیرؑ
معصوموں کی لاشوں کو لیے آتے ہیں شبیرؑ

بیٹھی صفِ ماتم پہ اُدھر شاہ کی خواہر
لاشوں کو لیے آئے جو گھر میں شہِ صفدر
سیدانیوں نے اُٹھ کے اُدھر کھول دیے سر
زینبؑ کے قریں بیٹھ گئے سر کو جھکا کر
فرمایا کہ لو لختِ جگر آئے تمھارے
لو دودھ انھیں بخشو پسر آئے تمھارے

دیکھا جو لہو بچوں کا چھاتی اُمنڈ آئی
پر فاطمہؑ کے صبر کی شان اُس نے دکھائی
نزدیک تھا مر جائے یداللہ کی جائی
سب سے یہ کہا نیک لگی میری کمائی

بچے مرے قربان ہوئے احسان خدا کا
اے بی بی یہ صدقہ ہے یہ شاہِ شہدا کا

رو کر شہِ والا نے کہا صدقے میں تم پر
بانو نے اشارہ کیا اے سبطِ پیمبرؐ
دم بھر انھیں رو لو کہ یہ مہمان ہیں خواہر
قربان گئی آپ بس اب جائیے باہر

گر ضبط اسی طرح سے فرمائینگی زینبؑ
یہ ماتمِ اولاد سے مر جائینگی زینبؑ

روتے ہوئے خیمے سے جو ڈیوڑھی پہ گئے شاہ
یہ نیند ہے کیسی کہ جب تم کو نہیں آہ
فرزندوں کو چلّانے لگی زینبؑ ناگاہ
صدقے گئی جاؤ شہِ کونین کے ہمراہ

زخمی ہوئے شبیرؑ تو جان اپنی میں دوں گی
اچھا میں تمھیں دونوں سے ماں جائے کو لوں گی

لو تیغے کاندھوں پہ دھرو اے مرے پیارو
گو پیاسے ہو دو دن کے یہ ہمت کو نہ ہارو
کٹتے ہوئے شبیرؑ کے ہمراہ سدھارو
یہ خون میں ڈوبے ہوئے کپڑے تو اتارو

اُٹھ بیٹھو میں صدقے گئی اتنا نہیں سوتے
اس طرح تو جاگے ہوئے دولہا نہیں سوتے

سوتا ہے لڑائی کے دن ایسا کوئی غافل
دیکھو کہ تڑپتی ہے یہ ماں صورتِ بسمل
اُٹھو تمھیں کیا ان کے کہیں گے شہِ عادل
تسلّی تو نہیں کا گھٹتا ہے مرا دل

کیا غش میں ہو یہ سونے کا تو وقت نہیں ہوتا
ایسا تو کوئی نیند کا ماتا نہیں سوتا

مثال ۱۸۔ شیریں کو خبر ہوئی ہے کہ امام حسین علیہ السلام مع تمام خاندان کے اُسکے گھر تشریف لاتے ہیں اور وہ مہمانی کا سامان کرتی ہے اور اپنے عزیزوں کو خوشخبری دیتی ہے

لے یہ اشعار جذبات کے ذیل میں بھی داخل ہو سکتے ہیں ۔

یہ کہہ کے اُس نے فرش کیا گھر میں سربسر
مسند بچھائی بہر شہنشاہ بحر و بر
مومن کے دل کی طرح مصفا ہوا وہ گھر
تکیوں کو صاف کرکے لگایا اِدھر اُدھر
کہتی تھی بہر گھر میں ابھی سے جو نور ہے
یہ آمدِ امامِ زمنؑ کا ظہور ہے

دالان ہے یہ شاہ کی خواہر کے واسطے
جھولے کی جا یہ ہے علی صغرؑ کے واسطے
یہ نرم فرش ہے علی اکبرؑ کے واسطے
یہ گھر ہے شاہ دین کے برادر کے واسطے
راحت سے شہ نشین پہ امام زمن رہیں
حجرہ یہ اس لیے ہے کہ دولہا دلھن رہیں

کرسی کو لا کے جلد کسی جا بچھاتی تھی
سجدے میں بہر شکر کبھی سر جھکاتی تھی
تحفوں کو کنتیوں میں کبھی وہ لگاتی تھی
گھبرا کے صحن سے کبھی ڈیوڑھی پہ جاتی تھی
چہرے پہ اک خوشی تھی پہ دل بیقرار تھا
فرزند فاطمہؑ کا اُسے انتظار تھا

جا کر کبھی خواصوں سے کرتی تھی یہ کلام
بھر بھر کے آب سرد کے رکھدو ہوا میں جام
کھانا پکاؤ جلد کہ آتے ہیں اب امامؑ
لبریز آب گرم سے کردو سبو تمام
پردیسیوں کو خیر سے جب گھر میں لاؤں گی
ہاتھوں سے اپنے پانوں سبھوں کے دھلاؤں گی

ہمسائیوں سے کہتی تھی ہنس ہنس کے بار بار
ہے باغ فاطمہؑ پہ عجب حُسن کی بہار
اب کیجیو زیارت سلطان نامدار
رشکِ ریاض خلد ہے اک ایک گلعذار
سب نونہال گلشن دین لاجواب ہیں
قد سرو باغ حُسن ہیں رخ آفتاب ہیں

شمشاد بوستان پیمبرؐ کو دیکھیو		سرو ریاض حضرت شبّرؑ کو دیکھیو
کیا نوجوان شہ کے برادر کو دیکھیو		سب ایک سمت تم علی اکبرؑ کو دیکھیو
	ہوگا کبھی حسن ملک کا نہ حور کا	
	جلوہ ہے اُس جری میں محمدؐ کے نور کا	
خالق رکھے اُسے صدسی سال برقرار		نام خدا ہے شادی کے قابل وہ گلعذار
بہنیں فدا ہیں باپ تصدق ہے ماں نثار		سر پر پھوپھی نے پیار سے گیسو رکھے ہیں چار
	چہرے کے آگے نیّر تاباں بھی ماند ہے	
	عالم کی روشنی ہے اندھیرے کا چاند ہے	
اب خیریت سے گذرے گا اٹھارواں جو سال		شادی کریگی بیٹے کی بانوئے خوشخصال
زینبؑ کو اسکے بیاہ کا ارمان ہے کمال		ہر دم یہی دعا ہے کہ دولھا بنے یہ لال
	آتی ہیں بستیں حلب و شام و روم سے	
	شادی خدا جو چاہے تو ہوگی دھوم سے	
جب ڈھل گئی اسی انھیں باتوں میں دوپہر		شبیرؑ سے پھر یہ کہنے لگی وہ نکوسیر
اب تک نہ آئے گھر میں شہنشاہ بحر و بر		اکبر گئے کہاں کسی سے مفصل سنی خبر
	بستی سے ساتھ لے کے ہر اک اپنے بھائی کو	
	جا پیشوائے خلق کی تو پیشوائی کو	
کہیو مری طرف سے یہ تو چوم کر قدم		لونڈی کو سرفراز کریں یا شہ امم
کرتے ہیں اغنیا غربا پر سوا کرم		اب بے حضور چین نہیں مجکو ایک دم
	کچھ آج ہی تپش سے دل بیقرار میں	
	آنکھیں سپید ہو گئی ہیں انتظار میں	

قربان ہو گئی مرا گھر کچھ نہین ہے دور
ہم لوگ مشت خاک ہین حضرت خدا کے نور
خاصہ تناول آپ کے اس جا کرین حضور
ہو گا یہ کوہ آپ کے آنے سے رشک طور
کہنا حضور راہ ہدایت کی شمع ہین
پروانے یان سحر سے زیارت کو جمع ہین

عرصہ ابھی ہے آپ کے آنے مین کچھ اگر
ڈیوڑھی پہ بند و بست ہے یا شاہ بحر و بر
آنے مین کیون حرم کے ہوئی دیر اس قدر
گڑوا رکھی ہین مین نے قناتین ادھر اُدھر
محمل مین گھٹتی ہووین گی زہرا کی پیاریان
عباسؑ لے کے آئین زنانی سواریان

رزمیہ

رزمیہ شاعری اگرچہ واقعہ نگاری ہی کی قسم کی ہے لیکن وسعت، اور اہمیت کے لحاظ سے اسکے لیے جداگانہ عنوان درکار ہے،

اُردو بلکہ عربی مین بھی رزمیہ شاعری کو چندان ترقی نہین ہوئی عربی مین مثنوی سرے سے مفقود ہے، اور مسلسل واقعات مثنوی کے سوا، اور کسی صنف مین ادا ہی نہین ہو سکتے، شعرائے جاہلیت، لڑائی کے جستہ جستہ واقعات قصائد مین ادا کر لیا کرتے تھے، لیکن اس تمام شاعری مین، کوئی مسلسل رزمیہ نظم ۵ شعرون کی بھی نہین مل سکتی،

فارسی مین شاہنامہ اور سکندر نامہ کو الگ کر لیا جائے تو کچھ باقی نہین رہتا، لیکن ایک شاہنامہ ہزارون کتابون پر بھاری ہے اس لیے فارسی شاعری کا رتبہ اس حیثیت مین عربی سے بڑھا رہا۔ اور اسکو خود زبان دانان عرب نے تسلیم کیا چنانچہ

ابن الاثیر نے مثل السایر مین صاف لکھدیا کہ عربی زبان باوجود اس قدر وسعت اور بایہ داری کے شاہنامہ کی نظیر نہین پیش کرسکتی،

اُردو مین لے دیکر، میر تقی ہوس کے چند اشعار ہین جو نوفل اور لیلی کے قبیلہ کی لڑائی کے موقع پر لکھے ہین اُس کا نمونہ یہ ہے

شانون سے گذر کے رُمح چالاک	تھے ہوش رُبائے مار ضحاک

مرثیہ مین، میر ضمیر نے رزمیہ کی ابتدا کی، لیکن وہ بالکل نقش اولین تھا، میر انیس نے جسطرح اس صنعت کو کمال کے درجہ تک پہنچایا اسکے لحاظ سے، اُردو شاعری گو فارسی کے برابری کا دعوی نہین کرسکتی لیکن عربی سے کسی طرح پیچھے نہین؛

رزمیہ شاعری کا کمال، امور ذیل پر موقوف ہے سب سے پہلے لڑائی کی تیاری معرکہ کا زور شور، تلاطم، ہنگامہ خیزی، ہلچل، شور و غل، نقارون کی گونج، ٹاپون کی آواز، ہتیارون کی جھنکار، تلوارون کی چمک دمک، نیزون کی لچک، کمانون کا کڑکنا، نقیبون کا گرجنا، ان چیزون کا اس طرح بیان کیا جائے کہ آنکھون کے سامنے معرکہ جنگ کا سمان چھا جائے، پھر بہادرون کا میدان جنگ مین جانا، مبارز طلب ہونا باہم معرکہ آرائی کرنا، لڑائی کے داؤن پیچ دکھانا، ان سب کا بیان کیا جائے اسکے ساتھ، اسلحہ جنگ، اور دیگر سامان جنگ کی الگ الگ تصویر کھینچی جائے پھر فتح یا شکست کا بیان کیا جائے اور اس طرح کیا جائے کہ دل دہل جائین، یا طبیعتون پر اداسی اور غم کا عالم چھا جائے۔

فردوسی کے ہان یہ تمام باتین پائی جاتی ہین، مثلاً وہ معرکہ جنگ کا سمان اس طرح کھینچتا ہے

جہان لرز لرزان شد و دشت و کوہ	زمین شد ز نعل ستوران ستوہ

برآمد ز هر سو ز لشکر خروش
همی پیل را زان بدرید گوش

ز بس نیزه و گرز و گوپال و تیغ
تو گفتی همه ژاله بارد ز میغ [بادل ابر]

بلند آسمان چون زمین شد ز خاک
ز هر سو همی بر شده چاک چاک

درخشیدن تیغ هاے بنفش
ازان سایهٔ کاویانی درفش

تو گفتی که اندر شب تیره چهر
ستاره همی بر فشاند سپهر
ق

سیه شد ز گرد سپه آفتاب
ز پیکان پولاد و پر عقاب

دل کوه گفتی بدرد همی
زمین با سواران بیترد همی

تو گفتی که ابرے برآمد سیاه
ببارید خون اندران رزمگاه

ز گرد سپه روشنائی نماند
ز خورشید شب را جدائی نماند

ز جوشش سواران و زخم تبر
دگر کوه خارا برآورد سر

زمین شد ز نعل ستوران ستوه
همان کوه دریا شد و دشت کوه

ز بس نعره و نالهٔ کرناے
همی آسمان اندر آمد ز جاے

سنان هاے رخشان و تیغ سران
درفش از بر و زیر گرز گران

بجوشید دشت و بجنبید کوه
ز بانگ سواران هر دو گروه

ز آهن زمین بود و از گرز میغ
ستاره سنان بود و خورشید تیغ

زمین لاله گون شد هوا نیلگون
برآمد همی موج دریاے خون

اِسکے مقابلہ مین میر انیس کا رزمیہ دیکھو

ہنگامۂ جنگ

نقارهٔ دغا پہ لگی چوب یک بیک
اُٹھا غریو کوس کہ ہلنے لگا فلک

شیپو کی صدا سے ہراساں ہوے ملک
قرنا پھنکی کہ گونج اُٹھا دشت دور تک

شورِ دُہل سے حشر تھا افلاک کے تلے
مُردے بھی ڈر کے چونک پڑے خاک کے تلے

گھوڑوں سے گونجتا تھا وہ سب وادیِ نبرد
گردن میں مثلِ شیشۂ ساعت بھری تھی گرد
تھا چرخ چارمیں پہ رُخِ آفتاب زرد
ڈر تھا گرے زمیں پہ نہ مینائے لاجورد
گرمی ہجومِ فوج سے دہ چند ہو گئی
خاک اس قدر اُڑی کہ ہوا بند ہو گئی

کانپے طبق زمیں کے ہلا چرخِ لاجورد
مانندِ کہربا ہوا مٹی کا رنگ زرد
اُٹھ کر زمیں سے بیٹھ گئی زلزلہ میں گرد
تیغوں کی آنچ دیکھ کے بھاگی ہوائے زرد
گرمی سے ان کے ہوش اُڑے وحش و طیر کے
شیر اُس طرف اُتر گئے دریا کو پیر کے

اللہ رے زلزلہ کہ لرزتے تھے دشت و در
جنگل میں چھپتے پھرتے تھے ڈر ڈر کے جانور
جنّات کانپ کانپ کے کہتے تھے الحذر
دنیا میں خاک اُڑتی ہے اب جائیں ہم کدھر
اندھیر ہے اُٹھی برکت اب جہان سے
ٹوٹ گیا زمیں کا طبق آسمان سے

تھرا رہا تھا خوف سے مینائے لاجورد
ہلتے تھے کوہ، کانپتا تھا وادیِ نبرد
تھا دن بھی سرد، دھوپ بھی زرد اور زمیں بھی زرد
خورشید چھپ گیا، یہ اُٹھی کربلا میں گرد
اک تیرگی غبار سے تھی چشمِ مہر میں
نابود پڑے ہوئے تھے محیطِ سپہر میں

فوج کی تیاریاں اور سامان

اُمڈی ہوئی تھی فوج پہ فوج اور دل پہ دل
تھے برچھیوں کی صورتِ مقراض پھل پہ پھل

خنجر وہ جنگی آب مین تحتی تلخی اجل
وہ گرز جن کے ڈر سے گرے دیو منھ کے بل

وہ دو دو تیر تھے پاس ہر اک خود پسند کے
حلقون پہ تھے نیچے جیسے حلقے کمند کے

وہ دھوم طبل جنگ کی وہ بوق کا خروش
تھرائی یون زمین کہ اُڑے آسمان کے ہوش
کر ہوگئے تھے شور سے کر و بیون کے گوش
نیزے ہلا کے نکلے سواران درع پوش

ڈھالیں تھیں یون سرون پہ سواران شوم کے
صحرا مین جیسے آئے گھٹا جھوم جھوم کے

حد سے فزون ہر کثرت افواج نابکار
ہر سمت ہر سنان پہ سنان مثل کارزار
نیزہ پہ نیزہ تیغ پہ ہے تیغ آبدار
ہر صف مین ہر سپر پہ سپر مثل لالہ زار

پیکان ہم ہین جیسے ہون گل بے کھلے ہوئے
گوشون سے ہین کمانون کے گوشے ملے ہوئے

دریا کی طرح لشکر کین مارتا ہر جوش
غل مین مبارز کا ہر اک صف مین ہر خروش
ہر صف مین برچھیان بھی ہزارون جھکتی ہیں
نیزے تلے ہوئے ہین، سنانین چمکتی ہیں
نیزے ہلا رہے ہین جوانان درع پوش
چلے چڑھے ہوئے ہین کمانون کے تا بگوش
ترکین وہ تیر ہین کہ دلون مین کھٹکتی ہیں
ترکش کھلے ہوئے ہین کمانین کڑکتی ہیں

سنگین دلون نے ہاتھون مین پتھر اٹھائے ہیں
تیغون کے ساتھ گرز گران سر اٹھائے ہیں

سپاہیون کی آمدگی جنگ

تنتا ہوا بڑھا کوئی قبضہ کو چوم کے
چتون کسی کی شور دل سے بگڑ گئی

ولہ

بھالا کسی نے رکھ لیا، کاندھے پہ جھوم کے
منھ سرخ ہو گیا، شکن ابرو پہ پڑ گئی

نکلا کوئی سمند کو زانو مین داب کے
غصے سے رہ گیا کوئی ہونٹون کو چاب کے

ولہ

پاسِ ادب سے شاہ کے صف بڑھ کے تھم گئی
پٹری ہر اک سوار کے گھوڑے پہ جم گئی

حملہ کا زور شور اور فوجون کی ہلچل

نکلی جو رن مین تیغ حسینی غلاف سے
اُڑنے لگے شرر دمِ خارا شگاف سے
بجلی بڑھی چمک کے جو دشتِ مصاف سے
صاف آئی الاماں کی صدا کوہ قاف سے
طبقے فلک کے صوتِ گہوارہ ہل گئے
دب کر پہاڑ خاک کے دامن سے مل گئے

لرزہ تھا تحت و فوق و جنوب و شمال مین
ارکان غرب و شرق تھے بیم زوال مین
مضطر تھے شش جہت کے مکین ایک حال مین
غل تھا کہ گھر گئے غضبِ ذوالجلال مین
اللہ کا غضب نمونۂ قہر آلہ تھا
تلوار کیا عَلَم تھی کہ عالم تباہ تھا

جنگل مین تھی علم جو وہ تیغ شرر فشاں
تھرا کے آسمان مین چھپتا تھا آسماں
غار اندرون سر جھپٹ گئے شیرانِ نیستاں
برپا تھا بر و بحر مین اک شور الاماں
مانند موج مچھلیون مین اضطراب تھا
زہرہ ہر ایک سنگ کا پانی مین آب تھا

اُٹھا جو الحفیظ کا روحانیون مین شور
مُردے دہل کے چونک پڑے سب میانِ گور
چلّائے گرگ و شیر و غزالان و مار و مور
ہے بازوے حسینؑ مین دستِ خدا کا زور
اُلٹے ہین مثلِ شیرِ خدا آستین کو
اے کردگار رعشش بچا لے زمین کو

تھا فوجِ قاہرہ میں تلاطم کہ الحذر
تھیں موج کی طرح سب اُدھر کی صفیں اُدھر
چکر میں تھی سپاہ کہ گردش میں تھا بھنور
پانی میں تھے نہنگ، اُبھرتے نہ تھے مگر
موجیں فقط نہ بھاگی تھیں منھ موڑ موڑ کے
دریا بھی ہٹ گیا تھا، کنارہ کو چھوڑ کے

تھا شش جہت میں غل کہ یہ ہے روزِ انقلاب
اُلٹے گا اس زمیں کا ورق ابنِ بوتراب
اس شیر پر نہ ہو گی کوئی فوج فتحیاب
بس اب بنائے عالمِ امکاں ہوئی خراب
حملہ غضب ہے بازوئے شاہِ حجاز کا
لنگر نہ ٹوٹ جائے زمیں کے جہاز کا

ملتی تھی جائے امن نہ زیرِ فلک کہیں
غل تھا کہ مل نہ جائے سما سے سمک کہیں
جنات بدحواس کہیں تھے ملک کہیں
سایہ کہیں تھا، تیغ کہیں تھی چمک کہیں
پانی سے جل بجھا تھا کوئی کوئی نار سے
گرتی تھیں تن میں بجلیاں اک ذوالفقار سے

پریوں سے قاف چھوٹ گیا، اور جنوں سے گھر
شیروں سے دشت، گرگ سے بن، اژدروں سے در
شاہین و کبک چھپ گئے اک جا ملا کے سر
اُڑ کر گرے جزیروں میں جنگل کے جانور
سمٹے پہاڑ منھ کو جو دامن سے ڈھانپ کے
سیمرغ نے گرا دیے پر کانپ کانپ کے

فوجوں کی ابتری اور ہلچل

گرتی تھی برقِ تیغ جو ہر پل اِدھر اُدھر
سمٹے ہوئے تھے ڈھالوں کے بادل اِدھر اُدھر
شبدیز تھا کہ پھر رہی تھی کل اِدھر اُدھر
بھاگڑ تھی قلبِ فوج میں ہلچل اِدھر اُدھر
ہر جا تنوں کے ڈھیر سروں سے بلند تھے
بھاگیں کہاں گریز کے کوچے تو بند تھے

تیغیں سپر کے ساتھ کٹیں خود سر کے ساتھ
سینہ کمر کے ساتھ کٹا، دل جگر کے ساتھ
ہلچل یہ تھی کہ باپ نہ ٹھہرا پسر کے ساتھ
اس معرکہ مین چھوٹ گئے عمر بھر کے ساتھ
بھاگے شریر خلعت و منصب کو چھوڑ کر
جانین روانہ ہو گئین قالب کو چھوڑ کر

سرہنگ شام ٹھوکرین کھا کھا کے مر گئے
جو بچ گئے اِدھر سے اُدھر جا کے مر گئے
کتنے جوان سمون کے تلے آ کے مر گئے
پس پس کے سُرمہ ہو گئے ٹکرا کے مر گئے
ہلچل نے استخوان بدن چور کر دیے
بیٹون نے بازون باپ کی چھاتی پہ دھر دیے

تھا الاماں کا شور پریشان تھے اہل شر
تیغون کے پیچھے ڈر کے چھپی تھی ہر اک سپر
ماتھے علم رگڑتے تھے جھک جھک کے خاک پر
پرچم نے بال کھولے تھے فریادیون کے سر
دانتون مین خس ہراس سے تھی ہر جوان کے
جادر ہار بیٹھے تھے پھریرے نشان کے

بے رخ کمانین تیرون سے چلے کمان سے دور
مُرغانِ تیر تھے، ہوئے آشیان سے دور
برچھے سے پھل گرے ہوئے نیزے سنان سے دور
پیرون سے عقل دور، تہور جوان سے دور
تیغون کی کچھ خبر تھی نہ ڈھالون کا ہوش تھا
نیزہ ہر اک سوار کو اک بار دوش تھا

درپے تھی سرکشون کی جو دودم تیغ جانستان
گوشون سے تھی بلند صدا ہے اماں اماں
ترکش سے تیر بھاگتے تھے تیر سے کمان
گردن سے سر، رگون سے لہو اور تنون سے جان
بارِ عقاب تیر کو پرواز کا نہ تھا
رن مین کہین نشان قدر انداز کا نہ تھا

ملتا نہ تھا صفوں میں علم کا نشاں کہیں ۔ چلّے کہیں تھے، شست کہیں تھی کماں کہیں
تیغے کہیں تھے، ڈھال کہیں تھی، سناں کہیں ۔ جمدھر کہیں، کمند کہیں، برچھیاں کہیں
اک اک سیاہ رو کا جگر داغ داغ تھا
جنگل تمام ڈھالوں کے پھولوں سے باغ تھا

وہ گھاٹ باڑھ اور وہ اسکی چمک دمک ۔ کانپی کبھی زمیں، کبھی تھرا گئے فلک
شعلہ میں یہ چمک تھی نہ بجلی میں یہ لپک ۔ ہر ضرب میں سما ہے تلاطم تھا تا سمک
گو میں میں حواس بجا تھے نہ ایک کے
گاؤ زمیں سمٹتی تھی گھٹنوں کو ٹیک کے

ڈر ڈر کے پچھلے پاؤں سپاہ لعیں ہٹی ۔ یہ صف سوئے یسار وہ سوئے یمیں ہٹی
سہمے جبال نہر کہیں سے کہیں ہٹی ۔ دہشت سے آسماں ہوا اونچا زمیں ہٹی
بھاگڑ پڑی کہ ایک سے اک آگے بڑھ گیا
دریا لہو کا کشتی گردوں پر چڑھ گیا

نعرہ جدا، صدائے بگیر و دمدمہ جدا ۔ گوشے کماں سے دور تھے، گوشوں سے چلّہ جدا
بکتر جدا، زمیں پہ ٹکڑے زرہ جدا ۔ نیزوں کو دیکھیے تو گرہ سے گرہ جدا
اللہ رے فرق، گردن و سر بھی بہم نہ تھے
کشتوں کا ذکر کیا ہے کہ تیغوں میں دم نہ تھے

مغفر نہ سر کے پاس، نہ خنجر کمر کے پاس ۔ بیٹے کے پاس باپ، نہ بیٹا پدر کے پاس
قبضہ کے پاس تیغ، نہ دستہ تبر کے پاس ۔ کڑیاں زرہ کے پاس، نہ دامن سپر کے پاس
نیزے نہ تھے سناں، نہ پرچم نشان پر
پیکاں نہ تیر پر تھا، نہ چلّہ کماں پر

معرکہ آرائی اور فنون جنگ کا اظہار قدیم زمانہ مین جنگ کا دستور تھا کہ عام لڑائی سے پہلے دونون طرف سے پہلے، ایک ایک شخص میدان مین نکل کر حریف سے معرکہ آرا ہوتا تھا اس بنا پر تمام مرثیہ گویون نے اس قسم کی معرکہ آرائیان بیان کی ہین لیکن مرزا دبیر وغیرہ یہ واقعہ اسطرح لکھتے ہین کہ یہ نہیین اندازہ ہوتا کہ حریفون نے فن جنگ کے کیا کیا ہنر دکھائے بخلاف اسکے میر انیس اسکو اس طرح ادا کرتے ہین کہ گویا فن جنگ کا بڑا ماہر لڑائی کے تمام داؤن پیچ بتا رہا ہے، چونکہ عرب مین سب سے پہلے لڑائی کی ابتدا رجز سے ہوتی تھی اس لیے پہلے ہم رجز کا انداز دکھاتے ہین۔

رجز عرب مین سب سے پہلے، حریف میدان مین نکل کر رجز پڑھتا تھا یعنی اپنی شجاعت، اور دلیری کا خود اظہار کرتا تھا، اس بنا پر میر انیس نے جابجا رجز لکھا ہے لیکن چونکہ امام حسین علیہ السّلام کی زبان سے پہلوانی کا اظہار، ان کے رتبہ کے شایان نہ تھا، اس لیے اکثر رجزون مین پہلوانی اور بہادری کے بجائے فضیلت اور شرف کا اظہار کیا ہے مثلاً ؎

مین ہون سردار شباب چمن خلد بریں	مین ہون انگشتر پیغمبر خاتم کا نگیں
مین ہون خالق کی قسم دوش محمد کا مکیں	مجھ سے روشن ہے فلک مجھ سے منور ہے زمین

ابھی نظرون سے نہان نور جو میرا ہو جائے
محل عالم امکان مین اندھیرا ہو جائے

پھر یہ بیان کر کے کہ جناب رسول اللہ صلعم اور جناب امیر حمزہ سید الشہدا کے تمام تبرکات مجھی کو وراثت مین ملے ہین، فرماتے ہین ؎

یہ قبا کس کی ہے بتلاؤ یہ کس کی دستار	یہ زرہ کس کی ہے پہنے ہون جو مین سینہ فگار
بر مین کس کا ہے یہ چار آئینۂ جوہر دار	کس کا رہوار ہے آج مین جسپر ہون سوار

کس کا یہ خود ہے، یہ تیغ دو سر کس کی ہے
کس جری کی یہ کمان ہے، یہ سپر کس کی ہے

لیکن عام رجز کے قاعدہ کے لحاظ سے، بعض بعض جگہ شجاعت اور زور و قوت کا بھی اظہار کیا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں ؎

بخشا ہے مجھکو حق نے شہ لافتیٰ کا زور
ہے انگلیوں کے بند میں خیبر گشا کا زور
اس دست مرتعش میں ہے دست خدا کا زور
پانی ہے میرے زور کے آگے ہوا کا زور

لوٹوں فلک کو یوں جو ہو قصد انقلاب کا
جسطرح ٹوٹ جاتا ہے ساغر حباب کا

آگے بڑھوں جو تیر کو چلّہ میں جوڑ کے
بیکار کر دوں شیر کا پنجہ مروڑ کے
بھاگیں خطا شعار کمانوں کو چھوڑ کے
پٹکوں زمین پر در خیبر کو توڑ کے

الٹوں طبق زمین کے یوں جھاڑ کے زین سے
جسطرح جھاڑ دیتے ہیں گرد آستین سے

دنیا ہو اک طرف تو لڑائی کو سر کروں
بے جبرئیل کار قضا و قدر کروں
آئے غضب خدا کا اُدھر رخ جدھر کروں
انگلی کے اک اشارے میں شق القمر کروں

طاقت اگر دکھاؤں رسالت مآب کی
رکھدوں زمیں پہ سپر کے ڈھال آفتاب کی

یہ تیغ سر پہ گر کے ٹھہری ہے زین پر
خیبر میں کیا گذر گئی روح الامین پر
جب ہاتھ اٹھائے برق گری ہے زمین پر
کاٹے ہیں کس کی تیغ دو پیکر نے تین پر

گھوڑے پر سوار ہونا

لو اب سوار ہوتے ہیں عباس نامور
لو دامن قبا نے لیا بوسہ کمر

لو ہٹ کے ہاتھ آپ نے رکھا ایال پر ۔۔ لو آفتاب خانۂ زین میں ہی جلوہ گر

برچھا لیا سمند میں زانو کو داب کے
لو دو ہلال بن گئے حلقے رکاب کے

دو حریفوں کی معرکہ آرائی اور فنونِ جنگ

فردوسی کا یہ بڑا کمال خیال کیا جاتا ہی کہ وہ لڑائی کے تمام جزئیات داؤں پیچ، اور فنونِ جنگ کا نقشہ کھینچتا ہی لیکن انصاف یہ ہی کہ وہ سرسری اور معمولی باتوں کے سوا، لڑائی کے ہر قسم کے تمام کرتب نہیں دکھاتا، سب سے بڑا سین جو اُس نے دکھایا ہی وہ رستم اور اشکبوس کا معرکہ ہی اس موقع کے اشعار یہ ہیں ؎

خدنگے بر آورد پیکان چو آب ۔۔ نہادہ بر وچار پر عقاب
بمالید چاچی کمان را بدست ۔۔ بہ چرم گوزن اندر آمد شکست
ستون کرد چپ را و خم کرد راست ۔۔ خروش از خم چرخ چاچی بخاست
چو زد تیر بر سینۂ اشکبوس ۔۔ سپہر آن زمان دست او داد بوس
چو پیکان ببوسید انگشت اوے ۔۔ گذر کرد از مہرۂ پشت اوے

ان اشعار میں تیر اندازی کا وہی معمولی طریقہ ادا کیا ہی، البتہ نہایت شاندار اور پُر زور الفاظ میں ادا کیا ہی لیکن میر انیس لڑائی کے ہر قسم کے کرتب اور ہنر اس تفصیل سے بیان کرتے ہیں کہ عربی اور فارسی میں اُس کی نظیر نہیں مل سکتی، ملاحظہ ہو ؎

یہ کہہ کے اپنے چھوٹے سے نیزہ کو دی ہلال ۔۔ چمکی انی تو برق پکاری کہ الاماں
اک بند باندھ کر جو فرس سے کہا کہ ہاں ۔۔ ڈانڈ آئی ڈانڈ پر تو سناں سے لڑی سناں

بل کیا کرے کہ زور ہی موذی کا گھٹ گیا
قل تھا کہ اژدہے سے وہ افعی لپٹ گیا

جھنجھلا کے چوب نیزہ کو لایا وہ فرق پر
دو انگلیون مین نیزۂ دشمن کو تھام کر
قاسم نے ڈانڈ ڈانڈ، یہ مارا اچک کے سر
جھٹکا دیا کہ جھک گئی گھوڑے کی بھی کمر
نیزہ بھی دب کے ٹوٹ گیا نابکار کا
دو انگلیون سے کام لیا ذوالفقار کا

سنبھلا وہ بے شعور یہ جھٹکا اٹھا کے جب
چلہ مین تیر جوڑ چکا جب وہ بے ادب
قبضہ مین لی کمان کیانی بصد غضب
تیوری چڑھائی قاسم نوشاہ نے بھی تب
تیر نگاہ سے وہ خطا کار ڈر گیا
کانپے یہ دونون ہاتھ کہ چلہ اتر گیا

ہر بار جانبین سے ہوتے تھے وار رد
جب بڑھ کے وار کرتا تھا وہ بانی حسد
تھا حرف ضرب مین وہ شقی بھی ملائے بد
کہتا تھا بازوئے شہ دین، یا علی مدد
یون روکتے تھے ڈھال پہ تیغ جہول کو
جس طرح روک لے کوئی شہ زور پھول کو

لایا جو حرف سخت زبان پر وہ بد خصال
گھوڑے سے بس ملا دیا گھوڑا بصد جلال
جھپٹا مثال شیر درندہ حسن کا لال
اتنے بڑھے کہ لڑ گئی اسکی سپر سے ڈھال
اوجھڑ گئی کہ ہوش اڑے خود پسند کے
گھوڑے نے پاؤن رکھ دیے سر پر سمند کے

عباس نامدار نے پہلو سے دی صدا
دشمن کے مار ڈالنے کی بس یہی ہے جا
ہان اب نہ جانے دیجیو لخت حسن مرحبا
سنتے ہی یہ فرس سے فرس کو کیا جدا
گھوڑا بھی اس طرف کو، ادھر ہو کے پھر پڑا
مارا اگر یہ ہاتھ کہ دو ہو کے گر پڑا

ایک اور موقع سے

نیزے ہلے، وہ چل گئیں چوٹیں کہ الاماں
ہر طعن قہر کی تھی قیامت کے ہر کاب
چنگاریاں اڑیں جو سناں سے لڑی سناں
دو اژدہے گتھے تھے نکالے ہوئے زباں
پھیلے شرر پرندوں کی جانیں ہوا ہوئیں
شمعوں کی بتیاں لویں کہ ملی اور جدا ہوئیں

ان کا نہ ایک وار نہ اس کے ہزار بند
بڑھ بڑھ کے کھول دیتا تھا یہ شہسوار بند
کیا دنیزہ بازی میں تھا بار بار بند
چوٹوں سے نیلگوں تھے جفا جو کے چار بند
خالی گئی نہ فرق کی نہ دست و پا کی چوٹ
کھلتی تھی ہر بندھی ہوئی مشکل کشا کی چوٹ

ڈوبی گرہ میں نیزۂ ظالم کی جب سناں
گھوڑا اڑا کے ہاتھ کو اکبر نے دی نکال
اللہ رے زور اٹھ لیا گھوڑے سے پہلواں
دست شقی سے چھوٹ گئی ڈانڈ ناگہاں
نیزہ کے ساتھ شور اٹھا اس گروہ سے
لو اژدہے کو لے گیا سیمرغ کوہ سے

ظالم نے ڈھال دوش سے لی اور کمر سے تیغ
بدلا تھا اس نے ٹھاٹ کہ چمکی ادھر سے تیغ
دو چار بار ڈوب کے نکلی سپر سے تیغ
چلنے میں گھٹتی بڑھتی تھی کس کس ہنر سے تیغ

ولہ

چمکی سپر کے پاس کبھی برق کی مثال
شانے پہ آئی سینہ پہ لی جب شقی نے ڈھال
سر کو بتا کے کاٹ گئی وہ زرہ کا جال
جوشن کی کڑی کڑی تھی کہ مضطر تھا جیسے جال
روکے کسے؟ جواب کسے دے؟ کدھر پھرے؟
بجلی کے ساتھ کہاں تک سپر پھرے

چمکی جو تیغ، ڈھال وہ لایا قریب سر
اک برق سی گری کہ دو پارہ ہوئی سپر
مغفر سے سر میں تھی اتر گردن سے صدر پر
سینے سے جب بڑھی تو ہوا تب وہ باخبر
سب نشۂ غرور جوانی اتر گیا
تلوار تھی کہ حلق سے پانی اتر گیا

ایک اور موقع سے

تولا شقی نے سنتے ہی یہ گرز گاؤسر
اکبر نے دوش پاک سے لی ہاتھ میں سپر
آیا ادھر سے گرز ادھر سے چلا تبر
دو ہو گیا عمود مثال خیار تر
گرز اس طرح نکل گیا پنجے سے چھوٹ کے
سمجھے یہ سب زمیں پہ گرا ہاتھ ٹوٹ کے

بھالا سنبھالا دشمن ایماں نے مل کے ہاتھ
نیزے کے چار پانچ نکالے سنبھل کے ہاتھ
پہلے ہی بک چکا تھا ستمگر اجل کے ہاتھ
بڑھتا نہ تھا جو پاؤں تو رکتا تھا چل کے ہاتھ
کم تھے نہ یہ بھی زور میں گرچہ وہ زیاد تھا
نیزے کے بند بند کا توڑ ان کو یاد تھا

رکھ کر تبر نیام سے لی تیغ شعلہ ور
گھبرا کے خود اماں نے صدا دی کہ الحذر
بھالے کے ہاتھ بھول گیا سب وہ خیرہ سر
یہ بھی ادھر تھے پھرتا تھا نیزہ جدھر جدھر
جاتا کدھر یہ تیغ سے جائے اماں نہ تھی
دیکھا جو غور سے تو سناں کی زباں نہ تھی

بالائے سر جو ڈانڈ کو لایا وہ خود پسند
کھولے تمام نیزۂ بیداد گر کے بند
پھینکی شقی نے فرق پہ جھنجھلا کے پھر کمند
سر کو بچا کے شیر نے تلوار کی بلند
گردش بھی ہاتھ کی نہ بڑھے کچھ نہ ہٹ گئے
حلقے کھلے تھے جو وہ اشارے میں کٹ گئے

ہٹ کر خطا شعار نے جوڑا کمان میں تیر
سرکش خدنگ مرگ سے کیونکر ہو گوشہ گیر
تیر افگنی میں شہرۂ آفاق تھا شریر
چلّہ کٹا کمان کا زہے تیغ بے نظیر
قربان زور ضربت نصرت نشان کے
کھل کر قضا پہ بندھ گئے بازو کمان کے

خادم نے تیر جوڑ کے دی دوسری کماں
سینہ ادھر اُٹھی تھی کہ جھکی اُدھر سناں
نیزہ اُٹھا کے شیر نے آواز دی کہ ہاں
بھالے کی نوک جھونک نئی تھی نئی نکال
سہما یہ دل کہ بن گئی موذی کی جان پر
ناوک زمین پہ تھا تو کمان آسمان پر

ایک اور موقع پر سے

پیہم ہوئیں تکاں پہ تکانیں جو یک گر
کس نوک جھوک سے دم میں نیزے کو پھیر کر
ظالم کبھی اِدھر تھا تو نصرت کبھی اُدھر
فرزند شیر حق نے دکھایا عجب ہنر
ظالم پہ آسمان سے بلا ناگہاں گری
دم میں نیزہ اُڑ کے زمین پر سناں گری

چلّہ میں رکھ کے تیر بڑھے قبلۂ امم
کچھ کہہ کے گوش شہ میں چلا تیر تیز دم
اک ہات راست کر کے کیا دوسرے کو خم
آواز دی کمان نے زہے شاہ باکرم
چلّہ تو شست شاہ زمن سے نکل گیا
واں تیر دل کو توڑ کے تن سے نکل گیا

گھوڑا فردوسی کے ہاں گھوڑے کی تعریف میں جستہ جستہ دو چار شعر پائے جاتے ہیں، لیکن متاخرین نے اس مضمون کو بہت وسعت دی اور مبالغہ کو حد سے بڑھا دیا۔ سب سے پہلے عبدالواسع جبلی نے ایک قصیدہ کی تشبیب گھوڑے کی مدح سے کی ہے

اے بہ بالا ہمچو آتش وے سوے پستی چو آب	خاک وصفی زرد رنگ باد رنگے در شتاب
گر کنی پویہ نباشد ابر با تو ہم عنان	گر بری حملہ نباشد برق با تو ہم کاب

مبالغہ ملاحظہ ہو ؎

از جبل پنہان شوی در سایہ پرہ پشہ	ور بہر جولان کنی در گوشہ چشم ذباب

ایک شعر کے بعد لکھتے ہین کہ جب تو بلندی سے پستی کی طرف آتا ہو یا پستی سے بلندی پر چڑھتا ہو تو ؎

نسبتی داری ہمانا با قضاے آسمان	قربتے داری ہمانا با دعاے مستجاب

عرفی نے بھی ایک قصیدہ گھوڑے کی مدح مین لکھا ؎

اے طعن فلک نوشتہ بر سُم	وے زلف صبا بریدہ از دُم
بر غنچہ سبک روی بد افساں	کش خندہ نزاید از تبسُّم
تازی بہ لب فسانہ پرداز	زان گو نہ کہ کشکنی تکلم

ایک اور قصیدہ مین لکھتا ہو ؎

آن سبک سیر کہ گر گرم عنانش سازی	از ازل سوے ابد نزاید آید بہ ازل
قطرہ کش دم رفتن چکد از پیشانی	شبنم آسا نشیند گر رجعت بہ کفل
گر سر خصم تو بندد بہ پایش دم نزع	تا قیامت بہ تکاپوش نرسد دست اجل

زلالی لکھتا ہو ؎

ز جستن جستن او سایہ در دشت	چو زاغ آشیان گم کردہ می گشت

یعنی گھوڑا اس طرح جنگل مین اڑتا پھرتا تھا کہ خود اس کا سایہ اُس کو یون ڈھونڈھتا پھرتا تھا جسطرح کوا اپنے گھونسلے کو ڈھونڈھتا پھرے۔

اردو مین مرزا سودا نے کہا ؎

روبرو سے اگر آئینہ کے اُس گلگون کو
اتنے عرصہ مین پھر آئے تو اُسے باور کرا
پھاند دے لپکے کبھی شرق سے تو غرب تلک
عکس بھی آئینہ سے ہونے نہ پائے منفک

مرزا دبیر صاحب فرماتے ہین ع سرعت کا یہ عالم ہو کہ رن بڑھ نہین سکتا +
ان تمام اشعار کے نقل کرنے سے مقصود یہ ہر کہ فارسی اور اُردو مین، جو کچھ
گھوڑے کی مدح مین لکھا گیا، وہ صرف ناممکنات کے افسانے تھے، کسی نے یہ نہین کیا
کہ گھوڑے کا اصلی خد و خال، ڈیل ڈول، چہرہ مہرہ، چل پھر، آؤ جاؤ کا نقشہ دکھاتا۔
میر انیس صاحب بھی اگرچہ مذاق عام کی پیروی سے اکثر بہکے مین چنانچہ فرماتے ہین
ع آنکھون مین یون پھرے کہ مژہ کو خبر نہو ؎ .

تنگی سے آسمان کی خفا یہ سمند ہے
گیو کر اُڑے پری ہر کہ شیشہ مین بند ہر

تاہم ان کا اصلی جوہر بھی ہر جگہ نمایان ہر: ملاحظہ ہو ؎

باریک جلد وہ کہ نظر آئے تن کا خون
رفتار مین وہ سحر کہ پریون کو ہو جنون
گنڈے کو دیکھ کر مہ نو ہوئے سرنگون
غنچے بھی کچھ بڑھے ہین کنوتی کو کیا کہون

قربان ہزار جان فرس بے نظیر پر
پیکان دو چڑھے ہوئے ہین، ایک تیر پر

نازک مزاج، وخوش قد و طناز و سربلند
وہ پشت دست وہ سم وہ کنوتی وہ جوڑ بند

کوتاہ، وگرد و صاف، کنوتی، کمر کفل
ولہ کیا خوشنما کشادگی سینہ و بغل

وہ تھوتھنی، وہ اُبلی ہوئی انکھڑیان بحال
ولہ گویا کھلے تھے حور کے گیسو پری کے بال

وہ جلد، وہ دماغ، وہ سینہ، وہ سم، وہ چال
ولہ دم مین کبھی ہما کبھی ضیغم کبھی غزال

وہ قصر آسمان پہ بھی جلنے مین طاق تھا
دو پر خدا اگر اُسے دیتا براق تھا

وہ جست و خیز و سرعت و چالاکیِ سمند
سُم قرص ماہتاب سے روشن ہزار چند
سانچے میں تھے ڈھلے ہوئے سب اسکے جوڑ بند
نازک مزاج و شوخ و سیہ چشم و سربلند
پتلی جدھر سوار نے پھیری وہ مڑ گیا
اُترا براق بنکے پری ہو کے اڑ گیا

جرأت میں رشکِ شیر تو ہیکل میں پیل تن
بجلی کسی جگہ تو کہیں ابرِ قطرہ زن
پوئی کے وقت کبکِ دری جست میں ہرن
بن بن کے آنے جانے میں طاؤس کا چلن
سیماب تھا زمین پہ فلک پر سحاب تھا
دریا پہ موج تھا تو ہوا پر عقاب تھا

افزوں ہزار لعل جڑے سے خوشنما ایال کی
پریاں خرامِ ناز میں شاگرد چال کی
دیکھیں تو لیں بلائیں سدا بال بال کی
غصّہ میں جست شیر کی شوخی غزال کی
وہ حسن تن پہ ساز کا جوبن براق کا
دُلدُل کے ہاتھ پاؤں تو چہرہ براق کا

غصّہ میں انکھڑیوں کے اُبلنے کو دیکھیے
سانچے میں جوڑ بند کے ڈھلنے کو دیکھیے
جوبن میں جھوم جھوم کے چلنے کو دیکھیے
تھم کر کنوتیوں کے بدلنے کو دیکھیے
وہ کھوتنی کہ غنچۂ سوسن سے تنگ تر
وہ انکھڑیاں خجل ہوں ہرن جنکو دیکھکر

ع وہ شوخیاں فرس کی، وہ سُرعت، وہ آؤ جاؤ،

گھوڑے کے غیظ کی تصویر

مانندِ شیر غیظ میں آیا وہ پیل تن
ماری زمیں پہ ٹاپ کہ لرزا تمام بن
آنکھیں اُبل پڑیں صفتِ آہوئے ختن
غُل پڑ گیا کہ گھوڑے پہ بجلی لو چڑھا ہرن

لیکن زمین کی اُسکی تگاپو سے ہل گئیں
دونون کنوتیان بھی کھڑی ہو کے مل گئیں

گھوڑے کی تیزروی اور چل پھر

سمٹا جما اُڑا، اِدھر آیا اُدھر گیا
جمکا پھرا، اُچھال دکھایا ٹھہر گیا
تیرون سے اڑ کے برچھیون مین بے خطر گیا
برہم کیا صفون کو، پرے سے گذر گیا
گھوڑون کا تن بھی تاب سے اُسکے فگار تھا
ضربت تھی نعل کی کہ سروہی کا وار تھا

پھرتا تھا کیا صفون مین فرس جھوم جھوم کے
سُرعت بلا مین لیتی تھی مُنھ چوم چوم کے
پامال تھے پرے سپہِ شام و روم کے
غل تھا یہ غول مین پسرِ سعد شوم کے
رخش ایسا روم و رے مین نہین، شام مین نہین
یہ شوخیان تو ابلقِ ایام مین نہین

آہو کی جست، شیر کی آمد، پری کی چال
کبکِ دری خجل، دلِ طاؤس پائمال
سبزہ سُبک روی مین قدم کے تلے نہال
اِک دو قدم مین بھول گئے چوکڑی غزال
جو آگیا قدم کے تلے گرد برد تھا
چھل بل غضب کی تھی کہ چھلاوہ بھی گرد تھا

بجلی کبھی بنا، کبھی رہوار بن گیا
آیا عرق تو ابرِ گہربار بن گیا
گر قطب گاہ گنبدِ دوار بن گیا
نقطہ کبھی بنا کبھی پرکار بن گیا
حیران تھے اُسکے گشت سے گرگ اس ہجوم کے
تھوڑی سی جا مین پھرتا تھا کیا جھوم جھوم کے

تلوار
مرثیہ گویون کا سب سے بڑا موضوعِ شاعری یہی ہے۔ اور مرزا دبیر صاحب تو اس

عالم مین لامکان تک پہنچ جاتے ہین لیکن عجیب بات یہ ہے کہ سب کچھ کہتے ہین اور غور سے دیکھیے تو تلوار کے متعلق کچھ نہین کہتے، چنانچہ فرماتے ہین ؎

مرزا دبیر ؎

تدنگہ چشم نیام اوج پر آیا		اور صاف ہر اک فرد بشر کو نظر آیا
خط کھینچنے کو کاتب دولت ظفر آیا	ولہ	یا دوڑ کے ظلمت کے گلے سے خضر آیا
ظلمات مین یہ فتح پہ قبضہ کیے پھری	ولہ	یونس کو جیسے بطن مین ماہی لیے پھری
مثل ہوا سرون مین سمائی چلی گئی	ولہ	بو کی طرح دماغون مین آئی چلی گئی
ذات اک طرف مٹا دیا اس نے صفات کو	ولہ	کیسی زبان زبان مین یہ کاٹ آئی بات کو
کان شگاف بن کے درون جگر گئی	ولہ	مانند میم مرگ میان کمر گئی
لفظ شکم مین دینے کو زیر و زبر گئی	ولہ	مانند پیش ہر جنہ و کل سے گذر گئی
تلوارون پر وہ سیف جو شعلہ فشان ہوئی	ولہ	جل بجھ کے آب تیغون کی تن مین دھوان ہوئی
گیا جو فوق سے تحت الثری کو آب حسام	ولہ	بنا خزانہ قارون خرابہ حمام
فلک نے تختہ یونان رکھا زمین کا نام		ہوا رطوبت اطراف سے زمین کو زکام

دماغ خاک پہ نزلہ بصد فتور گرا
کیا جو عطسہ تو قارون نکل کے دور گرا

خود انصاف کرو، یہ تلوار کی تعریف ہے یا ہوائی طلسم ہے،

میر انیس صاحب بھی اگرچہ سامعین کی بدمذاقی کے اثر سے کہین کہین بے راہ نکل جاتے ہین، تاہم واقعہ اصلیت کا جوہر ہر جگہ نمایان رہتا ہے، سب سے پہلے، دیکھو تلوار کا سراپا کس طرح کھینچتے ہین ؎

پشہ وہ اس کا اور وہ باریکی خمر		کس بل مگر ہمیشہ اصالت مین مبطر

دلسوز شعلہ خو شرر انداز و جانگداز
لشکر کش و شکست رسان و ظفر نواز
خونخوار و کج ادا و دل آزار و سرفراز
حاضر جواب و تیز طبیعت زبان دراز
سچ اس کی ہے پسند جہان کو سبھی نہو
معشوق پھر نہیں کہ جو اتنی کجی نہو

ذوالفقار سے تشبیہ ۵

جوہر وہی، برش کا وہی طور، خم وہی
تیزی وہی، غضب کی وہی گھاٹ، دم وہی
چلنا اسی طرح کا، چمک دمبدم وہی
رنگت زمردی وہی، پانی مین سم وہی

تلوار کی کاٹ اور اسکی تعریف

چمکی، گری، اُٹھی، اِدھر آئی، اُدھر گئی
خالی کیے پرے، تو صفین خون مین بھر گئی
کاٹے کبھی قدم، کبھی بالاے سر گئی
ندی غضب کی تھی کہ چڑھی اور اتر گئی
غل تھا یہ کیا ہے، آج جو قہر صمد نہیں
ایسا تو رود نیل مین بھی جذر و مد نہیں

بجلی گری کہ فوج پہ تیغ دو سر گری
کٹ کر کسی کی تیغ کسی کی سپر گری
چمکی کبھی فلک پہ، کبھی فرق پر گری
سر کاٹ کر اِدھر سے جو اُٹھی اُدھر گری
زرہین تنون مین مثل کفن چاک ہو گئیں
اک آن مین صفین کی صفین خاک ہو گئیں

اک شور تھا کہ تیغ ہے یہ یا خدا کا قہر
بہتی ہے جسکی آگ سے دشمن لہو کی نہر
ناگن ہے یہ کہ کاٹے کی جسکی نہین ہے لہر
اُتری گلے سے چڑھ گیا سارے بدن مین زہر
زخمون سے جسم، ڈر سے کلیجے فگار ہیں
جوہر نہیں ہین تیغ مین دندان مار ہیں

یکتا برش میں جوہر ذاتی میں فرد میں
چمکی احد میں خیبر و خندق میں بدر میں
تیزی وہی تھی سان کی آشوب نبرد میں
بڑھ کر سپر سے سر میں گئی، سر سے صدر میں
کھنچتی ہوئی سپر سے نیا رنگ ڈھنگ تھا
راکب تھا نہ فرس تھا نہ زین تھا نہ تنگ تھا

غل تھا کہ وہ چمکتی ہوئی آئی، یہ گری
برچھی سے اڑ گئی وہ سناں، یہ گرہ گری
ترکش کٹا کمان کی تی سے زہ گری
یہ سر اڑا، وہ خود اڑا، یہ زرہ گری
آئی ہر لشکروں پہ تباہی اسی طرح
آتی ہے برق قہر الٰہی اسی طرح

سر لوٹتے تھے برچھیوں والوں کے ہر طرف
ٹکڑے پڑے تھے دشت میں بھالوں کے ہر طرف
پامال تھے سوار رسالوں کے ہر طرف
پر کالے اڑتے پھرتے تھے بھالوں کے ہر طرف
تھا ظرف شان نہ تھی کسی آفت نشان کی
اب رہتیں کٹی ہوئی شاخیں کمان کی

کیا کیا چمک دکھاتی تھی سر کاٹ کاٹ کے
بنتی تھی لب تنوں سے زمیں پاٹ پاٹ کے
پانی وہ خود پیے ہوئے تھی گھاٹ گھاٹ کے
دم اور بڑھ گیا تھا لہو چاٹ چاٹ کے
کیا جانیے ملا تھا مزہ کیا زبان کو
کھا جاتی تھی ہما کی طرح استخوان کو

ہر ہات میں اڑا کے کلائی نکل گئی
کوندی گری، زمیں میں سمائی نکل گئی
کاٹی زرہ دکھا کے صفائی نکل گئی
مچھلی تھی اک کہ دام میں آئی نکل گئی
جار آئینہ کے پار تھی اس آب و تاب سے
جس طرح برق گر کے نکل جائے آب سے

کٹ کٹ کے ذوالفقار سے گرتے تھے خاک پر — پہنچوں سے ہات، شانوں سے بازو، تنوں سے سر
قبضہ سے تیغ، بر سے زرہ، ہات سے سپر — برچھی سے پھل، کمان سے زہ، زرہ زین سے بجر

ترکش کہیں پڑے تھے نشان زری کہیں
پیکان کہیں تھے، شست کہیں تھی، تری کہیں

جب صف پہ وار کرتے تھے سلطان بحر و بر — اڑتی تھی کٹ کے صورت کاغذ ہر اک سپر
چھپتی تھیں بھاگی جاتی تھیں گرتے تھی خاک پر — قبضوں سے تیغیں جسم سے دمیں تنوں سے سر

پے تھے قدم گریز کے کوچے بھی بند تھے
شعلہ وہ تیغ تھی، سر اعدا سپند تھے

چھپتے تھے یوں وہ دیکھ کے اس تیغ کی چمک — بھاگے شعاع مہر سے جس طرح شپرک
اوج سما سے زلزلہ برپا تھا تا سمک — چمکی وہ جب تو کانپ گئے چرخ پر ملک

ہر شے تھی خوف جان سے خضوع و خشوع میں
سجدے میں تھی زمین تو فلک تھا رکوع میں

جوشن کو کاٹ جاتی تھی یوں آ کے اوج پر — پیراک جس طرح نکل آتا ہے موج سے
چمکی جو برق سی تو نکل آئی تنگ سے — رکتی تھی نہ سپر سے نہ آہن نہ سنگ سے

خالق نے منھ دیا تھا عجب آب و تاب کا
خود اُسکے سامنے تھا پھپھولا حباب کا

چم خم وہ تیغ کا وہ لگاوٹ وہ آب و تاب — آتش کسی جگہ کہیں بجلی کہیں سحاب
سیلی تھی اک پری کے شکم پر اسکی تاب — تیزی زبان میں وہ کہ فرشتوں کو دے جواب

جوہر سے اُس کا جسم جواہر نگار تھا
گویا گلے میں حور کے ہیرے کا ہار تھا

پیاسی بھی خون کی فوج کی اور آبدار بھی
غل تھا کہ ایک گھاٹ مین پانی بھی نار بھی
بجلی بھی ابر بھی خزان بھی بہار بھی
تلوار بھی چھری بھی سپر بھی کٹار بھی

پانی نے اُسکے آگ لگا دی زمانے مین
اک آفت جہان تھی لگانے بجھانے مین

نیزون کے بند بند قلم برچھیان دو نیم
شل قلم زبان دراز و سنان دو نیم
چار آئینہ کٹے ہوے گرز گران دو نیم
مغفر سے تا کمر جسد پہلوان دو نیم

عالم تھا بیش آئینہ تیغ جو نہ تھا
لشکر مین کون سا تھا وہ یکتا جو دو نہ تھا

وہ تیغ جب بڑھی صف کفار ہٹ گئی
چمکی جو برق ڈھالون کی بدلی سمٹ گئی
دم بھر مین یون صفون کو الٹ کر پلٹ گئی
رن کی زمین لہو کے ڈریڑون سے کٹ گئی

دریا بھی آب تیغ سے بے آبرو ہوا
غل تھا کہ لو فرات کا پانی لہو ہوا

اس موقع پر شاید تمھارے ذہن مین یہ خیال آئے کہ میر انیس کی رزمیہ مین اگو الفاظ کی شکوہ و شان کی کچھ انتہا نہین لیکن اصلیت اور واقعیت سے یہ اصل دُور ہے کربلا کا واقعہ نتائج کے لحاظ سے بے شبہہ ایک اہم واقعہ ہے لیکن معرکہ آرائی کے لحاظ سے اسکی صرف یہ حیثیت ہے کہ ایک طرف سو سوا سو آدمی تشنہ لب اور بے سر و سامان تھے دوسری طرف چار ہزار کا مجمع تھا جو دفعۃً ٹوٹ پڑا اور تین گھنٹے مین لڑائی کا فیصلہ ہو گیا، ایسے واقعہ کے متعلق یہ کہنا کہ زمین تھرا گئی، آسمان کانپنے لگے پہاڑ جگہ سے ہٹ گئے، دریا اُبل پڑے، فرشتے آسمانون مین چھپتے پھرتے تھے، وغیرہ وغیرہ، واقعیت سے کس قدر دور ہے؛

لیکن حقیقت یہ ہی کہ شاعری مین اصلیت اور واقعیت کا لحاظ تاریخی حیثیت سے
نہین کیا جاتا، بلکہ صرف دیکھا جاتا ہی کہ شاعر کو ان واقعات کا یقین ہی یا نہین
اگر وہ ان باتون پر یقین رکھتا ہی، اُن کے اثر سے لبریز ہی اور جسقدر اُسکے دل پر اثر ہی
اُسی جوش کے ساتھ اُن کا اظہار بھی کرتا ہی تو اُس کی شاعری بالکل اصلی ہے،
فرض کرو کہ شاہنامہ کے تمام واقعات غلط ثابت ہوجائین تو اس سے فردوسی
کی کمال شاعری مین فرق آئے گا!

شاعر کو قطعی یقین ہی کہ امام حسین علیہ السلام، تمام عالم کے کاروبار کے
مالک ہین، جن و انس، شجر حجر، سب اُن کے محکوم ہین، اُن کا غیظ مین آنا، کردگار عالم کا
غیظ مین آنا ہی، اس صورت مین اگر اُن کی حملہ آوری سے زمین و آسمان دہل جائین
اور دنیا متزلزل ہوجائے تو استعجاب کی کیا بات ہی، یہ ضرور ہی کہ اس حالت مین
بھی وہی واقعات بیان کرنے چاہئین جن سے طبیعت پر واقعی، اثر ہو، صرف
موہوم خیال بندی اور لفاظی نہ ہو، جیسا مرزا دبیر صاحب کا انداز ہی۔

یہ بات بھی بظاہر کھٹکتی ہی کہ رزم کے بیان مین عشقیہ الفاظ استعمال کرنا، بلاغت کے خلاف ہے،
اور میر انیس اکثر تلوار کی تعریف مین اس قسم کے الفاظ استعمال کرتے ہین مثلاً ؎

کس تکلف سے وہ لیلائے ظفر راہ چلی	گہ بڑھی، گاہ رُکی، گاہ تھمی، گاہ چلی،
کاٹھی سے اس طرح ہوئی وہ شعلہ رو جُدا	جیسے کنار شوق سے ہو خوبرو جُدا
سج اس کی ہر پسند جہان گو سجی نہو	معشوق پھر نہین کہ جو تانی بھی نہ ہو،

لیکن حقیقت یہ ہی کہ یہ اعتراض کی بات نہین، بلکہ میر انیس کے محاسن شاعری
مین داخل ہی، علامہ ثعلبی نے یتیمۃ الدہر مین جہان متنبی کے محاسن گنائے
ہین وہان لکھتے ہین ؎

منها استعمال الفاظ الغزل والنسيب في اوصاف الحرب وهو ايضاً مما لم يسبق اليه وتفرد به واظهر فيه الحذق	متنبی کے محاسن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ لڑائی کے بیان میں غزل کے الفاظ استعمال کرتا ہے اور یہ بھی اُس کی اُن خصوصیات میں ہے جن کی کہیں کوئی نظیر نہیں ملتی، جن میں وہ متفرد ہے،

اس کے بعد متنبی کے بہت سے اشعار نقل کیے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے، ؎

قد صبغت خدها الدماء كما يصبغ خد الخريدة الخجل	زمین کے چہرہ کو خون نے اس طرح رنگین کر دیا ہے جس طرح شرم کی حالت میں معشوق کے چہرہ پر سرخی آجاتی ہے،

لیکن یہ بہت نازک موقع ہے رزم میں عشقیہ الفاظ اور تشبیہات کا استعمال وہیں تک جائز ہے جہاں تک کلام کا اثر نہ جانے پائے، اور کلام میں ابتذال نہ آجائے، مرزا دبیر صاحب نے بھی میر انیس کی تقلید کرنی چاہی لیکن کلام کا یہ رنگ ہو گیا ؎

تلوار کی تعریف

جب خون میں بھری فوج کے انبوہ سے نکلی	غُل یہ تھا کہ وہ لال پری کوہ سے نکلی

سلام

اُردو شاعری کی اصلی بنیاد غزل کی زمین پر قائم ہوئی، اور اقسام سخن میں سے اسی کو سب سے زیادہ فروغ ہوا، عام مرثیہ گویوں نے اپنے مضمون کی نوعیت کے لحاظ سے مسدس کا طریقہ اختیار کیا، لیکن غزل کی لے اس قدر کانوں میں رچ گئی تھی کہ ان لوگوں کو بھی اس انداز میں کچھ نہ کچھ کہنا ہی پڑتا تھا، اس بنا پر اُنھوں نے غزل کی طرز پر سلام ایجاد کیا، سلام کی بحریں وہی غزل کی ہوتی ہیں، غزل کی طرح مضمون کے لحاظ سے ہر شعر الگ الگ ہوتا ہے، سلام کی خوبی یہ ہے کہ طرح شگفتہ اور نئی بندش

سادہ اور صاف، مضمون درد انگیز اور پُر تاثیر ہو، میر انیس کے سلاموں میں یہ تمام باتیں پائی جاتی ہیں، نمونہ ملاحظہ ہو

صبر کرتے تھے سلامی بادشہ والا کیا کیا
اہل کین دیتے تھے مظلوم کو ایذا کیا کیا

شاہ فرماتے تھے پانی نہیں ملتا لیکن
سامنے آنکھوں کے لہراتا ہے دریا کیا کیا

سر شبیر سے کہتے تھے یہ رو رو سجاد
رنج دیتے ہیں مجھے راہ میں اعدا کیا کیا

قد

طوق و زنجیر سنبھالوں کہ مہار اونٹوں کی
کام اتنے ہیں کروں میں تن تنہا کیا کیا

رو رو کہتی تھی یہ صغرا کہ گئے جا قاصد
تو نے کیا کیا کہا اور شاہ نے پوچھا کیا کیا

دیکھ کر فوج حسینی کو عدو کہتے تھے
ساتھ لائے ہیں جوان سید والا کیا کیا

خط لیے لاشۂ اکبر پہ یہ کہتے تھے امام
دیکھو بیٹا! تمھیں صغرا نے ہے لکھا کیا کیا

ایضاً

کچھ اور حرز بان نہیں اہل سخن کے پاس
مجرائی کیا زبان کے سوا ہے دہن کے پاس

غش تھی یہ سب کہ عون و محمد ہوئے شہید
روتے ہوئے حسین جو آئے بہن کے پاس

چلائی بانو دیکھ کے اصغر کو قبر میں
مجکو بھی گاڑ دے کوئی اس گلبدن کے پاس

صدمے سے کانپنے لگے عابد کے ہاتھ پاؤں
جس وقت بیڑیاں نظر آئیں رسن کے پاس

ایضاً

سلامی! آنکھ سے رہ رہ کے خون دل ٹپکتا ہے
غم سجاد میں کیس دل میں کانٹا سا کھٹکتا ہے

دم تحریر جگر زخمی ہے یا سطریں ہیں کاغذ پر
صریر کلک ہے یا باغ میں بلبل چہکتا ہے

بجز تجھے کربلا کی راہ سے کچھ سو بکر حضرت
دگر نہ رہبر عالم کہیں رستہ بھٹکتا ہے

حرم رو رو کے کہا جب آسمان کو دیکھا شہ نے
علی اکبر اذان دو صبح کا تارا چمکتا ہے

زمین کربلا پر فاطمہ کے پھول بکھرے ہیں
شہیدوں کی یہ خوشبو ہے کہ سب جنگل مہکتا ہے

تنِ رنجور پر ہات اپنا زینبؑ رکھ نہیں سکتی
کہا بانو نے شہ سے تیر چلتے ہیں کلیجہ پر
یہ ننھے ننھے دونوں ہاتھ بل کھاتے ہیں سینے پر
تپِ غم سے بدن سجادؑ کا ایسا دہکتا ہے
مرا منھ جب یہ بچہ نرگسی آنکھوں سے تکتا ہے
مسوڑھے ہو گئے ہیں نیلگوں تالو لپکتا ہے

ایضاً

مجرئی! جب کہ عیاں ماہِ عزا ہوتا ہے
چرخ پر ماتمِ شاہ و شہدا ہوتا ہے
پھیر دیں آنکھیں جو اصغرؑ نے پکاری بانو
دوڑو واے بی بیو! دیکھو تو یہ کیا ہوتا ہے
دیر بیٹوں کو لگی رن میں تو زینبؑ نے کہا
لاشیں آتی ہیں اگر فضلِ خدا ہوتا ہے
کہتی تھی خلقِ خدا دیکھ کے عابدؑ کو اسیر
کہیں بیمار بھی رسی سے بندھا ہوتا ہے

ایضاً

سدا ہو فکرِ ترقی بلند بینوں کو
ہم آسمان سے لائے ہیں ان زمینوں کو
یہ تجربا ن نہیں ہاتھوں پہ ضعفِ پیری نے
چُنا ہے جامۂ اصلی کی آستینوں کو
لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو
بھلا تردد بیجا سے اس میں کیا حاصل
اٹھا چکے ہیں زمیندار جن زمینوں کو
خیالِ خاطرِ احباب چاہیے ہر دم
انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

رباعیات

صوفیانہ اور اخلاقی مضامین کے اظہار کے لیے سب سے زیادہ موزوں چیز رباعی ہے اور یہی وجہ ہے کہ جن شعرا مثلاً خیام، سحابی، سلطان ابوسعید ابوالخیر نے ان مضامین کو اپنا موضوعِ شاعری قرار دیا تھا، اُنھوں نے رباعی کے سوا تمام عمر کچھ اور کچھ نہ لکھا، اُردو شاعری میں چونکہ یہ مضامین بہت کم ادا کیے گئے اس لیے رباعیاں بہت کم

پائی جاتی ہیں، سودا نے البتہ نہایت کثرت سے رباعیاں لکھیں اکثر عشقیہ یا خیال آفرینی کی غرض سے لکھی ہیں،

میر انیس کی رباعیوں کا ایک بڑا دفتر ہے اور ہر رباعی میں کوئی نہ کوئی اخلاقی مضمون ادا کیا گیا ہے بعض ایسی بھی ہیں جن میں صرف مضمون بندی یا کوئی صنعت ہے چنانچہ ہر قسم کے نمونے ذیل میں درج ہیں ؎

اب خواب سے چونک، وقت بیداری ہے مر مر کے ہوئے ہیں منافروان تک	رباعی	لے زاد سفر کوچ کی تیاری ہے یہ قبر کی منزل بھی بہت بھاری ہے
ہموار ہے، گر تو تجھکو کچھ باک نہیں پاتا نہیں تند خو کدورت کے سوا	ایضاً	سرکش ہے اگر تو عقل و ادراک نہیں دامن میں ہوا کے کچھ بجز خاک نہیں
راہی طرف عالم بالا ہوں میں یارب ترا نام پاک جپنے کے لیے	ایضاً	دنیا سے عدم کو جانے والا ہوں میں گویا اک ہڈیوں کا مالا ہوں میں
مر مر کے مسافر نے بسایا ہے تجھے کیونکر نہ لپٹ کے تجھ سے سوؤں اے قبر	ایضاً	رخ سب سے پھرا کے منہ دکھایا ہے تجھے میں نے بھی تو جان دیکے پایا ہے تجھے
کٹ جاتے ہیں خود رنگ بدلنے والے اللہ رے سخن کی تیری تاثیر انیس	ایضاً	کب تھمتے ہیں اشک جو ہیں ڈھلنے والے رو دیتے ہیں مثل شمع، جلنے والے
ہشیار کہ وقت ساز و برگ آیا ہے محتاج عصا ہوئے تنوں کا اعلان	ایضاً	ہنگام سخ و برن دگرگ آیا ہے چلیے اب جو بدار مرگ آیا ہے
نا فہم سے کب داد سخن خواہ ہوں میں چھپتی نہیں بوئے دوستاں کے رنگ	ایضاً	دشمن ہو کہ دوست سب کی سن لیتا ہوں کانٹوں کو ہٹا کے پھول چن لیتا ہوں
رتبہ جسے دنیا ہے خدا دیتا ہے کرتے ہیں تہی مغز ثنا آپ اپنی	ایضاً	وہ دل میں فروتنی کو جا دیتا ہے جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے

کیا قدر زمین کی آسمان کے آگے نرمی سے مطیع سنگدل ہوتے ہین	رباعی	جھکتے ہین قوی بھی ناتوان کے آگے دندان صفت بستہ ہین زبان کے آگے
جس شخص کو عقبیٰ کی طلبگاری ہے اک آنکھ مین کس طرح سمائین دونون	دیگر	دُنیا سے ہمیشہ اُسے بیزاری ہے غافل! یہ خواب ہر وہ بیداری ہے
کس لن فرس خامہ تگ و دو مین نہیں ہرچند کہ ہون خسرو اقلیم سخن	دیگر	مجھ سا بھی سیہ بخت کوئی سو مین نہیں بے رخیر دوات کچھ قلمرو مین نہیں
جس جا ذکر حسین ہو جاتا ہے آکر بزم عزائے شہ مین رونا	دیگر	رونے سے دلون کو چین ہو جاتا ہے ہر شخص پہ فرض عین ہو جاتا ہے
جو روضہ مین باریاب ہو جاتا ہے جلتا ہے جو شب کو قبر حیدر پہ چراغ	دیگر	ہر کام مین کامیاب ہو جاتا ہے وہ صبح کو آفتاب ہو جاتا ہے

اعتراضات

میر انیس کے کمال کا اگرچہ جس قدر بھی اعتراف ہو شاید ہی کسی کو انکار ہو گا تاہم میرا یہ دعویٰ نہیں کہ اُن کا کلام فروگذاشتون اور غلطیون سے پاک ہے

ہمارے زمانہ مین جو سوانح عمریان لکھی گئی ہین اُن مین باوجود دعویٰ ہمدردی کے تنقید اور جرح سے بالکل کام نہیں لیا گیا، اور [illegible] کہا جاتا ہے کہ ابھی قوم کی یہ حالت نہیں کہ تصویر کے دونون رخ [illegible] بلکہ عذر کرنے والے خود اپنی نسبت غلطی کر رہے ہین، جس چیز نے [illegible] سے روکا ہے وہ ایشیائی شخص پرستی ہے جسکا اثر رگ و پے مین سرایت کر گیا [illegible] عذر کرنے والون کو خود اس کا احساس نہیں ہوتا اس غلامانہ شخص پرستی سے ایک بڑا ضرر یہ ہے کہ جو لوگ ان اکابر کی تقلید کرتے ہین ان مین ہزارون ایسے ہوتے ہین جن کو خود نیک و بد کی تمیز نہیں ہوتی اس لیے

وہ اچھی باتون کے ساتھ، اکابر کی غلطیون کی بھی تقلید کرنے لگتے ہین اور سلسلہ درسلسلہ تمام قوم مین اس کا اثر پھیل جاتا ہے۔

بہر حال ہماری راے ہے کہ جس وسعت اور تفصیل کے ساتھ میر انیس کی خوبیان ظاہر کی گئی ہین اسی طرح نہایت آزادی اور بیباکی کے ساتھ انکی ہر قسم کی فروگذاشتین اور غلطیان بھی ظاہر کی جائین۔

ایک زمانہ ہوا عبدالغفور خان نساخ نے میر انیس کی بہت سی غلطیان ایک رسالہ مین ظاہر کی تھین چنانچہ شروع کتاب مین اس کا ذکر گذر چکا ہے۔ پہلے ہم ان اعتراضات کو اجمالاً مع جواب کے نقل کرتے ہین۔

۱۔ میر صاحب نے جابجا۔ سینہ۔ مدینہ۔ کینہ۔ قرینہ۔ کو دانا اور بینا کا قافیہ باندھا ہے۔ مثلاً ؎

حق نما ہو تو جہان مین ہے یہی آئینہ		اس کا عاشق ہو تو ہون کور کی آنکھین بینا

اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ قدما کا طریقہ تھا اور میر انیس کا ابتدائی کلام قدما کے استعمال کے موافق ہے۔ اس جواب پر اسقدر اور اضافہ کرنا چاہیے کہ گو متاخرین نے اس کو ترک کر دیا لیکن کلام کی وسعت کے لیے یہ سختیان اُٹھا دینی چاہئین شاعری سے وصل اور ہجر کے سوا اور بھی کام لیتے ہین اور وہ بغیر اسکے نہین ہو سکتا کہ قافیہ مین وسعت پیدا کی جائے، ورنہ شاید یورپ کی طرح سرے سے قافیہ سے دست بردار ہونا پڑیگا

۲۔ جن الفاظ مین نون کا اعلان ضرور ہے میر صاحب اکثر جگہ اعلان نہین کرتے مثلاً ؎

عباس سے یہ کہنے لگے شاہِ دوجہان		تم جا کے اُس عرب کو بلا لاؤ بھائی جان

اس اعتراض کا بھی یہی جواب ہے۔

۳۔ جہان نون کا اعلان جائز نہین وہان اعلان کرتے ہین مثلاً ؎

لپٹون گلے سے مین پہ رنا توان سکے		سینے سے تو سرک تو مرے بابا جان گے

اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ شعر میر صاحب کا ہے ہی نہیں الحاقی ہے لیکن میر صاحب کے ہاں کثرت سے اس کی مثالیں پائی جاتی ہیں اس لیے یا تو میر صاحب کی غلطی تسلیم کرنی چاہیے یا یہ کہنا چاہیے کہ یہ بھی میر صاحب کی توسیعات شعری میں داخل ہے

گویا کہ تھا شبیہ علم سر بسر نشان	(۴)	ڈوبا تھا خون سے پنجہ پر نور اور نشان

اس شعر میں سر بسر قافیہ اور رہا اور یہ بالکل غلط ہے، اس کا جواب یہ دیا ہے کہ مصرع ثانی اصل میں یوں ہے " ڈوبا تھا خون میں پنجہ پر نور ذرہ نشان"۔

۵۔ اکثر جگہ شایگان قافیے ہیں چنانچہ نساخ نے بہت سے اس قسم کے شعر نقل کیے ہیں مجیب نے ان تمام شعروں سے انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ وہ یوں نہیں بلکہ یوں ہیں مثلاً اس بند میں

ناگاہ بڑھی فوج، ہوا جنگ کا سامان شہزادے پہ جب پڑنے لگے تیر کا باران		اور گھٹنے لگی طاقت جسم شہ مرداں تلوار علم کر کے کہا یا شہ مرداں

شہ مرداں مکرر آیا ہے، مجیب صاحب کہتے ہیں کہ دوسرے مصرع میں شہ مرداں کے بجائے شہ ذیشان تھا۔ غلط نویسوں نے ذی شان کا شہ مرداں بنا دیا ہے، لیکن اس قسم کی تاویلات پر اعتبار کرنا مشکل ہے، اور اگر اسکو وسعت دی جائے تو جہاں جس لفظ پر اعتراض ہو نہایت آسانی سے دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ یوں نہیں یوں تھا، اس شعر میں تو سرے سے اعتراض ہی غلط ہے کیونکہ شہ مرداں ایک جگہ امام حسینؑ اور دوسری جگہ حضرت علیؑ مراد ہیں، اس لیے قافیہ مکرر نہیں، لیکن جہاں واقعی قافیہ شایگان ہے وہاں بھی تاویل کی ضرورت نہیں، جو اساتذہ کثیر الکلام ہیں، اور جنکو سیکڑوں قسم کے مضامین ادا کرنے پڑتے ہیں وہ اس قسم کی قیدوں کی پابندی نہیں کرتے۔

۶۔ اکثر جگہ حروف تقطیع میں گر جاتے ہیں۔ مثلاً

ع رانڈ ہوتی ہے اک رات کی بیاہی ہوئی دختر،

ع یہ کہہ کے بس عورتاں نے عریاں کیے سر،

باہن جو گلے مین تھین تو بند دیدہ خونبار،

ان اعتراضات کا جواب یہ دیا ہر کہ یہ سب کاتبون کی غلطی ہر، پہلا مصرع یون ہر
بیوہ ہوئی اک رات کی بیاہی ہوئی دختر، اسی طرح اور مصرعون کو بدلا ہر۔
حرفون کا تقطیع مین گرانا، اگرچہ واقعی ناگوار معلوم ہوتا ہر لیکن اساتذہ کے ہان
کثرت سے اس کی مثالین پائی جاتی ہین سے

عرفی شیرازی	مرا بند خردمندان بجال خود نمی آرد	بری رحم افسانہا مجنون عشق عاقل میگردد
عاقل	ناتوانی تختہ بند یک ـــــ ـــــ ت سے بھی بہشتش	
علیم	اے رگ جان بہار این ہمہ بیرحمی چو	تو خون شدن عادت دارد
غنی	تن گل عارض گل بدن گر ہم ربط نہین ہوتا، اور صاف لعل	
	بو ساقی آن آب یا تو ـــــ زبردستی قافیہ اور ردیف کے حفظ فرصت را	

ان کے سوا اور بہت سی مثالین ہین جنکو تطویل کے لحاظ سے قلم انداز کیا گیا۔
۷- ناگاہ بجا فوج عدو مین طبل جنگ۔
۸- مغفرت خلیق کی یا رب ذوالکرام۔
طبل متحرک الاوسط صحیح نہین، اور ذوالکرام مہمل لفظ ہر۔ مجیب صاحب کہتے ہین کہ اصل
مین طبل کے بجاے دُہل، اور ذوالکرام کے بجاے یا خالق الانام ہر۔
۸- تھا زیر زرہ گاو سر اس طرح کا بکتر،
اعتراض بکتر گاو سر نہین ہوتا۔ ـ بزالنہ
جواب۔ اصل مین یون تھا ع پہنے ہوے زیر زرہ اس طرح کا بکتر،
۹- اترا یہ سخن کہہ کے وہ کونین کا عالی، کونین کا عالی غلط ہر۔
جواب۔ اصل مین عالی کے بجاے والی ہر۔
۱۰- رنگ رخ کفار عرب ہوگیا فق سے، رنگ فق سے ہوگیا محاورہ نہین،

اس کا جواب یہ دیا ہی کہ میر انیس جو کچھ کہہ دین وہی محاورہ ہی
اشرمندہ زمانہ سے گئے وایل وسحبان، وائل کوئی فصیح نہین گذرا۔
جواب۔ اصل یہ ہی۔ وئیل وسحبان۔
ان اعتراضات کے علاوہ، نساخ نے اور بھی بہت سے اعتراض کیے ہین لیکن چونکہ وہ صحیح نہین تھے نظر انداز کیے گئے۔ نساخ نے بہت سے صحیح اعتراضات چھوڑ بھی دیے، انکی تفصیل ذیل مین ہی،

بُت توڑ کے کعبہ کو صفا کیے ہین چنانچہ برخواست کی جا سے انکار کیا ہی اور کہا ہی کہ	صاف کردیا چاہیے برداشتگی غلط ہی
بے حرص تیغ، ہوا جنگ کا سامان ایسا بھی ہوئی نہ تیغ تیر کا باران	اور آن بروزن فعلان ہی، تلوار اس کا عطف بیکس پر جائز نہین۔
گرتے تھے طیوران ہوا کھولے ہوے پر جو خوبیان کہ چاہیئین وہ سب حصول ہین کمتی نہین پانی کی سلامت ہین عباس	طیور جو جمع ہی اسکی جمع الجمع صحیح ہی مستعمل حصول کے بجاے حاصل چاہیے۔ کمتی انفار اور اراذل کی زبان ہی،
واللہ اس سے زور عیان لاتعد ہوا	قتل اسکے ہاتھ سے عمر عبدود ہوا

عبدود لاتعد کا قافیہ نہین ہوسکتا،

کرار ہی وہ شخص نہ غیر فرار ہے	فرار بہ تشدید را چاہیے
عالم کی رہا یہ بحالی کی ہے آمد	تغیری صحیح نہین۔
مت روکنا ہی خاطر مہمان واجبات	واجبات سے، یا واجب چاہیے۔
اس مژدہ کو سنتے ہی خوشی ہوگئی شیرین	خوش چاہیے

اس قسم کی اور بہت سی غلطیان ہین، اور غلط نویسی کا عذر ہر جگہ کام نہین آسکتا حقیقت یہ ہی کہ میر انیس کے کلام مین اس قسم کی غلطیان ضرور موجود ہین لیکن

عجیب بات ہی کہ جسقدر قادر الکلام اور پُرگو شعرا گذرے ہین سب کی یہی حالت ہی فردوسی سے بڑھکر کون قادر الکلام ہوگا، متاخرین مین قاآنی کا جواب نہین ان دونون کے کلام مین اس قسم کی بے اعتدالیان نہایت کثرت سے موجود ہین، لوگ ان شعرا کو نمونہ بناتے ہین جن کی شاعری کا دائرہ چند عشقیہ خیالات تک محدود ہی لیکن جو شخص سیکڑون قسم کے مختلف واقعات کو شعر مین ادا کرنا چاہتا ہی وہ ان مسامحات سے کیونکر بچ سکتا ہی اس لیے قادر الکلام شعرا کو اس جُرم سے بری رکھنا چاہیے۔

لفظی غلطیون کے سوا معنوی حیثیت سے بھی بہت سی باتین قابل اعتراض ہین جن کی تفصیل حسب ذیل ہی:

۱۔ اکثر جگہ مصرعون مین باہم ربط نہین ہوتا، اور صاف نظر آتا ہی کہ دوسرا مصرع برجستہ نکل آیا تھا، اس کے لیے زبردستی قافیہ اور ردیف کی رعایت سے اوپر کا مصرعہ پیوند کیا ہی مثلاً ؎

سرزمین بوسے ہین سختی سے دنی کہین — بوڑی کہین تھی ڈانڈ کہین تھی انی کہین

سمجھو نہ دور آنکھ ملانے کی دیر ہے — پتلی ہے چشم مین کہ ترائی مین شیر ہے

ہمشکل تھی شرف مین اصالت مین نیک تھی — لجا مین دو زبانین جو اس کی تو ایک تھی

خواہان تھے زیب گلشن زہرا جو آب کے — شبنم نے بھر دیے تھے کٹورے گلاب کے

ہاسلے تھے دولے ہوے گھوڑون کی گت سے — خاک آسمان پہ جاتی تھی اڑ اڑ کے دشت سے

بدہات مین شکست خط نیک ہات مین — ہات اٹھ کے جو پڑا کبھی ہات ایک ہات مین

۲ آنکھ کی تعریف

تلوار کی تعریف

اس قسم کے اور سیکڑون اشعار ہین۔

۲۔ اکثر جگہ لفظی رعایت کی پابندی کی وجہ سے کلام اوچھا اور بے اثر ہو جاتا ہی مثلاً حضرت امام حسین علیہ السلام کا مہدیہ نقرہ سن کر تمام لشکر مین جب سناٹا چھا گیا ہی تو اس موقع پر لکھتے ہین ؎

یہ صدا سنتے ہی خود رک گیا قرنا کا خروش ‌ ‌ ‌ تھم گیا طبل وغا کی بھی وہ آواز کا جوش
ہو گیا جوڑ کے ہاتھوں کو جلاجل خاموش ‌ ‌ ‌ کیا بجاتے کہ بجاتے نہ کسی شخص کے ہوش

چھیڑنا اُن کو سرودوں کا بھی ناساز ہوا
رعب فرزند نبی سے یہ آواز ہوا

پہلے تین مصرعوں میں رعب اور ہیبت کا جو اثر پیدا ہوا، "بجانا" "سرود ناساز" کی ضلع جگت نے اس کو بالکل زائل کر دیا،

یا مثلاً اس دعا میں —

اس باغ میں چشمے ہیں ترے فیض کے جاری ‌ ‌ ‌ بلبل کی زبان پر ہے تری شکر گذاری
ہر نخل برومند ہو یا حضرتِ باری ‌ ‌ ‌ پھل ہمکو بھی ملجائے ریاضت کا ہماری

نخل برومند، باری، پھل، ریاضت، کا التزام یہ اثر پیدا کرتا ہے کہ دعا مانگنے والے کا دل خضوع و خشوع سے زیادہ، لفظی رعایتوں میں لگا ہوا ہے،

یا مثلاً ان اشعار میں نہایت مبتذل طریقہ سے لفظی رعایت کو صرف کیا ہے،

ع بولے نہنگ، خوب نہیں یہ اگر مگر،
ع سایہ کنوئیں میں اترا تھا پانی کی چاہ سے،
ع اب ہات دستیاب نہ تھے مُنھ چھپانے کو،
ع آری جو ہو گئی تھیں، وہ سب ذوالفقار سے،

کونسا باغ تجھے شاہ نے دکھلایا ہے ‌ ‌ ‌ کہیں کوثر کے تو چھینٹوں میں نہیں آیا ہے
شجر قامتِ سرور پہ جو ڈالے گا نظر ‌ ‌ ‌ سر چڑھے گا ترا برچھی پہ یہ ہے اس کا اثر

الفت زلف سے برچھی پہ بھی تیغ میں تیر جائے گا
خال رخ دیکھا تو تو خالقے تک جائے گا

مدِ پیشانی سرور کا جو ہے سر میں خیال ‌ ‌ ‌ تو اسی ماہ میں نقصان ترا ہوئیگا کمال

تیر و شمشیر ہے ابرو کی محبت کا وبال		سب میں ہو جائے گا انگشت نما شکل ہلال

عشق رخسار میں رتبہ ترا گھٹ جائیگا
منھ پہ کہتا ہوں کہ چہرہ ترا گٹ جائیگا

تو سر دست سرافرازی کونین کو پائے		پانوں یہ وہ ہیں کہ ان پانوں کو جو ہاتھ لگائے

اس قسم کی تکلف کی ہزاروں مثالیں ہیں

ان تکلفات کی وجہ سے اکثر جگہ بلاغت کا سر رشتہ بالکل ہاتھ سے جاتا رہتا ہی
مثلاً صغرا کو جب حضرت امام حسین علیہ السلام سفر میں ساتھ نہیں لے جانا چاہتے
اور اُن کی بیماری کا عذر کرتے ہیں تو وہ کہتی ہیں کہ کیا گھر پر تنہا رہنے اور رونے پیٹنے
سے میں اچھی ہو جاؤں گی اس موقع پر لکھتے ہیں۔

ع غم کھانے سے آجائے گی قوت مرے تن میں ؟

ان تمام اعتراضات کا صرف یہ جواب ہی کہ لفظی رعایت کی پابندی کے سوا جو لکھنؤ
کی خمیر بنگیا تھا، باقی عیوب، لازمۂ انسانی ہیں، اور کسی بشر کا کلام اُن سے پاک نہیں ہو سکتا۔

سرقات

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ میر انیس (اور مرزا دبیر) کے بہت سے اشعار پر سرقہ
کا گمان ہو سکتا ہی کیونکہ وہی مضامین بعینہٖ یا بہ خفیف تغیر قدیم اساتذہ کے ہاں پائے
جاتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہی کہ ان سب پر سرقہ کا اطلاق نہیں ہو سکتا اساتذہ کا قاعدہ ہی
جب وہ دیکھتے ہیں کہ ایک مضمون کسی متقدم شاعر نے باندھا لیکن اچھی طرح نہ بندھ سکا
یا اسپر ترقی ممکن ہی تو وہ دانستہ اسی مضمون کو لیکر اس طرح ادا کرتے ہیں کہ جو کسر تھی
نکل جاتی ہی، اور شعر بلند رتبہ ہو جاتا ہی، فردوسی نے خیمہ کی تعریف لکھی تھی ؎

ز مشرق بہ مغرب کشیدہ طناب		یکے خیمۂ داشت افراسیاب

نظامی نے دیکھا کہ مبالغہ اچھا ہی لیکن کوئی ثبوت نہین اُنھون نے ایک تشبیہ پیدا کر کے ثبوت دیدیا ؎

سپہ کے خیمہ داشت چون آفتاب	ز مشرق بمغرب کشیدہ طناب

آفتاب کی تشبیہ نے مشرق سے مغرب تک طنابون کو کھینچا ہونا ثابت کردیا کیونکہ آفتاب خیمہ ہے اور اُس کی کرنین طناب سے مشابہ ہین،

سعدی کا شعر تھا ؎

ترا ہر آئینہ بایدبہ شہر دیگر رفت	کہ دل نماند درین شہر تا ربائی باز

شہر کے شہر کا دل چھین لینا معشوق کا کمال ہی لیکن معشوق کو یہ صلاح دینی کہ کسی اور شہر کو چلا جائے لغو بات ہی اس لیے امیر خسرو نے اس کا چارہ کار یہ بتلایا ؎

کسی نماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی	مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی

سلمان ساوجی کا شعر تھا ؎

شاہد آن نیست کہ دارد خط سبز و لب لعل	شاہد آن است کہ این دارد و آنے دارد

خواجہ حافظ نے اُس کو مطلع کر کے بند کردیا ؎

شاہد آن نیست کہ موے و میانے دارد	بندۂ طلعت آن باش کہ آنے دارد

سلمان کے شعر مین این و آن کا جو لطف تھا، وہ اچھی طرح ادا نہو سکا تھا کیونکہ آن مین نون بہ اعلان ہی اس لیے آن (جو این کا مقابل ہی) کا ایہام نہین ہوتا خواجہ حافظ نے اِس نقص کو یون پورا کیا ؎

این کہ می گویند آن بہتر ز حسن	یار ما این دارد و آن نیز ہم

صاف نظر آتا ہی کہ ان لوگون نے دیکھا کہ ایک عمدہ بات پیدا ہوئی تھی لیکن ناقص رہ گئی ایک چیز کو ناقص چھوڑ دینا اچھا نہ تھا، اس کو پورا کر دیا، اگر اس کا نام سرقہ ہی اور یہ عیب ہی تو دنیا مین ہر قسم کی صنعتین جو ایجاد ہوئین وہ اسی پہلی حالت پر قائم رہنی چاہیے تھین

جھگڑے کے بجائے فتن اور بروم تیار کرنا بھی سرقہ قرار پاتا۔

میر صاحب کے ہان جو سرقے پائے جاتے ہین اکثر اسی قسم کے ہین۔ مثلاً حضرت امام حسین علیہ السلام نے جب یزید کی فوج کے سامنے اتمام حجت کے طور پر جناب رسالت پناہ سے اپنا تعلق ثابت کیا ہے تو یہ بھی بیان کیا ہے کہ اس وقت میرے بدن پر جو اسلحہ اور ملبوسات ہین وہ آنحضرتؐ کے ملبوسات ہین۔ اس مضمون کو میر ضمیر نے اس طرح ادا کیا تھا ؎

پہچانتے ہو کسکی مرے سر پہ ہے دستار
یہ کسکی زرہ، کسکی سپر، کسکی ہے تلوار
دیکھو تو عبا کسکی ہے کاندھے پہ نمودار
مین جسپہ سوار آیا ہون کسکا ہے یہ رہوار
باندھا ہے کمر مین جسے یہ کسکی ردا ہے
کیا فاطمہ زہرا نے نہین اسکو سیا ہے

یہ واقعہ مرثیہ کا ایک ضروری جزو تھا، اس لیے میر انیس صاحب اسکو بالکل چھوڑ نہین سکتے تھے لیکن دیکھو، اسی بات کو کیونکر ادا کیا ؎

یہ قبا کسکی ہے بتلاؤ یہ کسکی دستار
بر مین کس کا ہے یہ چار آئینۂ جوہر دار
یہ زرہ کسکی ہے پہنے ہون جو مین سینہ فگار
کس کا رہوار ہے یہ آج مین جسپر ہون سوار
کس کا یہ خود ہے یہ تیغ دو سر کسکی ہے
کس جری کی یہ کمان ہے یہ سپر کسکی ہے

میر ضمیر	جبتک گری نہ ذوالفقار نے کاٹی زمین پر	ہرگز نہ دم لیا پر روح الامین پر
میر انیس	خیبر مین کیا گزند گئی روح الامین پر	کاٹے ہین کسکی تیغ دو پیکر نے مین پر
میر ضمیر	اس نیزۂ سیاہ سے تھا سب کو بیم جان	تھا اژدہای عصای عمران کی وہ زبان
میر انیس	گویا زبان نکالے ہوے اژدھا چلا	
میر ضمیر	اک نیزہ ہوا پار وہ سو سو کے جگر سے	رشتہ کا گذر ہوتا ہے جون سلک گہر سے

میر انیس	ہوتا تھا پار آسکے وہ ہنگام دارو گیر	سو دل سے مثل رشتۂ تسبیح ایک تیر
میر ضمیر	کو زمین میں بیٹھا ہوئی الامان کی	انساں تو کیا جنوں کو پڑی اپنی جان کی
میر انیس	ع چلاتی تھیں پریاں کہ خدا جان بچائے	

لیکن بہت سے اشعار ایسے بھی ہیں جن میں کسی قسم کی ترقی نہیں ہر بلکہ کسی فارسی شعر کو بعینہ لے لیا ہی، اس قسم کے مضامین کو حسن ظن ہو تو توارد، ورنہ سرقہ کہنا چاہیے۔ چند مثالیں نمونہ کے طور پر ذیل میں لکھی جاتی ہیں سے

میر انیس	پیچھے کبھی قافلہ سے رہنا نہ انیس	اے عمر دراز تیری کوتاہی ہر
لاحد		کوتاہیے کہ بود ز عمر دراز بود
میر انیس	عقدے سب حل ہوئے گر آہ انیس	یہ بند اجل کسی سے کھولا نہ گیا
بو علی سینا	کردم ہمہ مشکلات عالم را حل	ہر بند کشودہ شد مگر بند اجل
میر انیس	نافہ کی طرح عمر خطا میں گذری	بالوں پہ سفیدی ہے سیاہی دل میں
کاتبی	بودیم چو نافہ ہمہ عمر در خطا	موئے سفید ہیں اور درون سیاہ ما
میر انیس	ہر سمت تھی سناں پہ سناں مثل خارزار	ہر صف میں تھی سپر پہ سپر مثل لالہ زار
نظامی	سناں بر سناں بستہ چون نوک خار	سپر بر سپر بستہ چون لالہ زار
میر انیس	خود پیام زندگی لائی قضا میرے لیے	شمع کشتہ ہوں فنا میں ہے بقا میرے لیے
لاحد	چو نفی نفی اثبات است از مرگ می ترسم	بقائے ست چو شمع کشتہ باشند در فنا من

میر انیس اور مرزا دبیر کا موازنہ

اُردو علم ادب کی جو تاریخ لکھی جائیگی اس کا سب سے عجیب تر واقعہ یہ ہوگا کہ مرزا دبیر کو ملک نے میر انیس کا مقابل بنایا، اور اس کا فیصلہ نہ ہو سکا کہ ان دونوں حریفوں میں ترجیح کا تاج کس کے سر پر رکھا جائے،

شاعری کس چیز کا نام ہی؟ کسی چیز کا، کسی واقعہ کا، کسی حالت کا، کسی کیفیت کا اس طرح بیان کیا جائے کہ اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جائے؛
دریا کی روانی، جنگل کی ویرانی، باغ کی شادابی، سبزہ کی لہک، پھولون کی مہک، خوشبو کی لپٹ، نسیم کے جھونکے، دھوپ کی سختی، گرمی کی تپش، جاڑون کی ٹھنڈ، صبح کی شگفتگی، شام کی دلآویزی، یا رنج و غم، غیظ و غضب، جوش و محبت، افسوس و حسرت، عیش و طرب، استعجاب و حیرت، ان چیزون کا اس طرح بیان کرنا کہ وہی کیفیت دلون پر چھا جائے، اسی کا نام شاعری ہی:
اسکے ساتھ الفاظ مین فصاحت، سلاست، روانی، بندش مین چستی اور چستی کے ساتھ بے تکلفی، دلآویزی اور برجستگی، لطیف اور نازک تشبیہات اور استعارات، اصول بلاغت کے مراعات، ان تمام اوصاف مین سے کون سی چیز مرزا دبیر مین پائی جاتی ہی فصاحت، ان کے کلام کو چھو بھی نہین گئی، بندش مین تعقید اور اغلاق، تشبیہات و استعارات، اکثر دور از کار، بلاغت نام کو نہین، کسی چیز یا کسی کیفیت یا حالت کی تصویر کھینچنے سے وہ بالکل عاجز ہین، خیال آفرینی اور مضمون بندی البتہ ہو لیکن اکثر جگہ اس کو سنبھال نہین سکتے۔
ہماری یہ غرض نہین ہی کہ ان کے کلام مین سرے سے یہ باتین پائی ہی نہین جاتیں، وہ نہایت پرگو تھے، ان کے اشعار کا شمار ہزارون کیا لاکھون تک ہی، اخیر اخیر مین وہ میر انیس کی تقلید بھی کرنے لگے تھے، اس بنا پر ان کے کلام مین جابجا شاعری کے لوازم اور محاسن پائے جاتے ہین، لیکن گفتگو قلت اور کثرت مین ہی، میر انیس کے بہت سے اشعار مین فصاحت و بلاغت کا حصہ بہت کم ہی، لیکن دیکھنا یہ ہی کہ دونون مین سے نسبتہً کس کا کلام شاعری کے معیار پر پورا اترتا ہی۔ میر انیس کا عیب و ہنر تم دیکھ چکے، اب مرزا صاحب کے متعلق ہم ایک ایک چیز کی تفصیل لکھتے ہین

فصاحت - یہ امر بدیہی ہو کہ مرزا دبیر کے کلام مین وہ فصاحت اور شستگی نہین جو میر انیس کے کلام مین ہو، اور اُس کے مختلف اسباب ہین۔

(۱) مرزا صاحب اکثر ثقیل اور غریب الفاظ استعمال کرتے ہین۔ مثلاً

ع مستدعی شق القمر آکر ہوے گمراہ

ع ہر کوہ کی آواز انا الطور انا الطور

النشر کا ہنگامہ ہو اسوقت حشر مین
لبیک وسعدیک تھا ورد ملک وحور

المنتہیٰ یہ ربط یہ ضبط اس دعا مین تھے۔

خاص الخلاصۂ بنی آدم کمال مین
بار دہ سُنا مدائح نوشاہ کا بیان

رُخ بنتۂ صدق کرامات ہیبر
مستجمع جمیع فضائل ملک سیر۔

مستغرق روح اُس نے کیا تب غسل دشیر
لیکر رباب دلو دوم کہنے لگے شاہ۔

میدانی ونقیب وعصا دار و چوبدار،
عرشی فلکی جلوہ کے نقیبانہ پکارے۔

اس قسم کے سیکڑون الفاظ ہین، ہم نے صرف دو تین مرثیون سے سرسری انتخاب کیا ہو، ورنہ سیکڑون ہزارون تک نوبت پہنچتی، یہ الفاظ، اگرچہ صحیح ہین عربی اور فارسی مین مستعمل ہین، لیکن اُردو نظم کی سلاست وروانی ان کی متحمل نہین ہوسکتی،

(۲) بعض الفاظ بجاے خود ایسے ثقیل اور گران نہین لیکن مرزا صاحب جن ترکیبون کے ساتھ اُن کو استعمال کرتے ہین، اُن سے نہایت ثقل اور بھدا پن پیدا ہوجاتا ہو

یہ امر ان مثالون مین صاف واضح ہوجاتا ہی جہان ایک ہی لفظ یا الفاظ کو میر و مرزا دونون نے استعمال کیا ہی۔ ھل اتی انما قل کفی ۔ چارون لفظ حضرت علی ؑ کے فضائل کی تلمیحات (الیوژن) ہین ان تلمیحات کو ایک ایک بند مین دونون نے باندھا ہی مرزا صاحب فرماتے ہین ؎

اہل عطا مین تاج سر ھل اتی ہین یہ
خورشید انور فلک انما ہین یہ

اغیار لات زن ہین شہ لافتی ہین یہ
کافی ہی یہ شرف کہ شہ قل کفی ہین یہ

ممتاز گو خلیل رسولان دین مین ہین
کاشف ہی لو کشف یہ زیادہ یقین مین ہین

میر انیس کہتے ہین ؎

حق نے کیا عطا یہ عطا ھل اتی کے
کونین مین ملا شرف انما کے

حاصل ہوا ہی مرتبہ لافتی کسے
کہتی ہی خلق بادشہ قل کفی کسے

دنیا مین کون منتظم کائنات ہے
کس کو کہا خدا نے کہ یہ میری ذات ہے

مرزا صاحب کے کلام مین اس قسم کی ناموزونی نہایت کثرت سے ہی ہم صرف چند مثالون پر اکتفا کرتے ہین ؎

ع اک شخص کرشہ کی لگا باندھنے خورسند

ع اک دلو بھرو، پانی سے اور ایک رطب لو،

ع نوبت زن نہ بام عروج فلک پیر

ع ملبوس فلمکار نہ دون ہی نہ پرانا ؎

سر کو عوض پارۂ مدحت مین دھرون گا
شرع کہن ناطقہ منسوخ کرون گا

ع یہ صورت پیمبر وسیرت ملک ہی ؎

ہے ظلمت جلد و نفس سینہ پہ محسوس | وہ برق شفق مین تو یہ پروانہ یہ فانوس
ناگاہ کھلا دشت میں بازار زد و کشت | تیغین کھچین یکدست تلے گرز بھی گشت

ع نہ چشم جراحت نہ رہ قوت کو دیکھا
کہتے ہین جسے عاشق شیدا ملک و ناس
خیاط عہد طفلی شاہ انام تھے
اسکی ثنا شفقت مالایطاق ہی
نانا نے تو قلم کیے جبریل کے پر ؎

کفار ڈھے طیش سے ہونٹون کو دبا کے | دانتون سے کے تلے بال محاسن کے دبا کے

آمد ہی امام سوم ہر دوسرا کی، ؎

اس سر پہ دھرے ہاتھ یہ قسمیہ اجل ہے | بس ہو یداللہ کے قابل یہی پھل ہے

بندش کی سستی اور ناہمواری میر انیس اور مرزا دبیر مین اصلی

جو چیز ما بہ الامتیاز ہی وہ الفاظ کی ترکیب نشست اور بندش کا فرق ہی، میر انیس کا کلام تم پڑھ چکے ہو، اُن کا اصلی جوہر بندش کی چُستی ترکیب کی دلآویزی الفاظ کا تناسب، اور برجستگی وسلاست ہی، یہ چیزین مرزا صاحب کے ہان بہت کم ہین ایک ہی مصرعہ مین ایک لفظ نہایت بلند اور شاندار ہی دوسرا مبتذل اور پست ہی، بند کا ایک شعر اس زور شور کا ہی کہ معلوم ہوتا ہی کہ بادل گرجتا آ رہا ہے، دوسرا بالکل پھیکا اور کم وزن ہی، دو تین بند صاف اور سلیس نکل جاتے ہین پھر تعقید اور بے ربطی شروع ہوتی ہی، اکثر جگہ الفاظ بڑے دھوم دھام کے ہین لیکن حاصل کچھ نہین یہ باتین اگرچہ عام طور پر اُن کے تمام مرثیون مین پائی جاتی ہین لیکن نمونہ کے طور پر ہم چند بند اُن مرثیون کے نقل کرتے ہین جو بڑے زور کے مرثیے خیال کیے جاتے ہین اور جنمین بعض میر انیس کے جواب مین لکھے گئے ہین ؎

اے طنطنۂ طبع جز و کل کو ملا دے	اے دبدبۂ نظم دو عالم کو ہلا دے
اے زمزمۂ نطق بلاغت کا صلا دے	اے معجزۂ فکر فصاحت کو جلا دے

اے بائے بیان معنی تسخیر کو حل کر
اے سین سخن قاف سے تا قاف عمل کر

یہ مرثیہ میر انیس کے جواب مین ہے، کس زور شور کی اُٹھان ہے، کیسے پُر رعب الفاظ ہین لیکن معانی مین بہت کم ربط ہے، طنطنہ کو جز و کل کے ملا دینے سے کیا نسبت ہے؟ زمزمۂ نطق سے بلاغت کا صلہ مانگنے کے کیا معنی؟ بیان کی بے کو تسخیر سے کیا خاص تعلق ہے؟ اسی طرح سخن کے سین کو قاف سے قاف تک عمل کرنے کے لیے کیا خصوصیت ہے ــــ

سکہ نے ندا دی زر انجم پہ پڑون گا	بولا علم خامہ فلک پر مین گڑا دون گا
مضمون پکارا مین کسی سے نہ لڑون گا	معنی نے کہا بیت مین آئینہ جڑون گا

بندش یہ کھلی دم مین فصاحت کا بھرونگی
چلائی طبیعت کہ مین اصلاح کرونگی

پہلے دو مصرعے کسقدر دھوم دھام کے ہین تیسرے مین تنزل شروع ہوا چوتھا بالکل گر گیا کیونکہ اوپر کے مصرعون کی مناسبت کے لحاظ سے موقع یہ تھا کہ اسمین بھی کوئی ایجابی دعویٰ کیا جاتا، مضمون کا نہ لڑنا اگرچہ معنی تعریف کی بات ہے لیکن یہان لڑائی سے گریز کرنے کا موقع نہین، اخیر کا شعر اور خصوصاً اسکا دوسرا مصرع کسقدر پھس پھسا اور مبتذل ہے، طبیعت کے چلانے کا یہ کیا موقع ہے اور طبیعت کے لیے چلانا کتنا ناموزون لفظ ہے ــــ

نوبت زن بام عروج فلک پیر	ہین کون صاحب علم کلک جہانگیر
خاک قدم محتشم و مقبل و شبیر	تاج سر لفظ و سخن و معنی و تحریر

شکر نہ کرے ہان تو شکایت بھی نہین ہے
انصاف تو کہتا ہے خدا وند یون ہی ہے

پہلے تین مصرعے عنوان کا جواز ہیں، چوتھا مصرع اُس سے کسقدر بیگانہ ہی ـــ

مضمون میں نئے کرتا ہوں ایجاد ہمیشہ
کہنے میں ہی تائیدِ خداداد ہمیشہ
کہتا ہی سخن حضرتِ استاد ہمیشہ
بھولے سے بتا دوں تو رہے یاد ہمیشہ

بے لطفِ خدا یہ ہمہ دانی نہیں آتی
یہ شمع صفت چرب زبانی نہیں آتی

جو چیز خداداد ہی اسکے لیے ہمیشہ کی قید حشو محض ہی، چوتھا مصرع، تیسرے مصرع سے بالکل بے تعلق ہی، استادی کا ذکر دوسرے مصرع میں ہی، اور اس کے ساتھ اس مصرع کو ربط ہو سکتا ہی، ٹیپ کے دو مصرعے بھی باہم بالکل بے تعلق ہیں۔

تین چار بند کے بعد فرماتے ہیں ـــ

مضمون تر و تازہ ہیں جستی ہیں یگانہ
اطلس بیان کے آنے سے کرم شاد کا جانا
ملبوس قلم کار نہ دو دن ہی نہ پرانا
خُدّام ولا بولے کہ ہاں بات بڑھانا

لے ہدیۂ تائید قدیرِ ازلی سے
لے خلعتِ تحسین حسینؑ ابن علیؑ سے

پہلے اور دوسرے شعر کی ترکیب اور انداز میں باہم کس قدر تفاوت ہی، دوسرا شعر پہلے شعر سے بالکل الگ ہوگیا ہی، دوسرے شعر کی بندش ایسی ہی کہ مطلب بھی آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا۔ اس بیان کا مشار الیہ کون ہی ـــ

حامی جو سلیمانِ دو عالم نظر آئے
طاؤس تصور کی طرح دل میں در آئے
مضمون جو عنقا تھے وہ پر جوڑ کے آئے
شیشہ میں پری زاد معانی اتر آئے

یاقوت بدخشان سے دُر آتے ہیں عدن سے
لعل اُگلوں گا میں نادرہ [illegible] دہن سے

حضرت سلیمانؑ کو عنقا سے کیا تعلق ہی، تصور کی تشبیہ طاؤس کس بنا پر ہے؟

اور پھر اسکے کیا معنی کہ عنقائے مضمون دلمین اس طرح اُتر آئے جس طرح طاؤس تصوّر دل مین اُتر آتا ہی، طاؤس دلمین نہین اترتا، اور اگر تصور کے طاؤس ہونے کی بنا پر ہی تو مضمون کا عنقا خود دل مین اُتر سکتا ہی، طاؤس کی مشابہت کی کیا ضرورت ہی، ٹیپ مین عجب بے ربطی ہی شاعر لعل اُگلے گا لیکن طائر سدرہ کے دہن سے نکلے گا اسکے کیا معنی؟ شاید اُگلنے کو اگلوانے کے معنی مین لیا ہی، یا اپنے آپ کو طائر سدرہ قرار دیا ہی ؎

کب شعلۂ خس نور کی قندیل کو پہونچے
پشہ کا نہ غل صور سرافیل کو پہونچے
اڑ کر نہ مگس طنطنۂ فیل کو پہونچے
بلبل نہ لب و لہجۂ جبریل کو پہونچے

ارباب سخن پر جو سخن ور ہے ہمارا
القاب سخن سنج سخن ور ہے ہمارا

کسقدر بھدے الفاظ اور بھدی ترکیبین ہین۔ اسکے علاوہ بے ربطی کو دیکھو شعلہ کا مقام قندیل سے نہین بلکہ قندیل کی روشنی سے ہو سکتا ہی پرواز کو طنطنہ سے کیا نسبت ہی بلبل کو جبرئیل سے کیا مناسبت ہی، لقب کے بجائے القاب باندھا ہی ؎

سرکار یہ ہی مجلس شبیرؑ ہماری
آئینۂ سکندر یہ ہی تصویر ہماری
مضمون کی طرح بیت ہی جاگیر ہماری
ہے مہر سلیمانؑ کی تحریر ہماری

تھاما ہے دما ہی پہ نہین سکہ پڑا ہے
سورج کا نگینہ بھی انگوٹھی پہ جڑا ہے

بیت کا درجہ مضمون سے کم ہی، کیونکہ بیت کی جو خوبی ہی مضمون ہی کی وجہ سے ہی اِس بنا پر یہ تشبیہ کہ مضمون کی طرح بیت ہماری جاگیر ہی بے معنی ہی، جب مضمون جاگیر ہو چکا تو بیت خود ہی جاگیر ہو گئی، ٹیپ کا آخیر مصرع بالکل بے معنی ہی، پہلے انگوٹھی سے کسی چیز کا استعارہ کرنا تھا، پھر سورج کا نگینہ جڑنا تھا ورنہ ظاہر ہی کہ ہات مین پہننے کی انگوٹھی پر سورج کا نگینہ جڑنا کسقدر لغویات ہی ؎

قابل ہیں سخن کے ہوں سخن ہے مرے قابل
رضوان کو جنت یہ چمن، ہے مرے قابل
لیکن سخن شہرہ فگن ہے مرے قابل
موتی کو صدف اور یہ عدن ہے مرے قابل
شہرہ ہے یہ تائید شہ جن و ملک سے
مضمون مرا پوچھتے آتے ہیں فلک سے

سخن شہرہ فگن نئی ترکیب ہے ع رضوان کو جنت، یہ چمن ہے مرے قابل ناموزوں ترکیب ہے، یا تو یوں ہونا چاہیے تھا کہ رضوان کو جنت چاہیے اور مجکو یہ چمن یا یوں کہنا تھا کہ رضوان کے قابل جنت ہے اور میرے قابل یہ چمن چوتھے مصرع کی ترکیب کا بھی یہی حال ہے، ٹیپ کے دونوں مصرعے قریباً باہم متناقض ہیں شہرہ بھی انتہا کا ہے اور مضمون کو گھر پوچھنے کی بھی ضرورت ہے، شاید یہ مراد ہو کہ صرف نام مشہور ہو چکا ہے لیکن چونکہ مضامین کو کبھی مرزا صاحب سے روشناسی نہیں ہوئی اور آستانہ مبارک تک پہونچنے کی نوبت نہیں آئی اس لیے گھر کا پتہ پوچھنا پڑا ہے

ہیں وقف ہمیشہ مرے الفاظ و معانی
ہر بحر میں ہے بحر طبیعت کی روانی
ہاں قلزم شیریں کا بھی پیتے ہیں پانی
ہے زور سخن شور یہ موجوں کی زبانی
قطرہ سے گہر بحث میں میں صرف نہیں ہوں
دریا ہوں سخن کا میں تنگ ظرف نہیں ہوں

تیسرے مصرع کا مطلب مشکل سے سمجھ میں آسکتا ہے، مقصد یہ ہے کہ زور سخن شور پر ہے لیکن اس بات کو میں نہیں کہتا بلکہ موج کی زبان کہتی ہے، بحث میں صرف ہونا کون سا محاورہ ہے، ٹیپ کے دوسرے مصرع میں "میں" کا لفظ محض فضول ہے پہلے مصرع میں "میں" کا لفظ آچکا ہے

خامہ ہے فروتن مرا افراط ادب سے
نخوت کے معانی ہیں الگ گفتگو کے لب سے
جھک کر شرفا اور نجبا ملتے ہیں سب سے
جس طرح سے بد اصل جدا نیک نسب سے

دشمن سے بھی ہم قطع نہین کرتے حیا کو
مانند غبار اُٹھتے ہین تعظیم ہوا کو

پہلے مصرع مین انکساری اور خاکساری کے بجاے ادب کہا ہی، حالانکہ دونون مین بہت فرق ہی، تیسرے مصرع کی ترکیب اور لفظ کے لب کا استعارہ سابق و لاحق کی سادگی وصفائی سے نہایت بیگانہ ہی ؎

شیرین سخنی کا سبق اکبرؑ سے لیا ہی
اس ذرہ مین سب مہر حسینی کی ضیا ہی
جوہری افلاک سے گو خاک بسر ہوں
ہان عیب بڑا یہ ہی کہ مین اہل ہنر ہوں

گو خاک بسر ہون کا جواب، ہان عیب بڑا یہ ہی کس قدر بے جوڑ ہی "مین" کا لفظ بالکل حشو ہی،

مرزا صاحب کا ایک اور نہایت مشہور مرثیہ ہی ؎

کس شیر کی آمد ہی کہ رن کانپ رہا ہے
رستم کا جگر زیر کفن کانپ رہا ہے
رن ایک طرف چرخ کہن کانپ رہا ہے
خود عرش خداوند زمن کانپ رہا ہے
شمشیر بکف دیکھ کے حیدرؑ کے پسر کو
جبریل لرزتے ہین سمیٹے ہوے پر کو

ہیبت سے ہین نُہ قلعۂ افلاک کے در بند
وا ہے کمر چرخ سے جوزا کا کمر بند
جلاد فلک بھی نظر آتا ہے نظر بند
سیارے ہین غلطان صفت طائر پر بند
انگشت عطارد سے قلم چھوٹ پڑا ہے
خورشید کے پنجہ سے علم چھوٹ پڑا ہے

یہ دونون بند لیے انداز مین پورے ہین، اب تیسرا بند ملاحظہ ہو ؎

خود فتنہ و شر پڑھ رہے ہین فاتحہ اخیر
کہتے ہین انا العبد لرز کر صنم دیر

جان غیر بدن غیر مکین غیر مکان غیر — نے چرخ کا ہی چرخ نہ ستارہ کی ہی سیر

سکتہ مین فلک خوف سے مانند زمین ہی
جز بخت یزید اب کوئی گردش مین نہین ہی

انا لعجب کس قدر سلاست کے خلاف ہی، یہ مصرع ع جان غیر بدن غیر مکین غیر مکان غیر
اس بند مین کسقدر بیگانہ واقع ہوا ہی

بیہوش ہی بجلی یہ سمندان کا ہی ہشیار — خوابیدہ ہین سب طالع عباسؑ ہی بیدار
پوشیدہ ہی خورشید علم ان کا نمودار — بے نور ہی منہ چاند کا۔ رُخ ان کا ضیابار

سب جزو ہین۔ کل رتبہ مین کہلاتے ہین عباسؑ
کونین پیادہ ہے سوار آتے ہین عباسؑ

یہ بند اوپر کے بند سے دفعۃً اس قدر بے تعلق ہو گیا ہی کہ مطلب سمجھنا مشکل ہی ان کا مشار الیہ حضرت عباسؑ ہین لیکن چونکہ حضرت عباسؑ کا ذکر صرف پہلے بندون مین آیا تھا جس سے تین بندون کا فاصلہ ہی اس لیے ذہن اس طرف جلدی منتقل نہین ہوتا مضمون کی بے ربطی کی یہ کیفیت ہی کہ ایک طرف تو تجلی کی وجہ سے بجلی کو بیہوش قرار دیا ہی، دوسری طرف فرماتے ہین کہ سب خوابیدہ ہین، انپ کی بندش کی سستی خود ظاہر ہے

چمکا کے سر خور زر ونقرہ کے عصا کو — سرکاتے ہین پیر فلک پشت دوتا کو
عدل آگے بڑھا حکم یہ ہوتا ہے قضا کو — ہان باندھ لے ظلم وستم وجور وجفا کو

گھر لوٹ لے بغض وحسد وکذب وریا کا
سر کاٹ لے حرص وطمع ومکر ودغا کا

ان استعارات مین جو لطافت ہی وہ ظاہر ہی،
ہم مناسب سمجھتے ہین کہ ایک مشہور اور معرکہ کے مرثیہ کے متعدد بند اس

موقع پر نقل کردیں جس سے مرزا صاحب کی طرز بندش کے تمام محاسن و معائب کا پورا اندازہ ہوسکے۔ یہ مرثیہ وہ ہے جس کو مرزا صاحب کے نامور معتقدین اکثر مجالس میں بڑے فخر کے ساتھ پڑھتے ہیں ؎

پرچم ہے کس علم کا شعاع آفتاب کی
پانی ہے کس پھریرے سے ہمت سحاب کی
یہ شان ہے نشان رسالت مآب کی
چوب علم کلید ہے جنت کے باب کی
نقشہ علم کے پنجے میں اللہ کا ملا
بندوں کو اس نشاں سے نشان خدا ملا

صبح جہاد شاہ ثریا جناب ہے
فوج حسینؑ پن سے ظفر ہمرکاب ہے
مشرق سے واں علم علم آفتاب ہے
یاں نور کا نشان علم بوتراب ہے
روشن علم سے آئینۂ مشرقین ہے
مشرق میں شمس عکس نشان حسینؑ ہے

طوبیٰ کی شاخ تیشۂ قدرت سے کی قلم
اور نور نخل طور بھرا اس میں یک قلم
کی صادقوں کی راستی قول اس میں ضم
بے پردہ ہو کے عفو بنی پوشش علم
جب باندھ کر پھریرے کو سیدھا علم کیا
صانع نے پردہ میں ید طولیٰ علم کیا

دامن ہے کبریا کا سراپردۂ جلال
ماہی مراتب اس سے ہے شاہوں کا پائمال
پھرا ہوا ہے شیر پھریرے کا بے جدال
شیر فلک کو دیکھ کے ہوتا ہے لال لال
تسخیر غرب و شرق اسے کیا محال ہے
پنجہ ہے آفتاب تو ناخن ہلال ہے

نور خدا سے قالب خیر الامم بنا
سایہ نبیؐ کا ہو کے مجسم علم بنا
واں ابر چتر فرق نبیؐ پر قدم بنا
یاں پوشش علم وہ سحاب کرم بنا

سب کام بند ہوں، جو پھر رانہ وار ہے
سچ ہے خدا کے فیض کا چشمہ کھلا رہے

اب رایت زبان سے مضمون علم کروں	اور معنی بلند کا لشکر بہم کروں
مجلس میں ذکر شقّہ حال علم کروں	رایت میں سلک نظم کے پرچم کو ضم کروں

مشتاقوں کو زیارت رایت ضرور ہے
اس رایت نبی کی درایت ضرور ہے

جب شاہ انبیا کو ہوئی خواہش علم	آئی ندا فلک سے ابھی بھیجتے ہیں ہم
جاری ہوا یہ حکم خداوند محترم	ہاں قدسیو! علم کی درستی کرو بہم

تیار میرے دوست کی خاطر نشاں کرو
یعنی علم کی فکر سے خاطر نشاں کرو

تعقید مرزا صاحب کے کلام کی ایک خصوصیت تعقید ہی ہے، وہ جہاں معنی آفرینی اور دقت پسندی پر زیادہ توجہ کرتے ہیں کلام میں پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے وہ نہایت دقیق اور بلند مضامین پیدا کرتے ہیں لیکن مناسب الفاظ ہاتھ نہیں آتے اس لیے مضمون ایک گورکھ دھندا ہو کر رہ جاتا ہے۔

تلوار کی تعریف

تہ نگہ چشم نیام اوج پر آیا	اور صاف ہر اک فرد بشر کو نظر آیا
خط کھینچنے کو کلک دوات ظفر آیا	یا دوڑ کے ظلمت کی گلی سے خضر آیا

واں شور تھا پیدا مہ نو سے مہ نو ہے
ہاں غل تھا جدا شمع سے یہ شمع کی لو ہے

آمد کی دھوم

خود ابر فلک گرد سواری میں گھرے ہیں	دریا میں صدف ڈوب کے دوزخ میں ترے ہیں

یون کانپ کے سردارون کے منھ رنگ سے پھرے ہین ۔ بُت حرص کے طاق دل اعدا سے گرے ہین

رعشہ ہر نقط، ہات نہین پانون نہین ہے
دہشت کے سبب دھوپ نہین چھانون نہین ہے

سراپا:

معراج پیمبر کی تو روشن ہے حقیقت ۔ ہان دیکھو تہِ عرش جبین چشم کی زینت
اُترا ہے نبی کے لیے یہ کاسۂ نعمت ۔ ہم صحبت و ہم کاسہ ہین معبود سے حضرت

اِس کاسہ مین رتبہ ہے یہ پلکون کی ثنا کا
اِک ہاتھ نبی کا ہے اور اِک ہاتھ خدا کا

اب مومنون کو عالمِ بالا کی خبر دون ۔ حل عقدۂ مع سرِ اقدس کو بھی کردون
گردون کو مین نسبت سرِ پُر نور سے گردون ۔ یہ عرش ہو اور عرش بنے رشک سے گردون

اک قامتِ احمد ہے اسی فوق جہان پر
خورشید سے اک نیزہ سوا ہوگا سنان پر

گو غنچہ ہے گوشِ پسرِ سیدِ خوشخو ۔ قربِ ختنِ زلف سے ہر نافے کی ہے بو
اور حلقۂ گیسو کہ ہے اِک نافۂ آہو ۔ ہر کان کی نکہت سے رگِ غنچہ ہے اک مو

نافہ کا شرف غنچہ کو کاکل نے دیا ہے
اور گوش کے نافہ کو یہان غنچہ کیا ہے

خط حُسن کی خاطر ہے خزان کا خطِ فرمان ۔ ہان حلقۂ خط حُسن کو ہے چشمۂ نگہبان
صرصر سے ہوا ایمن یہ چراغِ رخِ تابان ۔ عارض کو کیا خط نے چراغِ تہِ دامان

گلشن ہے غلط اور غلط ابر بہاری
رخ باغ بہاری ہے یہ خط ابر بہاری

ایک اور مرثیہ مین فرماتے ہین ؎

نام جبین ہی مشرق خورشید ہر امید
ہی صبح صادق اسکی گواہی سے روسپید

ہان پھول سرکو ملین یکل ہو نصیب بید
مہر قبول کے اثر سجدہ سے نوید

اگر نشان سجدہ جبین پر دکھاتے ہیں
یا سرنوشت نیر اکبر دکھاتے ہیں

کیا شاہ بیت ابروے اکبر کی ہو ثنا
بیت القصید ہی خم ابروے مصطفیٰ

یکتا مطالعہ میں ہی یہ مطلع رسا
کیا بیت بحثی ان سے کرے ماہ نو بھلا

پیش نگہ یہ بیت ہی اٹھارہ سال سے
آتی ہے بوے شیر دہان ہلال سے

تشبیہات و استعارات

مرزا صاحب کے کلام کا خاص جوہر تشبیہات و استعارات ہین، اس مین شبہ نہین کہ وہ اپنی دقت آفرینی سے ایسے عجیب اور نادر تشبیہات اور استعارات پیدا کرتے ہین جن کی طرف کبھی کسی کا خیال منتقل نہین ہوا ہوگا، لیکن اس زور مین وہ اکثر اس قدر بلند اڑتے ہین کہ بالکل غائب ہو جاتے ہین مثلاً سے

شمشیر نے جل تھل جو بھری قاف سے تا قاف
چھپنے کے لیے خون ہی اسد جہ گھٹا قاف

پر لال ہوئین مرغابیان گرداب بنا قاف
جو بیچ مین سیمرغ کی منقار کے تھا قاف

کیا جانے کدھر لیکے خزانہ وہ بہا تھا
قارون کو عذاب ابدی ڈھونڈھ رہا تھا

تیغ عباس جو دامان زرہ مین تھی نہان
پیکان وہ ہلالی ابروی پر نوت کا کونے مین سے
مدنگہ چشم شام اوج پر آیا

یا شبستان مین وہ خوابیدہ تھا مار دوزبان
یا برق جدا ہوگئی بادل کے دھوین سے
اور صاف ہر اک فرد بشر کو نظر آیا

خط کھینچنے کو کاکب دوات ظفر آیا
یا دوڑ کے ظلمت کی گلی سے خضر آیا
گرمی پہ شرر تیغ شرر دم کے جو آئے
جوہر نے کنویں قعر جہنم کے جھکائے
تھی مرغ نگہ پر ذرہ میں پر اس نے جلائے
عنقائے تصور کے کباب اس نے لگائے
ظلمات میں یہ تیغ بہ قبضہ کیے پھری
یونس کو جیسے بطن میں مچھلی لیے پھری
چہرہ سے بنی صف لشکر بھی نور کی
بت خانہ سے شباہت ممبر بھی دور کی
کاف تنگنائے تن کے درون جگر گئی
مانند سیم مرگ میان کمر گئی
لفظ شکم میں دینے کو زیر و زبر گئی
مانند جیش ہر جزو کل سے گذر گئی
رن کی صفوں کا خون سر سے تھا اتو ہو گیا
پانی ہوئے یہ زہرے کہ چشمہ کا دھو گیا
بینی جبین و لب سر حسین و خلیل ہے
سر پر ہے عرش زیر قدم سلسبیل ہے
بعضیں چھٹیں شرر کی سفر کانپنے لگے
شعلے زبان نکال کے خود ہانپنے لگے
نہیب تیغ سے خالی سبھوں کے قالب تھے
پیالہ ہائے فلک خون سے لبالب تھے
گیا جو فوق سے تحت الثریٰ کو آب حسام
بنا خزانۂ قارون خرابہ حمام
فلک نے تختۂ یونان رکھا زمین کا نام
ہوا رطوبت اطراف سے زمین کو زکام
دماغ خاک پہ نزلہ بہ صد وفور گرا
کیا جو عطسہ تو قارون نکل کے دور گرا

جوہر میں طرفہ ہیبت تیغ دلیر ہے
مچھلی کے جال میں یہ مگر کوئی شیر ہے
بادل کی طرح جوہر شمشیر جو چھائے
سایہ نے تڑپ کر دل رعد بجائے
چار آئینہ نے اور ہی صورت دکھائی ہے
پر آئینہ نہیں ہے سند ہم نے پائی ہے
زائل زرہ کی آنکھوں سے جو روشنائی ہے
آنکھوں نے چار چشمہ کی عینک لگائی ہے
ڈر ڈر کے آب تیغ سے سب کوچ کر گئے
غصہ سے ہو گئے چین پہ جبین کچھ ٹھہر گئے
پل بن گئے وہ چین جبین اسر اتر گئے
اک وار میں فرات سے یاران کے سر گئے

پرِ دُم ذوالجناح صاف دُھوئیں سے نکل گیا
بارود تھا کہ اُڑ کے کنوئیں سے نکل گیا

تھا طوطیٔ خط پشتِ لبِ لعل پر گویا
دیکھو کہ دھواں آتشِ یاقوت سے نکلا

تھا چاہِ ذقن میں چہِ نخشب کا تجلّا
اس چاہ کی کشتی نے تو پانی بھی نہ مانگا

جلوے لب و دنداں کے عجب پیشِ نظر تھے
دروازے پہ یاقوت تھے اور گھر میں گہر تھے

حاشا نہیں تجلیِ ماہ آسمان پر
مچھلی اُچھلتی ہے کلاہِ آسمان پر

چشمِ ضیا فشاں سے نمودِ چراغ ہے
پلکیں نہ سمجھو ہالۂ دودِ چراغ ہے

پیدا کرے کینہ جناب آگ سے ہے
یہ بالِ چشم ناب کا تارِ نگاہ ہے

جلتی ہے کوہِ طورِ تجلی کبریا
بنتے تھے تل کی اوٹ پہاڑ اب نظر پڑا

جب تکتے یہ پلکیں دستِ نگر میں ندوین عصا
موسیٰ کی بھی نگہ نہ ہوا اس چشم تک رسا

اک جلوہ دے یہ چشم جسے اپنے نور کا
وہ خاک کے بھی مول نہ لے سرمہ طور کا

سجنے لگا سلاحِ دغا پھر وہ پُر دغا
کی خود نے خود نمائی سے زیبِ سرِ جفا

یا ماہ آفتاب کو گویا گہن لگا
یا دار قند یہ کفر کا بختِ سیہ چڑھا

اسلام میں جو ڈالے ہیں رخنے یزید نے
ان رخنوں کو کیا زرہِ تن پلید نے

پاؤں میں پہنے موزۂ گمراہی جہاں
کج فہمی معاویہ کی اس نے لی کماں

اور تیغِ ہند بند جگر خوارہ کی زباں
فردِ سیہ تھی نامۂ اعمالِ شامیاں

تھا آئینہ وہ زنگ بھرا اس پلید کا
دل شمر و شیث و ابن زیاد و یزید کا

مضمون بندی خیال آفرینی

میر انیس اور مرزا دبیر میں اصلی مابہ الامتیاز جو چیز ہے وہ خیال بندی

اور دقت پسندی ہی، اور یہی چیز مرزا صاحب کے تاج کمال کا طرّہ ہے، اسمین کچھ شبہ نہین کہ مرزا صاحب کی قوت متخیلہ نہایت زبردست ہی، وہ اس قدر دور کے استعارات اور تشبیہات ڈھونڈھکر پیدا کرتے ہین کہ وہان تک ان کے حریفون کا طائر وہم پرواز نہین کر سکتا۔ راست نما اور دلفریب دلیکن غلط، استدلال جو شاعری کا ایک جزو اعظم ہی انکے ہان نہایت کثرت سے پایا جاتا ہی، وہ قوت متخیلہ کے زور سے نئے اور عجیب دعوے کرتے ہین، اور خیالی استدلال سے ثابت کرتے ہین۔ مبالغہ کے مضامین جو پہلے شعرا باندھ چکے تھے اور بظاہر نظر آتا تھا کہ اس کی حد ہو چکی، اُن کو وہ اس قدر ترقی دیتے ہین کہ پہلے مبالغے، اُن کے مقابلہ مین ہیچ ہو جاتے ہین،

مختصر یہ کہ خیال آفرینی، دقت پسندی، جدت استعارات، اختراع تشبیہات، شاعرانہ استدلال، شدت مبالغہ مین ان کا جواب نہین، لیکن اس زور کو وہ سنبھال نہین سکتے، اسوجہ سے کہین خامی پیدا ہو جاتی ہی، کہین تعقید اور اغلاق ہو جاتا ہی، تشبیہات کہین پھیکی بنجاتی ہین، اور کہین محض فرضی خیال رہ جاتی ہین، تاہم اس سے انکار نہین ہو سکتا کہ جہان ان کا کلام فصاحت و بلاغت کے معیار پر بھی پورا اتر جاتا ہی نہایت بلند رتبہ ہو جاتا ہی، اس موقع پر ہم ان کے ہر قسم کے عمدہ مضمون آفرینی کی متعدد مثالین نقل کرتے ہین ؎

جب[1] سرنگون ہوا علم کہکشان شب
خورشید کے نشان نے مٹایا نشان شب

تیر شہاب سے ہوئی خالی کمان شب
تابی نہ پھر شعاع قمر نے سنان شب

آئی جو صبح زیور جنگی سنوار کے
شب نے زرہ ستارون کی رکھدی اُتار کے

شمشیر مشرقی جو چڑھی چرخ پر شتاب
پھر تیغ مغربی نے دکھائی نہ آب و تاب

تھا بسکہ گرم خنجر بیضاے آفتاب
باقی رہا نہ چشمۂ نیلوفری مین آب

[1] اسکے مقابلہ مین میر انیس کی صبح دیکھو ۔

محتاج ماہتاب ہوا آب و تاب کا
باغ جہاں میں پھول کھلا آفتاب کا

تھی جوشِ خوں کے عارضہ میں مبتلا شفق
فصّاد صبح آیا لیے نشتر و طبق
کھولی شفق کی صبح نے رنگ افق تھا زرد
گلرنگ تھا صحیفۂ گردوں ورق ورق
خونِ شفق میں سرخ قضا نے قلم کیا
در خط و خال روز شہادت رقم کیا

ایضاً

پیدا شعاعِ مہر کی مقراض جب ہوئی
پنہاں درازیٔ پرِ طاؤس شب ہوئی
اور قطع زلفِ لیلیٔ زہرہ لقب ہوئی
مجنوں صفت قبائے سحر چاک سب ہوئی
فکرِ رفو تھی چرخ ہنرمند کے لیے
دن چار ٹکڑے ہو گیا پیوند کے لیے

یوسف غریقِ چاہ سیہ ناگہاں ہوا
یعنی غروب ماہ تجلی نشاں ہوا
یونس دہانِ ماہیٔ شب سے عیاں ہوا
یعنی طلوع نیّرِ مشرق ستاں ہوا
فرعونِ شب سے معرکہ آرا تھا آفتاب
دن تھا کلیم اور یدِ بیضا تھا آفتاب

تھی صبح یا کہ چرخ کا جیبِ دریدہ تھا
یا چہرۂ مسیح کا رنگ پریدہ تھا
خورشید تھا کہ عرش کا اشکِ چکیدہ تھا
یا فاطمہ کا نالۂ گردوں رسیدہ تھا
کیسے نہ مہرِ صبح کے سینہ پہ داغ تھا
سید اہلِ بیت کا گھر بے چراغ تھا

نکلا افق سے عابدِ روشن ضمیر صبح
محرابِ آسماں ہوئی جلوہ پذیر صبح
کھولا سپیدی نے جو مصلائے پیر صبح
ہر سجدہ گاہ بن گیا مہرِ منیر صبح

کرتی تھی شب غروب کا سجدہ وددود کو
سیارے ہفت عضو بنے تھے سجود کو

ظلمت جہاں جہاں تھی وہاں نور ہو گیا
گویا کہ زنگ آئنے سے دور ہو گیا
پھر مشک شب جہان سے کافور ہو گیا
با ظل زسالۂ شب دیجور ہو گیا

کیا پختہ روشنائی تھی قدرت کے خامے میں
مضمون تھا آفتاب کا ذروں کے نامے میں

ایضاً

گلگونۂ شفق جو ملا حور صبح نے
گرمی دکھائی روشنی طور صبح نے
اسپند مشک شب کو کیا نور صبح نے
ٹھنڈے چراغ کر دیے کافور صبح نے

صبح

لیلائے شب کی رات کو دولت جو لٹ گئی
افشاں جبیں سے مہر درخشاں کی چھٹ گئی

پیدا ہوا سپیدۂ طلعت نشان صبح
باندھا عمامہ نور کا پہنا کتان صبح
سلطان صبح نے کیا قصد اذان صبح
چرخ چہارمیں پہ گیا خطبہ خوان صبح

منھ سب کے نور سے قبلۂ امید ہو گئے
سرگرم سجدہ عیسیٰ و خورشید ہو گئے

آیا جو تیغ روز لیے شاہ نیمروز
باندھے کمر میں خنجر بیضائے کینہ توز
ماہی شکار شیر سوار و جہاں فروز
پھر دیو ہفت سر ہوا صید عقاب روز

مہتاب لشکر شہ خاور میں گھر گیا
آرہ شعاع کا سر انجم پہ پھر گیا

بڑھ کر نقیب نور پکارا سحر سحر
فرمان نور بدر کو پہنچا بدر بدر
ذروں میں نور مہر در آیا قمر قمر
لوٹا سحر نے معدن شبنم گہر گہر

پرتو جو اُٹھ گیا تھا رُخِ آفتاب کا
پردہ تھا فاش صبح کے لمع نقاب کا

تلوار

شاخِ نیام سے ہوا اس طرح پھل جُدا
بیروں کے قد سے جیسے جوانی کا بل جدا
ہستی جُدا زمیں پہ تڑپی اجل جُدا
خنجر جدا فلک پہ گرا اور زحل جُدا

غُل تھا کہ اب مصالحۂ جسم و جاں نہیں
لو تیغ برق دم کا قدم درمیاں نہیں

ڈوبی سپر میں گر کے نئی چال ڈھال سے
پاکھر کے بیچ میں یہ بڑھی سیدھی چال سے
اُٹھ کر زرہ میں آئی شکوہ و جلال سے
اک جال میں تڑپ کے گئی ایک جال سے

گذری جو چار آئینہ سے منھ کو موڑ کے
غُل تھا پری نکل گئی شیشہ کو توڑ کے

کاٹا پلک میں آنکھ کو پتلی میں نور کو
پانوں میں کجروی کو سروں میں غرور کو
سینہ میں بغض و کینہ کو دل میں فتور کو
نیت میں معصیت کو طبیعت میں زور کو

ذات اک طرف، مٹا دیا بالکل صفات کو
کیسی زباں، زبان میں یہ کاٹ آئی بات کو

سب کے گلوں سے ملتی تھی لیکن رُکی ہوئی
جوہر یہ تھا کہ بوجھ سے خود تھی جھکی ہوئی

ولہ

ظرفِ تنگ میں تھی نہ جگہ اسکی آب کی
بندھتی تھی اور کھلتی تھی مٹھی حباب کی
دریائے خوں تھا تیغ سبکرو کی ناؤ پر
بہہ یوں رواں تھی جیسے کہ کشتی بہاؤ پر

ولہ

اللہ ری شناوری شمشیر آبدار
دکھلا دیے صفائی کے سب ہاتھ ایک بار
تیرا وہ جیسے زخم میں گہ وار۔ گاہ پار
جوہر کا ایک بال بھی ڈوبا نہ زینہار

اک وجد حر کو بھی یہ صفا دیکھ کر ہوا
ہات اک طرف نہ تیغ کا ناخن بھی تر ہوا

جس مورچہ میں لیلی تیغ دو سر گئی
ہر صف نے خاک اُڑائی۔ اِدھر سے اُدھر گئی
چنگے بھلوں کو سایہ سے دیوانہ کر گئی
پھر یہ نہا نہا کے لہو میں نکھر گئی

عالم نہ پوچھو قطرہ فشانی کے حسن کا
جوبن ٹپک رہا تھا جوانی کے حسن کا

آگے کبھی بڑھی کبھی پیچھے کو پھر پڑی
ولہ
سر پر جو لڑکھڑائی تو شانے پہ گر پڑی

اُٹھی۔ گری۔ بلند ہوئی۔ پست ہو گئی
ولہ
پی پی کے میکشوں کا لہو مست ہو گئی

نیزے سے تو اُس نے کہا دیکھے بھالے ہیں
برسے جو تیر سمجھے کمانوں کے نالے ہیں
ولہ
بچتی نہ خنجروں سے کہ گودی کے پالے ہیں
چمکے جو گرز بولی یہ مُنہ کے نوالے ہیں

ننگ اپنا جان کر نہ کسی سے بگڑتی تھی
ہر پھر کے آپ اپنی طبیعت سے لڑتی تھی

بیجرم معرکہ میں وہ خارا شگاف تھی
ولہ
لشکر کا خون کیا تھا مگر پاک و صاف تھی

قبضہ نور ہا دست جناب شہ دین تھا
ولہ
پھل جا کے لگا شاخ سر گاؤ زمین میں

اس قہر مجسم پہ اجل نے جو نظر کی
غصہ سے چڑھی بھوں جو ادھر تیغ دو سر کی
ولہ
خنجر تو نفط کر لیا اور تیغ کو سر کی
پھرنے لگی پتلی سپر فوج عمر کی

باقی تھا نہ دم خوف سے تیغیں پٹی تھیں
تیغیں کہو نبضیں نیاموں کی چھٹی تھیں

خود رفتہ تھا ہر تیر یہ رفتار رنگی تھی
ولہ
انگڑائی کا نیت بھی کمان بھول گئی تھی

تھی راست گو وہ تیغ یہ دشمن جہان پہ تھا
ولہ
جتنا لہو پیا تھا وہ جاری زبان پہ تھا

کٹتے تھے سر نہ تیغ امام عراق سے
ولہ
بت گر رہے تھے خاک پہ کعبہ کے طاق سے

سر کو نہ وصل تیغ سے اصلا دریغ تھا | ولہ | کیا سب کی سرنوشت میں مصرعِ تیغ تھا

رک رک کے قدم رکھتی تھی ہر سر پہ ادب سے | ولہ | جھک جھک کے مثال شرفا ملتی تھی سب سے

جوہر کے نگہبانوں کو بیدار جو پایا | ولہ | زخموں نے بھی اس تیغ کا پانی نہ چرایا

ہوتی تھیں صفیں آب دم تیغ سے بیدم
حل کرتی تھی ہر مسئلہ تیغ شہ عالم | ولہ | پانی جو کھڑے ہوکے پیو ہوتا ہے کم کرن
ہر خون نجس اس میں یہ آلودہ تھی ہر دم

پڑا سپہ نجاست کا گمان ہو نہیں سکتا
یعنی کہ نجس آب رواں ہو نہیں سکتا

اللہ رے دماغ اس کا کسی سر پہ نہ بیٹھی | | سر ایک طرف گنبد مغفر پہ نہ بیٹھی
بالائے سپر پھولوں کے بستر پہ نہ بیٹھی

یہ بیٹھنا کب تھا، ادھر آئی اُدھر آئی
جس سر پہ رکھا پاؤں زمین پر اُتر آئی

اسی طرح گھوڑے کی سرعت، فوج کی لچل، آمد کی دھوم، وغیرہ وغیرہ مضامین میں سیکڑوں ہزاروں نئی تشبیہیں، استعارات، اور باریکیاں پیدا کی ہیں، ہم نے اس خیال سے صرف نمونہ پر اکتفا کیا کہ ایک شخص ایک تلوار کے متعلق اسقدر بے شمار مضامین کا ذخیرہ بہم پہنچا سکتا ہے، اس کی قوت تخیلہ کی کیا حد ہوسکتی ہے۔

بلاغت

یہ وہ چیز ہے جہاں انیسؔ اور دبیرؔ کی شاعری کی سرحدیں بالکل الگ ہوجاتی ہیں مرزا صاحب کی شاعری میں بالفرض گو اور تمام اوصاف پائے جاتے ہوں لیکن بلاغت کا تو شائبہ نہیں پایا جاتا۔

تم اوپر پڑھ آئے ہو کہ ہر چیز کی بلاغت الگ ہے، مضمون کی الگ، قصہ کی

الگ، قصیدہ کی الگ، شعر کی الگ، لیکن مرزا صاحب کے کسی قسم کے کلام مین یہ وصف پایا نہین جاتا۔ وہ اگر کسی واقعہ کا خاکہ تیار کرتے ہین تو اس قسم کی باتین بیان کرتے ہین جو خود شہادت دیتی ہین کہ واقعہ وجود مین نہین آسکتا۔ نوحہ و غم، فخر و ادعا، طنز و تشنیع، ہجو و بدگوئی، سوال و جواب، گلہ و شکایت، غرض کسی مضمون کو وہ مقتضاے حال کے موافق نہین لکھ سکتے

ہم چند مثالین، نمونہ کے طور پر لکھتے ہین۔

مثال ۱۔ ایک مرثیہ مین حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت پر حضرت شہربانو کا جو نوحہ لکھا ہی اُس مین لکھتے ہین ؎

تم جانو جہان سے شہ عالی کو لے آؤ　　اکبر سے مین گذری مرے والی کو لے آؤ

"تم جانو جہان سے" اِس محاورہ کے ابتذال سے قطع نظر کرکے یہ امر کس قدر خلاف مقتضاے حال ہی کہ کوئی شریف عورت یہ کہے کہ مین اپنے بیٹے سے درگذری میرے شوہر کو جہان سے ممکن ہو پیدا کرو

مثال ۲۔

ناگہان بالی سکینہ نے مچل کر یہ کہا　　میرے کرتے کا گریبان بھی کرو چاک چچا
خوب ملبوس یہ ہی پہنین گے ہم بھی ایسا　　روٹھ جاؤن گی نہ سنو گے جو میرا کہنا

آپ جب خیمہ مین آئینگے تو چھپ جاؤن گی
پھر مجھے گود مین لوگے تو نہ مین آؤن گی

روے ناداں کی تقریر پہ عباس کمال　　اور کہا دل سے کہ اس کا بھی کرو رد نہ سوال
بے پدر ہوگی کوئی آن مین یہ نیک خصال　　چاک اس کا بھی گریبان کیا با حزن و ملال

پیار جو آگیا بنت شہ دین کے اوپر
بوسے دے دے کے ملی خاک جبین کے اوپر

واقعہ یہ باندھا ہی کہ حضرت عباس جب میدان مین جانے لگے تو اپنے بیٹے کا

گریبان چاک کر دیا کہ یتیمی کی علامت ہی، یہ دیکھکر سکینہ (حضرت امام حسین علیہ السلام کی صاحبزادی) نے کہا کہ میرے کرتہ کا گریبان بھی چاک کر دو، مجکو بھی یہ وضع اچھی معلوم ہوتی ہی، حضرت عباسؓ نے اس خیال سے کہ آخر حضرت امام حسین بھی پھر دیر مین شہید ہون گے اور حضرت سکینہؓ بھی یتیم ہو جائنگی اس لیے اُن کا گریبان بھی چاک کر دیا حضرت عباسؓ کو امام علیہ السلام سے جو عشقیہ محبت تھی اور جسکا اظہار ہر جگہ مرزا صاحب نے بھی کیا ہی اسکے لحاظ سے یہ امر نہایت خلاف عقل اور خلاف عادت ہی کہ وہ حضرت امام حسینؑ کو قبل از وقت شہید فرض کر لین اس بنا پر اُن کے بچہ کو یتیم فرض کر کے اُس کا گریبان چاک کر دین۔

مثال ۳۔ ۵

یہ کہتی تھی کہ آئی قرین بنت مرتضےٰ زینبؓ پکاری میٹھو ادب میرا ہو چکا	تسلیم کر کے بانو نے سر کو جھکا لیا جبکی نہ بات پوچھیے، تعظیم اسکی کیا

سب جانتے ہین بنت جناب امیرؑ ہون
گھر مین تمھارے رہتی ہون اس سے حقیر ہون

حضرت زینبؓ کو اس بات کی شکایت ہی کہ علی اکبرؑ کو شہر بانوؑ نے بغیر میری اطلاع کے لڑائی مین جانے کی کیون اجازت دی، اس بنا پر وہ حضرت شہر بانوؑ سے کہتی ہین کہ جب میری بات نہین پوچھی جاتی تو تعظیم سے کیا فائدہ۔

لیکن اس مقصد کے اظہار کے لیے مرزا صاحب نے جو طریقہ اختیار کیا، وہ کسقدر سفیہانہ اور عامیانہ ہی، یہ خیال کہ چونکہ مین اپنا گھر چھوڑ کر تمھارے گھر مین رہتی ہون اس لیے تم لوگ مجکو حقیر سمجھتے ہو، نہایت پست اور مبتذل خیال ہی جو ہرگز حضرت زینبؓ کی متانت اور وقار کے شایان نہین۔

مثال ۴۔

محبوب ہون خدکے ذوی الاحترام کا — نانا ہون مین حسین علیہ السلام کا

یہ شعر جناب رسول خدا کی زبان سے ادا کیا ہے، لیکن مرزا صاحب کو یہ خیال نہین رہا کہ آنحضرتؐ بھی امام حسین علیہ السلام کا نام علیہ السلام کہہ کر لیتے تھے۔

مثال ۵، ؎

یہ بات سنکے بنتِ حسن نے گھونگٹ الٹ لیا — عباسؑ کو، حسینؑ کو، اکبرؑ کو، دی صدا
صدقہ مین تم یہان سے سرک جاؤ اک ذرا — تم سب کے آگے روتے ہوئے آئے گی حیا

ماتم کا ہے ہجوم دلِ پاش پاش پر
جی بھر کے روئے یہ بنتِ قاسم کی لاش پر

سرکے وہان سے اکبرؑ و عباسؑ و شاہِ دین — لاشہ کے گرد پھرنے لگی وہ دلھن حزین
زینبؑ سے پوچھنے لگی پھر وہ مہ جبین — اب اختیار دل پہ مرے مطلقاً نہیں

نوشاہ ایک رات کے جو قتل ہوتے ہیں
بتلاؤ اے پھوپھی! انھین کیا کہکے روتے ہیں

یہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ مرزا صاحب اور دیگر تمام مرثیہ گویون نے اہل حرم کی عادات اور مراسم، ہندوستان کے شرفا کی مستورات کے مطابق فرض کیے ہین چنانچہ عروسی، شادی اور میت کے متعلق جس قسم کے مراسم و عادات یہان ہین وہی تمام مرثیون مین مذکور ہین۔ اس بنا پر حضرت کبریٰ کا اپنے باپ، چچا، اور بھائی سے یہ کہنا کہ تم لوگ یہان سے سرک جاؤ مین اپنے شوہر پر نوحہ کرنا چاہتی ہون کسقدر بیحجابی اور بے شرمی ہے طرہ یہ کہ یہ بھی کہتی ہین کہ تم کو سب کے آگے روتے ہوے شرم آئے گی لیکن یہ کہتے ہوے شرم نہ آئی۔ مرزا صاحب نے اسی واقعہ کو ایک اور مرثیہ مین لکھا ہے اور وہان تو حد کر دی ہے، فرماتے ہین ؎

ناگاہ شہ نے لاش اُٹھائی بصد بکا — کبریٰ نے ہاتھ باندھکے تب شاہ سے کہا

ہم کچھ کہیں جو مانیے اے شاہ کربلا — احسان ہوگا لاش کو دکھلا دیجیے ذرا

بالیں پہ بیٹھیں سر پہ ذرا خاک ڈال لیں
ہم بھی کچھ اپنے دل کی تمنا نکال لیں

میر انیس نے اسی واقعہ کو کس خوبی سے ادا کیا ہے

رو کر بہن سے کہنے لگے شاہ بحر و بر — اس بے نصیب انڈ کو لے آؤ لاش پر
بیٹی لٹی گی یوں ہمیں اس کی نہ تھی خبر — اب شرم کیا ہے دیکھ لے دولھا کو اک نظر

زخمی بھی ہے شہید بھی ہے بے پدر بھی ہے
دولھا ہے نام کو بھی چچا کا پسر بھی ہے

اس بلاغت کو دیکھو کہ چونکہ حضرت امام حسین کا بھی یہ کہنا کہ اب شرم کیا ہے دولھا کو دیکھ لے، ایک گونہ رسمی حیا کے خلاف تھا اس لیے ان کی زبان سے یہ الفاظ ادا کیے کہ وہ برائے نام دولھا ہے ورنہ چچا کا بیٹا اور بھائی ہے

حضرت یہ کہکے ہٹ گئے باچشم اشکبار — لیٹی یہ سر کہ غش ہوئی بانوے دلفگار
چادر سپید اڑھا کے دولھن کو بحال زار — گودی میں لائی زینب غمگین و سوگوار

چلائی ماں یہ گر کے تن پاش پاش پر
قاسم اٹھو دولھن آئی ہے لاش پر

سہمے سہمے قاسم کا ہوا شور جو در پر — بانو نے کہا لٹ گئی لوگو! مری دختر
فرزند کے لاشے سے لپٹنے لگی مادر — سر پیٹتی دوڑی شہ مظلوم کی خواہر

پھر کون رہے سنت علی جب نکل آئے
خیمہ میں دولھن رہ گئی اور سب نکل آئے

مثال (۶)

کہا سجاد سے کبری نے یہ اس دم رو رو — بھائی صاحب مرے دولھا کو بھی اب دفن کرو

تا مجاور مین بہن کھول کے اپنے سر کو	کہا کبریٰ سے یہ سجادِ حزین نے کہ چلو

ٹکڑے لاشون کے بہم بادلِ غمناک کرین
قاسم ابن حسن کو بھی تہ خاک کرین

ایک رات کی بیاہی ہوئی عورت کا اپنے بھائی سے یہ کہنا کہ میرے دولہا کو بھی دفن کرو، کس قدر خلاف عادت ہے۔

مثال ۷ حضرت سکینہؑ کو قید خانہ مین غش آگیا ہے اُن کی ماں حضرت شہربانو کو خیال ہوا کہ مرگئین اُنھون نے نوحہ شروع کیا۔ حضرت زینبؑ اُن کو سمجھاتی ہین۔ اس واقعہ کو مرزا صاحب اس طرح ادا کرتے ہین ؎

زینبؑ نے رو کے بانوے مغموم سے کہا	بے آس ہو نہ بھابی ہے غش مین یہ مہ لقا
اور مرگئی تو خیر جو اللہ کی رضا	اب اس کے رفع غش کی یہ اسوقت ہے دوا

ہے عاشق حسین یہ پیاری حسینؑ کی
اب غل کرو کہ آئی سواری حسینؑ کی

تسکین اور تسلی دینے مین یہ کہنا کہ "خیر مرگئی تو کیا کروگی جو اللہ کی رضا"، کسقدر ناموزون ہے اور خلاف آدمیت ہے،

یہان ہم نے اجمالاً صرف چند مثالین لکھدین اسکے بعد متحد المضمون مرثیے کا جو عنوان ہے اُس سے تفصیلاً معلوم ہوگا کہ مرزا صاحب بلاغت کی راہوں سے کسقدر ناآشنا ہین۔

میر انیس اور مرزا دبیر کے متحد المضمون مرثیے

میر انیس اور مرزا دبیر کے موازنہ کا صحیح تر اور آسان طریقہ یہ ہو کہ دونون صاحبون کے ہم مضمون مرثیون کا مقابلہ کیا جائے' چونکہ مرثیہ کا موضوع صرف چند معین واقعات ہین اس لیے اگرچہ دونون صاحبون کا انداز شاعری بالکل الگ الگ ہو' تاہم واقعات' اور مضامین مین ہر جگہ اشتراک پیدا ہو جاتا ہو' اس کے ساتھ یہ بھی نظر آتا ہو کہ دونون حریفون نے اکثر مرثیے ، اور بند، اور متفرق اشعار ایک دوسرے کے مقابلہ مین لکھے ہین' یہانتک کہ بعض بعض بندون مین مضمون' ردیف، اور قافیے تک مشترک ہین' افسوس کہ ان مرثیون پر یہ پتہ نہین چل سکا کہ ابتدا' کس نے کی' اور جواب کس نے لکھا' تاہم بعض بعض قرائن سے (جیسا کہ ہم دیباچہ مین لکھ آئے ہین) ثابت ہوتا ہو کہ مرزا دبیر صاحب زیادہ تر مقابلہ کا قصد کرتے تھے' مثلاً ایک مرثیہ مین میر انیس نے فخریہ کے ساتھ زمانہ کی ناقدری کی شکایت کی تھی' اُس کے ایک بند کی ٹیپ یہ ہو ؎

اس عہد مین سب کچھ ہو پر انصاف نہین ہو		عالم ہو مکدر کوئی دل صاف نہین ہو

اسی بحر مین مرزا دبیر صاحب کا بھی مرثیہ ہو' اسمین بھی فخریہ ہو' اور ایک بند کی ٹیپ یہ ہو ؎

انصاف ہو کسطرح کہ دل صاف نہین ہو		دل صاف ہو کسطرح کہ انصاف نہین ہو

دونون شعرون کو دیکھکر' ہر شخص فیصلہ کر سکتا ہو کہ کس نے کس کا جواب لکھا ہو۔

میر انیس اکثر شعرون مین مرزا دبیر پر سرقہ اور خوشہ چینی کی چوٹ کرتے ہین ؎

خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینون کو		لگا رہا ہون مضامین نو کے پھر انبار

ع پیاسا ہو آپیو سبیل ہو نذر حسینؑ کی ؎

سچ ہو کہ مگس سے کب شکر بچتی ہے		ممکن نہین دزدان معانی سے نجات

بھلا تردد بیجا سے اسمین کیا حاصل — اُٹھا چکے ہین زمیندار جن زمینون کو

لوا سنجون نے تری اے انیس — ولہ — ہر اک زاغ کو خوش بیان کر دیا

ع مضمون انیس کا نہ جربا اُترا

لیکن مرزا دبیر نے میر انیس پر کہین سرقہ کی تعریض نہین کی ہی بلکہ صرف اپنی براءت ظاہر کی ہی مثلاً

واللہ بری ہون سرقۂ مضمون غیر سے — ہے استفادہ مجکو احادیث دبیر سے

شکر خدا کہ سرقہ کی حد سے بعید ہون — ہر مرثیہ مین موجد طرز جدید ہون

بہر حال کم سے کم ہم کو یہ فرض کرکے کہ دونون مین سے کوئی سرقہ کا مجرم نہین صرف یہ دیکھنا چاہیے کہ اس مضمون کو کس نے خوبی سے ادا کیا ہی چنانچہ ہم دونون کے متحد المضمون مرثیے اور اشعار ذیل مین درج کرتے ہین۔

پردہ کا اہتمام

بیت الشرف خاص سے نکلے شہ ابرار — انیس — روتے ہوے ڈیوڑھی پہ گئے عترت اطہار

فراشون کو عباس پکارے یہ بہ تکرار — پردہ کی قناتون سے خبردار خبردار

باہر حرم آتے ہین رسول دوسرا کے

شق کوئی جھک جائے جھونکون سے ہوا کے

لڑکا بھی جو کوٹھے پہ چڑھا ہو وہ اُتر جائے — آتا ہو ادھر جو وہ اُسی جا پہ ٹھہر جائے

ناقہ پہ بھی کوئی نہ برابر سے گذر جائے — دیتے رہو آواز جہان تک کہ نظر جائے

مریم سے سوا جن نے شرف ان کو دیے ہین

افلاک پہ آنکھون کو ملک بند کیے ہین

دربان عصا اُٹھا کے بڑھے جانب یسار — دبیر — دہنی طرف نقیب گئے باندھ کر قطار

آ آ کے در پہ لونڈیان چلائین بار بار — آئے ادھر نہ اب نہ کوئی جائے ہوشیار

آواز غیر سُن کے وہ اندیشہ کرتی ہے
آہستہ بولو دختر زہرا آتی ہے

عفت ہے کے جتنے مرتبے خیر النسا نے پائے
ان بان مسافروں کوئی غل مچانے پائے

وہ ماں کے بعد دختر مشکل کشا نے پائے
ناقہ پہ بیٹھکر نہ ادھر کوئی آنے پائے

حُسن ادب یہی ہے کہ حق کو پسند ہو
وہ بیٹھ جائے جسکا کہ قامت بلند ہو

دونوں بزرگوں نے عورتوں کے پردہ کے اہتمام کا سمان باندھا ہے لیکن میر صاحب نے اس مضمون کو اس فصاحت و بلاغت سے ادا کیا ہے اور اسطرح واقعہ کی تصویر کھینچدی ہے کہ اسکے سامنے مرزا صاحب کے اشعار کا پیش کرنا بھی میر صاحب کی ناقدردانی ہے۔ روانی شستگی خوبی محاورہ چستی بندش کے علاوہ بلاغت کے نکتوں پر لحاظ کرو، میر صاحب نے پردہ کے اہتمام اور لوگوں کے ہٹانے اور روکنے کو حضرت عباس ع کی طرف منسوب کیا ہے جس سے حضرت زینب کی عظمت و شان کے اظہار کے علاوہ، اصلی واقعہ کی مطابقت ہوتی ہے، کیونکہ تمام معزز خاندانوں میں پردہ کا اہتمام خود خاندان کے ممبر کیا کرتے ہیں بخلاف اسکے مرزا صاحب نے یہ کام بالکل دربانوں، نقیبوں، اور لونڈیوں کے سپرد کر دیا ہے جس سے بظاہر مفہوم ہوتا ہے کہ یا تو گھر میں کوئی مرد تھا ہی نہیں، یا تھا تو اسکو عورتوں کی چنداں پروا نہ تھی، پردہ کے اہتمام میں نقیبوں کا کیا کام ہے، لونڈیوں کے غل مچانے سے ثابت ہوتا ہے کہ ادب و شائستگی نہیں پائی جاتی۔

ذیل کے یہ دونوں مصرعے بالکل ہم مضمون ہیں لیکن دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے ؎

انیس ناقہ پہ بھی کوئی نہ برابر سے گذر جائے۔

دبیر ناقہ پہ بیٹھ کر نہ ادھر کوئی آنے پائے۔

صغریٰؑ کی آرزو

صغریٰؑ نے کہا صاحبو کیا کرتے ہو گفتار
شاید کہ سفر ہی میں شفا دے مجھے غفار

دبیر: اک بات پکڑ لی کہ یہ بیمار ہے بیمار
ہاں کون خبر لے گا مری کا یہ در و دیوار

اتنی بھی تو طاقت نہیں جو اُٹھ کے کھڑی ہوں
اے لوگو! میں کیا آپ سے بیمار پڑی ہوں

واقعہ یہ ہے کہ حضرت امام حسین علیہ السلام، تمام اہل حرم کو ساتھ لیے جاتے ہیں لیکن حضرت صغریٰ کو بیمار ہونے کی وجہ سے چھوڑے جاتے ہیں۔ اس پر وہ گریہ وزاری کرتی ہیں حضرت امام حسینؑ اور گھر کی عورتیں سمجھاتی ہیں کہ تم بیمار ہو، سفر کے مصائب برداشت نہیں کر سکتی ہو صغراؑ جواب دیتی ہیں۔ اسی مضمون کو میر انیس صاحب ادا کرتے ہیں سے

کیا خلق میں لوگو! کوئی ہوتا نہیں بیمار
زندہ ہوں پہ مردہ کی طرح ہو گئی دشوار

ہے کون سی تقصیر کہ سب ہو گئے بیزار
کیوں بھاگتے ہیں سب مجھے ہے کون سا آزار

حیرت میں ہوں باعث مجھے کھلتا نہیں اس کا
وہ آنکھ چرا لیتا ہے منہ تکتی ہوں جس کا

مرزا صاحب نے بھی عمدگی سے اس واقعہ کو ادا کیا ہے لیکن میر صاحب کے طرز بیان میں جو حسرت رنج اور بیکسی ہے وہ مرزا صاحب کے ہاں نہیں۔ "اک بات پکڑ لی" عامیانہ اور سوقیانہ طرز گفتگو ہے، شعر کے دونوں مصرعوں میں کوئی ربط نہیں، اور یہ کہنا کہ مجھ کو اُٹھنے کی بھی طاقت نہیں صغراؑ کی خواہش پر ناکامی کا اثر پیدا کرتا ہے کیونکہ جب اُٹھنے کی طاقت نہیں تو وہ سفر کیونکر کر سکتی ہیں،

اسی بنا پر میر انیس نے جہاں یہ واقعہ باندھا ہے صغریٰؑ کی زبان سے یہ کہا ہے سے

قربان گئی اب تو بہت کم ہے نقاہت
بستر سے میں خود اُٹھ کے ٹہلتی بھی ہوں حضرت

تپ کی بھی ہے شدت میں کمی درد سری رخصت
پانی کی بھی خواہش ہے غذا کی بھی ہے رغبت

١

حضرت کی دعا سے مجھے صحت کا یقین ہے
اب تو مرے منھ کا بھی مزا تلخ نہیں ہے

دیکھو حضرت صغراؑ کس طرح سے بیماری کی تخفیف اور قریب الصحت ہونیکو ثابت کرتی ہیں

اصغرؑ سے خطاب

دبیر

پردہ کو اُٹھا کر یہ کہا بانو نے رو رو — صدقے گئی، فال ایسی تو منہ سے نہ نکالو
سب جیتے ہیں بیکس ابھی آپ کو سمجھو — شبیر ہو، دنیا ہو، ترا کنبہ ہو، تو ہو

کب میں نے کہا یہ نہیں اصغرؑ ہے تمھارا
لو شوق سے دیکھو یہ برادر ہے تمھارا

پھر انھوں نے اصغرؑ کو رکھا کر کے یہ زاری — لٹکا دیے ہاتھ اس نے ہمک کر کئی باری
ماں نے کہا لو گود میں یہ آتے ہیں واری — اصغرؑ کی طرف ہاتھ اُٹھا کر وہ پکاری

پھر جیتی ملوں یا نہ ملوں تجھ سے بلا لوں
آ چھوٹے مسافر تجھے چھاتی سے لگا لوں

صغراؑ کا رخصت کے وقت علی اصغر کو حسرت اور پیار سے دیکھنا نہایت دردانگیز سمان ہی، اور اکثر مرثیوں میں یہ سمان نہایت موثر طریقہ سے دکھایا جاتا ہی لیکن مرزا صاحب ایسے دردانگیز واقعہ کو بھی تیز کا رنگ نہ دے سکے دیکھو میر صاحب، اسی بات کو کس لہجہ سے ادا کرتے ہیں ؎

ماں بولی یہ کیا کہتی ہے صغرا ترے قرباں — گھبرا کے نہ اب تن سے نکل جائے مری جاں
بیکس مری بچی ترا اللہ نگہباں — صحت ہو تجھے میری دعا ہے یہی ہر آں

کیا بھائی جدا ہوتے ہیں سر ہوتے نہیں بیٹا
کنبہ کے لیے جان کو کھوتے نہیں بیٹا

میں صدقے گئی بس نہ کرو گریہ و زاری — اصغرؑ مرا روتا ہے صدا سن کے تمھاری

وہ کانپتے ہاتھوں کو اٹھا کر یہ پکاری
آ مرے ننھے سے مسافر ترے واری

چھٹتی ہے یہ بیمار بہن جان سے گئے تم
اصغر مری آواز کو پہچان گئے تم

تم جاتے ہو اور ساتھ بہن جا نہیں سکتی
جو دل میں ہے لب پر وہ سخن لا نہیں سکتی

سچ ہے تمہیں چھاتی سے بھی لپٹا نہیں سکتی
رکھ لوں تمہیں اماں کو بھی سمجھا نہیں سکتی

بیکس ہوں مرا کوئی مددگار نہیں ہے
تم ہو سو تمہیں طاقت گفتار نہیں ہے

اس واقعہ کا نہایت درد انگیز ہونا، صغرا سے بے تاب ہونا، اور جوش محبت میں چھ مہینے کے بچے سے اپنا درد دل کہنا تھا، مرزا صاحب صرف یہ کہکر رہ گئے ع آ چھوٹے مسافر تجھے چھاتی سے لگا لوں، میر صاحب نے پورا درد دل کہا، اور کس موثر طریقہ سے کہا، مرزا صاحب کا یہ مصرع اصغر کی طرف ہاتھ اٹھا کر وہ پکاری، میر صاحب کے اس مصرعے کے جواب میں ہے ع وہ کانپتے ہاتھوں کو اٹھا کر یہ پکاری،
لیکن دونوں میں کوئی نسبت نہیں، میر صاحب نے ہاتھ کے ساتھ کانپنے کی قید نے کسقدر بلاغت پیدا کردی ہے، ذیل کے ان دونوں مصرعوں میں بھی زمین آسمان کا فرق ہے،

ع آ مرے ننھے سے مسافر ترے واری۔

ع آ چھوٹے مسافر تجھے چھاتی سے لگا لوں" "چھوٹا مسافر" مرزا صاحب کا ایجاد ہے،

اعلیٰ وادنیٰ کا مقابلہ

کچھ خار مغیلاں گل تر ہو نہیں جاتا
ہر قطرۂ ناچیز گہر ہو نہیں جاتا

قلعی سے کچھ آئینہ قمر ہو نہیں جاتا
مس پر جو ملمع ہو تو زر ہو نہیں جاتا

جس پاس عصا ہو اسے موسیٰ نہیں کہتے
ہر ہاتھ کو عاقل ید بیضا نہیں کہتے

میرانیس کا یہ مشہور بند ہی مرزا صاحب نے اسکے جواب میں بڑی کوشش کی مختلف بحرین اختیار کین بہت سی نئی نئی تشبیہین ڈھونڈھین لیکن وہ بات پیدا نہ ہو سکی، مرزا صاحب فرماتے ہین ؎

انجام نمرود اور ہی اور ابتدا اور
نمرود کی آگ اور ہی اور آتش طور اور

باطل کی نمود اور ہی اور حق کا ظہور اور
زنبور کا غل اور ہی الحان زبور اور

تجھ تو سہی تم کو بشر کیا ہے ملک کیا
بت کیا ہی خدا کیا ہی زمین کیا ہی فلک کیا

سامان سے کوئی صاحب یان نہیں ہوتا
پہنے جو انگوٹھی وہ سلیمان نہیں ہوتا

ہر اہل عصا موسی عمران نہیں ہوتا
آئینہ گر، سکندر دوران نہیں ہوتا

لاکھ اوج ہو پشہ کا ہما ہو نہیں جاتا
بُت سجدۂ کافر سے خدا ہو نہیں جاتا

یہ تشبیہات کافی نہ ہوئین تو ایک اور مرثیہ مین بہت سی تشبیہین جمع کین ہے ؎

ہر سبز پوش خضر نہین عز و جاہ میں
یوسف نہ ہوگا لاکھ گرے کوئی چاہ میں

سر سبز حیدری ہین جناب الٰہ میں
دن رات کا ہی فرق سفید و سیاہ مین

کوئی یتیم فاطمہ سا خوش گہر نہیں
ہر اک یتیم در یتیم اے عمر نہیں

چاہے زرہ بنا کے جو داؤد کا وقار
ہر بخیہ گر نہ ہوا کبھی ادریس نامدار

واللہ جبل ساز ہی کیا اس کا اعتبار
ہر نا خدا کو نوح کہے گا نہ ہوشیار

کیا جاہلون سے عیش کا سامان ہو گیا
بیٹھا جو تخت پر وہ سلیمان ہو گیا

حر کا واقعہ حر پہلے یزید کی طرف تھا لیکن خدا نے ہدایت دی اور معرکۂ جنگ شروع

ہونے سے پہلے، وہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی فوج مین چلا آیا، اس کا آنا معافی کا خواستگار ہونا، لڑنے کی اجازت طلب کرنا، زخمی ہو کر گرنا، امام علیہ السلام کا اُس کے پاس جانا، اُس کا انتقال کرنا، یہ واقعات اکثر مرثیون مین دونون نے لکھے ہین لیکن ایک مرثیہ مین بحر اور اکثر قافیے تک مشترک ہین، ان دونون مرثیون کے مقابلہ کرنے سے، دونون حریفون کے مدارج کا پورا اندازہ ہو جاتا ہے

مرزا دبیر

لہکے یہ گھوڑون پہ غازی ہوے دونون اسوار
اور چلے شاہ کی جانب کو بڑھا کر رہوار
پہونچے نزدیک شہ دین تو پکارا جرّار
بخشدے جرم شہنشاہ نجف کے دلدار
روے الطاف کو ہم سے نہ پھرانا آقا
نہین اس در کے سوا کوئی ٹھکانا آقا

انیس

ذکر یہ تھا کہ صدا دور سے آئی اک بار
الغیاث اے جگر و جان رسول مختار
مجرم ایسا ہون کہ عصیان کے نہین جسکے شمار
عفو کر عفو کر اے چشمۂ فیض غفار
پار دریاے خطا سے مری کشتی ہو جائے
دوزخی بھی ترے صدقے سے بہشتی ہو جائے

دبیر

واسطہ احمدؐ و زہراؑ و حسنؑ کا اے شاہ
عذر سر لایا ہون، مقبول ہو اے عرش پناہ
بخشدو عفو کرو، بندۂ عاصی کا گناہ
اور بتاؤ مرے بیٹے کو بھی فردوس کی راہ
حُر عوض آپ کے مقتول جفا ہوئے گا
اور اکبرؑ پہ مرا لال فدا ہوئے گا

انیس

کس روز دن سے تلاطم مین ہون اے شاہنشاہ
دست و پا گم ہین کچھ ایسے کہ نہین سوجھتی راہ
مددے نوح غریبان مرا بیڑا ہے تباہ
شور کرتا ہون کہ بتلاے کوئی جاے پناہ
ابر رحمت کی طرف جا یہ صدا دیتے ہیں
سب ترے دامن دولت کا پتہ دیتے ہیں

پیشوائی کو چلے حُر کے شہنشاہِ زمن
کانپ کر یاشہ نے مبارک یہ تحفہ سرافگن

دبیر

بات ٹھوڑے پسرِ عقدہ کشا نے فوراً
سر اٹھا کر کیا سرور نے یہ بھائی سے سخن

سرِ حُر پہ ہے خالق کے کرم کا سایا
آن کر تم بھی کرو اس پہ علم کا سایا

استغاثہ یہ کیا حُر نے جو بادیدۂ نم
خود بڑھے ہاتھوں کو پھیلا کے شہنشاہ امم

انیس

جوش میں آگیا اللہ کا دریائے کرم
حُر کو یہ ہاتفِ غیبی نے صدا دی اسدم

شکر کر سبطِ رسول الثقلین آتے ہیں
اے برادر ترے لینے کو حسینؑ آتے ہیں

حُر نے دیکھا کہ چلے آتے ہیں پیدل شبیرؑ
شہ نے چھاتی سے لگا کر کہا اے باتوقیر

دوڑ کر چوم لیے پائے شہِ عرش سریر
میں نے بخشی ہے اللہ نے بخشی تقصیر

میں رضامند ہوں کس واسطے مضطر ہے تو
مجکو عباسؑ دلاور کے برابر ہے تو

حُر نے فرزندِ پیمبر سے یہ اسوقت کہا
آپ کی بندہ نوازی پہ فدا اے آقا

دبیر

سایۂ دامنِ رایت تو ہے ظلِ طوبیٰ
رُخ کیا جب سر ادھر کا یہ ہے الطافِ خدا!

مرحبا فاطمہ زہراؑ مجھے فرماتی ہیں
سایہ چادر کا مرے سر پہ کیے آتی ہیں

حُر پکارا بابی انت وامی یا شاہ
مجھ سے گمراہ کو کس آن میں لمجائے یہ راہ

انیس

قابلِ عفو نہ تھے بندۂ آثم کے گناہ
سب ہے صدقہ تعلین قدموں کا خدا ہے آگاہ

مہر ذرہ پہ جو ہو نیرِ تاباں ہو جائے
آپ جس مور کو چاہیں وہ سلیماں ہو جائے

عرض کی پھر شہ والا سے بجوشِ رقت

دبیر

کرنے میں دشمنِ دین جنگ پہ ساد سبقت

عفو تقصیر ہوئی اب ہو عنایت رخصت | | دیکھنے کی نہیں بندی میں ذرا اب طاقت

گر رضا پائے تو سر اپنا کٹائے فدوی
زخم شمشیر و سناں سینہ پہ کھائے فدوی

انیس

لاسا بس عزت و حرمت سے جو مہماں کو امام
شہ نے فرمایا مناسب ہے کوئی دم آرام
بولے عباس کمر کھول اب اے نیک انجام
عرض کی حر نے کمر خلد میں کھولے گا غلام

فاتحہ پڑھ کے یہ شمشیر و سپر باندھی ہے
آج اس عزم پہ خادم نے کمر باندھی ہے

ہے بہت شمر و عمرو سے مجھے لڑنے کی امنگ
لشکر شام سے پیہم چلے آتے ہیں خدنگ
ایک ہی وار میں دونوں کو کروں گا چورنگ
شاہزادوں کی نہ سپر ہوں کہ عبادت ہے یہ جنگ

کہیں ایسا نہ ہو تجھ کو کوئی ہیجان ہو جائے
پہلے یہ تازہ غلام آپ پہ قربان ہو جائے

دبیر

پسر حر کے معین علی اکبر تھے کہ واہ
دونوں تسلیم کناں حضرت غازی تھے بجاہ
حر کو دیتے تھے صدا شاہ کہ سبحان اللہ
مژدہ گلشن جنت انہیں پہنچا ناگاہ

دونوں یک مرتبہ بیزار ہوئے جینے سے
نیزہ ظلم و ستم پار ہوئے سینے سے

انیس

بڑھ کے فرماتے تھے عباس زہے عزت و جاہ
کہتے تھے ابن حسن واہ حر غازی واہ
بارک اللہ کی دیتا تھا صدا دلبر شاہ
شاہ ہر ضرب پہ فرماتے تھے سبحان اللہ

اپنی جانبازی کا غازی جو صلہ پاتا تھا
مسکراتا ہوا تسلیم کو جھک جاتا تھا

دبیر

اس گھڑی فاطمہ کے لال سے حر نے یہ کہا
شبر حق میرے سرہانے ہیں کھڑے سامنے مولا
آپ کے صدقے سے یہ رتبہ ہوا خادم کا
جام کوثر لیے کھڑے ہیں بصد لطف و عطا

لے اسے پی کہ بہت تشنہ دہن ہو ای حُر
جلد آ دیکھ یہ جنت کا چمن ہے ای حُر

ان سے میں عرض یہ کرتا ہوں کہ ای شاہ زمان
صبح سے جھولے میں بیہوش ہے اصغر ناداں

پسر فاطمہ پیاسا ہی مجھے پیاس کہاں
تشنہ لب ہو گئی دن سے علی اکبر سا جواں

پیاسا ہوں اسپہ بھی پانی نہ پیوں گا مولا
جام کوثر نہ میں آقا کے پیوں گا مولا

نیم وا چشم سے حُر نے رُخ مولا دیکھا
مسکرا کر طرف عالم بالا دیکھا

انیس

زیر سر زانوے شبیر کا تکیہ دیکھا
شہ نے فرمایا کہ اے حُر تری کیا دیکھا

عرض کی حُسن رُخ حور نظر آتا ہے
فرش سے عرش تلک نور نظر آتا ہے

مجکو لینے چلے آتے ہیں فرشتے یا شاہ
خلد سے شیر خدا نکلے ہیں اللہ اللہ

ملک الموت بھی کرتا ہے محبت کی نگاہ
لو بر آمد ہوے شبر بھی پدر کے ہمراہ

سنگ سے احمد مختار کی پیاری آئی
دیکھیے آپ کے نانا کی سواری آئی

مڑ کے عباس دلاور کو پکارے سرور
گئے عباس ادھر یاں ہوا برپا محشر

روک تو تم کر سکیے! چلی آتی ہے ادھر
حُر بھی فرزند بھی حُر کا ہوا گویا ردکر

نعش پہ غش تشنہ دہانی کے سبب آتے ہیں
الفراق اب چمن خلد کو ہم جاتے ہیں

قبلہ رو کیجیے لاشہ مرا اے قبلۂ دیں
کوچ نزدیک ہے اے بادشہ عرش نشیں

پڑھیے یٰسین کہ اب ہے یہ دم بازپسیں
لیجیے تن سے نکلتی ہے مری جان حزیں

بات بھی اب تو زبان سے نہیں کیجاتی ہے
کچھ اٹھا دیجیے مولا مجھے نیند آتی ہے

کہہ کے یہ گود میں شبیرؑ کے لی انگڑائی — آیا ماتھے پہ عرق چہرہ پہ زردی چھائی
شہ نے فرمایا ہمیں چھوڑ چلے کیوں بھائی — چل بسے حرؑ جری پھر نہ کچھ آواز آئی

طائرِ روح نے پرواز کی طوبیٰ کی طرف
بلبلیں رہ گئیں پھر کر شجرِ والا کی طرف

میر انیس کے اشعار میں بلاغت کی جو باریکیاں اور دقیقے ہیں ان سے ہم اس موقع پر بحث نہیں کرتے، یہاں صرف یہ دکھانا ہے کہ حسنِ بندش سے کلام میں کس قدر صفائی، برجستگی اور زور پیدا ہو جاتا ہے۔

قیدخانہ کے واقعات

قیدخانہ کا حال اور ہند کے آنے کا واقعہ دونوں نے لکھا ہے اور ایک بحر میں لکھا ہے، میر انیس کا مطلع ہے، مصرع جب قیدیوں کو خانۂ زنداں میں شب آئی
اور مرزا صاحب کا مطلع ہے، مصرع جب قیدیوں کو راہ میں ماہ صفر ہوا۔
میر انیس نے تفصیلی حالات نہایت مؤثر پیرایہ میں لکھے ہیں، مرزا صاحب کے ہاں صرف ۳۶ بند ہیں لیکن بعض مضامین مشترک ہیں وہ ملاحظہ ہوں ؎

دبیر
راوی نے حال خانۂ زنداں ہے یوں لکھا — وحشت میں مثل قبر اور آفت میں کربلا
آئی جو شب اسیروں کو صدمہ بڑا ہوا — نہ فرش تھا نہ سایہ تھا نہ پانی نہ غذا

شمعوں کی روشنی نہ چراغوں کی روشنی
بس ماتمِ حسینؑ کے داغوں کی روشنی

انیس
کیجیے شکستگی خرابہ کا کیا بیاں — ثابت نہ جس میں سقف نہ در اور نہ سائبان
وحشت کا گھر ہراس کی جا خوف کا مکاں — وہ شب کہ الحذر وہ اندھیرا کہ الاماں

ظلمت سرائے گور تھی زنداں کا گھر نہ تھا
حجرے یہ تنگ تھے کہ ہوا کا گذر نہ تھا

دبیر
ناگاہ شعلوں کی ہوئی روشنی نمود — اور غل ہوا کہ ہند کا زنداں میں ہے ورود

زینب کے دل پہ صدمہ سبھون سے ہوا فزود ۔ غیرت سے کانپنے لگی وہ خاصۂ ودود

سر زانوون کے بیچ مین شرما کے دھر لیا
اور بیڑیون کو خاک مین پوشیدہ کر لیا

بچون سے پھر یہ بولی وہ آفت کی مبتلا ۔ اب نام لیجو نہ مرا تم پہ مین فدا
ناگاہ آئی قیدیون مین ہند باوفا ۔ زنجیر پہنے دیکھ کے عابدؑ کو دی ندا

بیداد اہل ظلم سے یارب دُہائی ہے
اِس ناتوان کو آہ یہ بڑی بِپتا ئی ہے

نکلی محل سرا سے یہ کہکر وہ خوش سیر ۔ انیس ۔ تھین ساتھ ساتھ چند خواصین بھی نوحہ گر
پہونچی جناب حضرت زینبؑ کو یہ خبر ۔ رنگ اُڑ گیا یہ کہنے لگی سر کو پیٹ کر

اپنا نہین خیال بزرگون کا پاس ہے
ہی ہی کہان چھپون وہ مری روشناس ہے

ہے شرم کی جگہ کہ مین ہون خواہر امام ۔ غمگین و سوگوار و پریشان و تشنہ کام
ہم ہین فقیر ہم مین امیرن کا کیا ہی کام ۔ لوگو بتا نہ دیجو کہین اِس کو میرا نام

پوچھے جو وہ کسی سے کہ زینبؑ کدھر گئی
کہدیجیو کہ بھائی کے ہمراہ مر گئی

زینبؑ کو بھی سکوت کا یارا نہ پھر رہا ۔ دبیر ۔ بولے نہ ان سے پوچھ یہ زینبؑ کا ماجرا
کیا جانیے کہ بعد حسینؑ اسپہ کیا ہوا ۔ قدمون پہ ہند گر پڑی پہچان کر صدا

رو کر کہا قسم تمھے ربِ قدیر کی
زینبؑ تمھین ہو بیٹی جناب امیرؑ کی

یہ سُن کے ہند رونے لگی تب بہ اشک و آہ ۔ انیس ۔ پھر مُڑ کے روئے حضرت زینبؑ پہ کی نگاہ
مُنہ سے ہٹائے بال تو حالت ہوئی تباہ ۔ بیساختہ کہا کہ زہے قدرت اِلٰہ

ہرگز غلط نہین جو مجھے اشتباہ ہے
زینبؑ قسم ہو خالقِ اکبر گواہ ہے

میرانیس اور مرزا دبیر کے موازنہ مین عموماً میرانیس کی ترجیح ثابت ہوگی لیکن ہر کلیہ مین مستثنیٰ ہوتا ہی بعض موقعون پر مرزا دبیر صاحب نے جس بلاغت سے مضمون ادا کیا ہی میرانیس سے نہین ہوسکا چنانچہ ذیل کی مثال سے اسکی تصدیق ہوگی۔

حضرت علی اصغر کے لیے پانی مانگنا

واقعات کربلا مین یہ واقعہ نہایت دردانگیز ہی کہ تمام اعزہ کی شہادت کے بعد حضرت امام حسین علیہ السلام اپنے شیرخوار بچے (علی اصغرؑ) کو دشمنون کے سامنے لیجا کر اس بات کے ملتجی ہوے کہ یہ بچہ پیاس سے مرتا ہی اسکے گلے مین پانی کی ایک بوند ٹپکا دو۔ اس واقعہ کو میر ضمیر سے لیکر آج تک نئے نئے مؤثر پیرایون مین ادا کیا جاتا ہی میرانیس صاحب نے مختلف مرثیون مین یہ واقعہ لکھا ہی، اور ہر جگہ نیا پہلو اختیار کیا ہی ایک مرثیہ مین جو سب سے بہتر ہی فرماتے ہین ؎

بولے دکھا کے بچہ کو شاہِ فلک سریر — مرتا ہی پیاس سے یہ مرا کودکِ صغیر
پانی ملا ہی کل سے نہ ممکن ہوا ہی شیر — للہ اس غریب پہ کر رحم اے امیر

مہمان ہی کوئی آن کا ہونٹون پہ جان ہی
اس کا قصور کیا ہے کہ یہ بے زبان ہی

برپا ہی اہلبیت محمدؐ مین شور و شین — در پر کھڑی بلکتی ہی ماں کر رہی ہی بین
آنکھین پھرالے دیتا ہی اب تو یہ نورِ عین — لایا ہی اس عطش مین ترے پاس اب حسینؑ

تجھکو قسم ہی روحِ رسالت مآب کی
ٹپکا دے اسکے حلق مین اک بوند آب کی

لیکن مرزا دبیر صاحب نے اس واقعہ کے بیان مین جو بلاغت صرف

کی ہر اور جو دردانگیز سماں دکھایا ہے کسی سے آج تک نہ ہو سکا، فرمانے بین سے

ہر اک قدم پہ سوچتے تھے سبط مصطفےٰ دبیر — لے تو چلا ہوں فوج عمر و سے کہوں گا کیا
مانگنا ہی آتا ہے مجکو نہ التجا — منت بھی گر کروں گا تو کیا دینگے وہ بھلا

پانی کے واسطے نہ سنیں گے عدو مری
پیاسے کی جان جائے گی اور آبرو مری

پہونچے قریب فوج تو گھبرا کے رہ گئے — چاہا کریں سوال پہ شرما کے رہ گئے
غیرت سے رنگ فق ہوا تھرا کے رہ گئے — چادر پسر کے چہرہ سے سرکا کے رہ گئے

آنکھیں جھکا کے بولے کہ یہ ہم کو لائے ہیں
اصغر تمھارے پاس غرض لیکے آئے ہیں

گر میں بہ قول عمرو و شمر ہوں گناہگار — یہ تو نہیں کسی کے بھی آگے قصوردار
ششماہہ بے زبان بنی زادہ شیرخوار — ہشتم سے سب کے ساتھ یہ پیاسا ہے شیرخوار

رن ہے جو کم تو پیاس کا صدمہ زیادہ ہے
مظلوم خود ہے اور یہ مظلوم زادہ ہے

یہ کون بے زبان ہے تمھیں کچھ خیال ہے — ذریت ہے بانوئے بیکس کا لال ہے
لو بان لو تمھیں قسم ذوالجلال ہے — یثرب کے شاہزادے کا پہلا سوال ہے

پوتا علیؑ کا تم سے طلبگار آب ہے
دیدو کہ اس میں ناموری ہے ثواب ہے

پھر ہونٹ بے زبان کے چومے جھکا کے سر — رو کر کہا جو کہنا تھا وہ کہہ چکا پدر
باقی رہی نہ بات کوئی اسے مرے پسر — سوکھی زبان تم بھی دکھا دو نکال کر

پھیری زبان لبوں پہ جو اس نور عین نے
تھرا کے آسمان کو دیکھا حسینؑ نے

اسلوب بیان کی بلاغت کو دیکھو، امام علیہ السلام اصغر کو لیکر پانی مانگنے کو نکلے تو سہی لیکن غیرت کے اقتضا سے ہر قدم پر ٹھہر جاتے ہیں کہ سوال کیونکر کروں، اور کروں بھی تو نتیجہ کیا ہوگا، پھر فوج کے قریب پہونچکر سوال کرتے ہوئے شرمانا، تھرا کے رہجانا، اور سب سے بڑھکر بچہ کے چہرہ سے چادر سرکاکے رہ جانا، کسقدر قیامت انگیز سمان ہے، پھر سوال بھی کرتے ہیں تو علی اصغر پر رکھکر، کہ اصغر تمھارے پاس غرض لیکے آئے ہیں، واجب الرحم ہونے کی وجہیں کسقدر لاجواب ہیں اور سب ایک ہی مصرع میں ادا ہوگئی ہیں یعنی ششماہہ ہے بے زبان ہے، نبی زادہ ہے، شیر خوار ہے، ان سب پر قیامت یہ کہ جب سب کچھ کہہ چکے تو بچہ کی زبان حال سے بھی کہلوایا اور بچہ نے بھی کہہ دیا، کیونکہ بچہ پیاس کی شدت سے لبوں پر زبان پھیرا کرتا تھا اب بھی اُس نے ایسا ہی کیا گویہ زبان حال سے کہتا تھا

متحد المضمون اشعار

اس قسم کے اشعار بعض تو بالکل ہم مضمون ہیں، بعض اس قسم کے ہیں کہ ایک نے ایک خیال کو ادا کیا تھا، دوسرے نے اسکو ترقی دینا چاہا، بعض ایسے ہیں کہ صرف اصل واقعہ مشترک ہے اور دونوں کی طرز ادا الگ الگ ہے، چنانچہ ہم ہر قسم کی متعدد مثالیں نقل کرتے ہیں —

شعر: [illegible] گرم تھا پانی بہت ہر حباب پر	دبیر	ہوتی تھیں سیخ موج پہ مرغابیاں کباب
پانی تھا آگ گرمی روز حساب تھی	انیس	ماہی جو سیخ موج تک آئی کباب تھی

یہ مضمون دونوں کے ہاں مشترک ہے کہ گرمی کی شدت یہ تھی کہ موج سیخ بن گئی تھی اور جب کوئی جانور اسکے پاس جاتا تھا تو جلکر کباب ہوجاتا تھا، بندش اور الفاظ کی نشست میں جو فرق ہے وہ خود ظاہر ہے، لیکن معنوی حیثیت سے بھی میر انیس کا شعر بڑھا ہوا ہے،

میر انیس صاحب کے ہاں گرمی کا مبالغہ جو شعر کی جان ہے زیادہ پایا جاتا ہے یعنی یہ کہ مچھلی سیخ موج تک آنے کے ساتھ فوراً کباب ہوجاتی تھی، مرزا صاحب کے ہاں یہ بات نہیں پائی جاتی وہ کہتے ہیں کہ موج کی سیخ پہ مرغابیوں کا کباب لگایا جاتا ہے

اس سے فوراً غائب ہو جانے کا خیال نہین پیدا ہوتا ہے

چاہون تو بیٹھے بیٹھے اک انگلی سے زمین پر	دبیر	گردون کی ڈھال چیر کے رکھدون زمین پر
طاقت اگر دکھاؤن رسالت مآب کی	انیس	رکھدون زمین پہ چیر کے ڈھال آفتاب کی

مرزا صاحب کے شعر کا پہلا مصرع نہایت بدترکیب ہے، اسکے علاوہ ایک انگلی سے چیرنا نہین ہوتا بلکہ کھونچا دینا ہوتا ہے، ڈھال کی تشبیہ آفتاب سے بہ نسبت آسمان کے زیادہ موزون ہے

دہشت سے جوان بھاگتے تھے تیر کی مانند	دبیر	تھا نیزون کو رعشہ قدم پیر کی مانند

انیس چلنے مین نیزے کانپتے تھے مثل پاے پیر

میر صاحب کا مصرع زیادہ فصیح اور صاف ہے، ان الفاظ سے "کانپتے تھے" جو تصویر خیال مین کھنچ جاتی ہے وہ رعشہ کے لفظ سے پیدا نہین ہوتی سب سے بڑھکر یہ کہ جبتک چلنے کی قید نہ مذکور ہو، پوری تشبیہ نہین ہوتی کیونکہ بوڑھے آدمی کے پاؤن چلنے ہی کی حالت مین کانپتے ہین اسکے ساتھ چونکہ چلنے کا اطلاق پاؤن اور نیزہ دونون پر ہوتا ہے اس لیے یہ لفظ اس موقع پر نہایت موزون ہے، سب سے بڑھکر یہ کہ نیزہ چلانے کی حالت مین نیزہ کو لچک ہوتی ہے اس لیے اسکو کانپنے سے تعبیر کرسکتے ہین اور اس لحاظ سے یہ کہنا کہ نیزہ چلنے کی حالت مین خوف سے کانپتا تھا نہایت لطیف حسن التعلیل ہے۔ بخلاف اسکے مرزا صاحب نے چونکہ نیزہ کی جنبش اور حرکت کا ذکر نہین کیا اس لیے رعشہ کا کوئی ثبوت نہین ہوتا۔

دبیر سینا ئے ہات مل کے جلاجل کرا الاماں

انیس ہو گیا جوڑ کے ہاتون کو جلاجل خاموش۔

جلاجل کے دونون حصے جو بجانے مین ملجاتے ہین اسکی تعبیر دونون بزرگون نے دو طرح پر کی ہے مرزا صاحب کہتے ہین کہ جلاجل چلا کر الامان کہتا تھا اور ہاتھ ملتا تھا لیکن جلاجل کے ہاتھ ملنے سے کوئی تعلق نہین اس لیے گو تشبیہ صحیح ہے لیکن ہات ملنے کی کوئی توجیہ نہین ہو سکتی میر صاحب کہتے ہین کہ حضرت امام حسینؑ کا رعب اس قدر

غالب ہوا کہ جلاجل ہات جوڑ کے چپ ہوگیا، رعب اور خوف کی حالت مین ہات جوڑنا اکثر ہوتا ہی، اور چونکہ جلاجل کے دونون حصے جب مجائے مین تو پھر جب تک جدا ہون آواز نہین دے سکتے، اس لیے یہ کہنا بالکل صحیح ہی کہ وہ ہات جوڑ کر چپ ہوگیا ؎

یون جسم رعشہ دار سے جانین ہوئین رواں	دبیر	جیسے مکان سے زلزلے مین صاحب مکان
یون روح کے طائر تن و سر چھوڑ کے بھاگے	انیس	جیسے کوئی بھونچال مین گھر چھوڑ کے بھاگے

اصل مضمون یہ ہی کہ روحین جسم سے اس طرح بھاگ گئین جس طرح بھونچال مین کوئی گھر چھوڑ کے بھاگ جاتا ہی، لیکن بندش کی صفائی اور برجستگی نے میر انیس صاحب کے مضمون کو کہان سے کہان پہونچا دیا ہی، اسکے علاوہ صاحب مکان کی تخصیص بالکل بیکار ہے۔ زلزلہ جب آتا ہی تو صاحب مکان کی کوئی تخصیص نہین ہر شخص مکان چھوڑ کے بھاگ جاتا ہی، جسم رعشہ دار کی ترکیب نامانوس ہی اور اس قید سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ صرف ان لوگون کی روحین نکلین جن کے جسم رعشہ دار تھے میر صاحب کا پہلا مصرع بھی کچھ اچھا نہین، سر کا لفظ بالکل حشو بلکہ موقع کے لحاظ سے غلط ہی، روح سر مین نہین رہتی اور نہ سر سے اس کو کوئی خصوصیت ہی ؎

وہ رخش پہ یا دیو تھا اسوار پری پر	دبیر	غل رن مین تھا کوہ چڑھا کبک دری پر

کس قدر بیہودہ تشبیہ ہی، دشمن کو کوہ اور گھوڑے کو کبک دری کہنا مضایقہ نہین لیکن کوہ کا کبک دری پر چڑھنا کس قدر مہمل ہی، میر انیس صاحب نے بھی یہی مضمون یعنی دشمن کا گھوڑے پر سوار ہونا متعدد موقعون پر باندھا ہی، اور کس خوبی سے باندھا ہی۔

ع گھوڑے پہ تھا شقی کہ پہاڑی پہ دیو تھا۔
ع گھوڑے پہ تھا شقی کہ ہوا پر پہاڑ تھا۔

رن مین جو گھرا ابر غلیظ اہل سقر کا	دبیر	بجلی سا کڑکنے لگا کڑکیسہ عمرو کا
گرد عباس کے کثرت تھی ستمگارون کی	انیس	مینھ تو تیرون کا تھا اور برق تھی تلوارون کی

پہلے شعر کا مطلب ہی کہ دشمن جو اہل ستم تھے، اُن کے صفوں کا دل ابر غلیظ تھا، اور اُس ابر مین گز کیسٹ کا کڑکتا بجلی کا کام دیتا تھا، دوسرے شعر کا مطلب ظاہر ہی، اِسی طرح کے مضمون کو میر انیس صاحب نے باندھا ہی ؎

اک گھٹا چھا گئی ڈھالون سے ستمگارون کی		برق ہر صف مین چمکنے لگی تلوارون کی

مرزا صاحب کا پہلا شعر تو بالکل بھدا اور بد ترکیب ہی۔ دوسرا ذرا صاف ہی لیکن میر انیس صاحب کے شعر سے اس کو بھی کچھ نسبت نہین ہی صفائی اور برجستگی کے علاوہ "چمکنے لگی" کے جملہ فعلیہ نے جو حالت پیدا کی ہی وہ "برق" فعلی سے کہان پیدا ہو سکتی ہی ؎

عالم ہے مکدر کوئی دل صاف نہین ہی	دبیر	اس عہد مین سب کچھ ہی پر انصاف نہین ہی
دل صاف ہو کسطرح کہ انصاف نہین ہی	انیس	انصاف ہو کسطرح کہ دل صاف نہین ہی

انصاف سے دیکھو مرزا صاحب نے میر صاحب ہی کے لفظون کو اُلٹ پلٹ کیا ہی لیکن کس بُری طرح سے کہ محض لفظی گورکھ دھندا رہ گیا ہی

دبیر کس نے نہ دی انگوٹھی رکوع و سجود مین۔

انیس سائل کو کس نے دی ہی انگوٹھی نماز مین۔

دونون مصرعون کی شُستگی برجستگی اور صفائی مین جو فرق ہی وہ ایک بچہ بھی سمجھ سکتا ہی ؎

کس آب و تاب سے یہ سر فوج پر گئی	دبیر	پانی کا گھونٹ بن کے گلے سے اُتر گئی
سب نشۂ غرور جوانی اُتر گیا	انیس	تلوار تھی کہ حلق سے پانی اتر گیا

اِن دونون شعرون کا فرق بھی ظاہر ہی؛

یون متصل رسن سے بندھے تھے دل فگار	دبیر	رشتہ مین جیسے دانۂ تسبیح آبدار

اہل حرم جو ایک ہی رسی مین قید کیے گئے اُن کو تسبیح کے دانہ اور رشتۂ تسبیح سے تشبیہ دی ہی اور یہ تشبیہ بجائے خود بُری نہین لیکن میر صاحب کی تشبیہ دیکھو ؎

گردن میں بارہ اسیروں کی ہیں اور ایک رسن		جس طرح رشتہ گلدستہ میں گلہائے چمن

تشبیہ کی لطافت اور نزاکت کے علاوہ اصل تشبیہ میں کس قدر فرق ہی، تسبیح کے دانے رشتہ میں بندھے نہیں ہوتے بلکہ پروئے ہوتے ہیں بخلاف اسکے گلدستہ میں پھول رشتہ سے بندھے ہوتے ہیں، بندش کی صفائی کا جو فرق ہی وہ ظاہر ہی، اسکے علاوہ مرزا صاحب کے ہاں آبدار کا لفظ محض فضول اور بیکار ہی ؎

بے جرم معرکہ میں وہ خارا شگاف تھی	دبیر	لشکر کا خون کیا تھا مگر پاک صاف تھی

مرزا صاحب نے اس مضمون کو نہایت خوبی اور صفائی سے ادا کیا ہی، میر انیس صاحب نے اس مضمون کو کئی طرح سے پلٹا لیکن انصاف یہ ہی کہ وہ بات نصیب نہوئی میر صاحب کہتے ہیں ؎

انیس ان سب کے بعد مُنھ کو جو دیکھا تو صاف تھا،
" جو چاہے دیکھ لے مرا مُنھ پاک صاف ہی ؎

دم میں نہ وہ غرور نہ وہ خودسری رہی	انیس	مجرم وہی رہا، یہ خطا سے بری رہی
رد کش خدا کی فوج سے چھوٹے بڑے ہوے	دبیر	سجادہ سے امام زمن اُٹھ کھڑے ہوے
تیار جان دینے پہ چھوٹے بڑے ہوے	انیس	تلواریں ٹیک ٹیک کے سب اُٹھ کھڑے ہوے
روشن بدر کا زور ہی دنیا و دین پر	دبیر	ششدر رہے جبرئیل گئے جبکہ تین پر
خیبر میں کیا گذر گئی روح الامین پر	انیس	کاٹے ہیں کسکی تیغ دو پیکر نے تین پر

دبیر بندھتی تھی اور کھلتی تھی مٹھی حباب کی،
انیس۔ کھلتی تھیں، اور جھپکتی تھیں آنکھیں حباب کی،

تمت بالخیر

✦ ✺ ✦

مولانا حالی مرحوم

- حیات جاوید للعہ/
- یادگار غالب ے/
- حیات سعدی عہ
- مقدمہ شعر و شاعری عیہ
- دیوان حالی عہ
- جواہرات حالی عہ
- مجموعہ نظم حالی ۱۲/
- مسدس حالی ۸/
- شکوۂ ہند ۲/
- مثنوی حقوق اولاد ۳/
- الدین یسیر ۳/
- تحفۃ الاخوان ۵/
- برکھارت ۴/
- حب وطن ۲/
- مسیر ۲/
- چپ کی داد ۱/
- عرض حال ۱/
- چھوٹا سا انگریزی مضمون ۱/
- چار گلزار حالی ۳/
- مناظرہ رحم و انصاف ۱/
- تعصب و انصاف ۱/
- مسدس مناجات ۱/
- مرثیہ غالب ۱/

مرزا داغ مرحوم

- آفتاب داغ عہ/
- انتخاب داغ عہ
- فریاد داغ ۴/

مولانا محمد حسین آزاد

- دربار اکبری صہ/
- آب حیات ے/
- سخندان فارس عہ
- نیرنگ خیال حصہ اول ۱۲/
- حصہ دوم ۱۲/
- نظم آزاد ۸/
- نصیحت کا کرن پھول ۸/
- قند پارسی ۸/

مولوی نذیر احمد دہلوی

- مراۃ العروس ۱۰/
- بنات النعش ۱۰/
- توبۃ النصوح ۱۰/
- ابن الوقت عہ
- منتخب الحکایات ۱۰/
- مبادی الحکمۃ عہ/
- موعظۂ حسنہ عہ
- رویائے صادقہ عہ
- ایامیٰ عہ
- فسانۂ مبتلا عہ
- مجموعہ نظم بے نظیر عہ
- رسم خط ۶/
- چند پند ۸/

سید محمود مرحوم

- کتاب الطلاق عا/
- کتاب الشفعہ عا/
- تاریخ قانون شہادت ے

مولانا شبلی مرحوم

- سیرۃ النبی جلد اول و دوم عہ
- سیرۃ النعمان عہ
- سوانح مولانا روم عا/
- الغزالی عہ
- المامون عہ
- رسائل شبلی عہ
- علم الکلام عہ
- مقالات شبلی عہ
- موازنۂ انیس و دبیر عہ
- شعر العجم حصہ اول عا/
- دوم عا/
- سوم عا/
- چہارم عا/
- پنجم عہ
- الفاروق عا/ و ے
- اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر ۸/
- حیات خسرو ۸/
- اسلامی حکومت ۲/
- اسلامی مدارس ۳/
- کتب خانہ اسکندریہ ۶/
- زیب النساء بیگم ۱/
- جہانگیر ۲/
- مجموعۂ کلام شبلی ۱۲/
- مجموعہ نظم شبلی ۴/
- مثنوی صبح امید ۳/
- کلیات شبلی فارسی عا/
- برگ گل و بوئے گل ۴/
- دستۂ گل ۴/

ڈاکٹر سر اقبال

- اسرار خودی و رموز بیخودی ے/
- پیام مشرق عہ
- طلوع اسلام ۳/
- شکوہ ۲/
- جواب شکوہ ۳/
- مکمل ترانہ ۲/
- نالۂ یتیم ۲/
- اکبری اقبال ۳/
- تصویر درد ۴/
- ملت بیضا ۵/
- شمع و شاعر ۲/
- خضر راہ ۵/
- بلال ۱/

مولوی بشیر الدین احمد

- حرز طفلان عا/
- نشاط عمر عہ
- عصائے پیری عہ/
- حسن معاشرت عہ
- اقبال دولہن عہ
- اصلاح معیشت عہ
- جزو معجزم ۴/
- بچوں کے ڈرامے عہ/

حسرت موہانی

- شرح دیوان غالب عہ/
- مکمل دیوان حسرت عہ/

مولوی عبد الحلیم شرر

- تاریخ سندھ عہ
- الفانسو ۱۲/
- ایام عرب کامل عہ
- بابک خرمی عہ
- حسن انجلینا ۱۰/
- فلپانا عہ
- عزیزہ مصر عہ
- رومۃ الکبریٰ عہ
- فتح اندلس عا/
- دلکش کامل عہ
- فردوس بریں عہ/
- قیس و لبنیٰ عہ
- لعبت چین عہ
- مفتوح فاتح عہ
- مقدس نازنین عہ
- ملک العزیز ورجنا ۱۰/
- منصور موہنا ۸/
- ماہ ملک عا/
- طاہرہ (حصہ اول) عہ
- دربار حرام پور اول عہ/
- دوم ۵/
- حسن کا ڈاکو حصہ اول ۱۲/
- حصہ دوم ۱۰/
- غیب دان دولہن عہ
- شہید وفا ۱۰/

منشی امیر احمد علوی بی اے

- اردو شاعری ۸/
- تذکرۂ رزم ۴/

المشتہر محمد حسن مالک انوار المطابع لکھنؤ